خواتین اور دوشیزاؤں کیلیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
جولائی 2013
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

جولائی 2013
جلد 41 شمارہ 3
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو ماہِ مقدس سایہ فگن ہوگا۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو رحمت و برکت سے سرفراز کیا اور بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے قرآن پاک کا عظیم تحفہ عنایت کیا۔ یہ کتنا بڑا معجزہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اللہ تعالیٰ کا یہ کلام اسی طرح محفوظ ہے، جیسا وہ نازل کیا گیا۔ اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہ ہو سکی ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت زمین پر روشنی اور آخرت میں باعثِ نجات ہے۔ رمضان المبارک میں ایک مرتبہ قرآن پاک کو اس کے ترجمہ اور مفہوم کے ساتھ سمجھ کر پڑھیں تاکہ اپنے دل، اپنی سوچ اور اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق ڈھال سکیں۔

قارئین کو رمضان المبارک کی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان المبارک کی برکتوں سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عید نمبر،

اگست کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ اس میں عید کے حوالے سے سلسلے شامل ہوں گے اور حسبِ روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔

سوالات یہ ہیں۔

1. عید کے حوالے سے روایتیں اپنے اندر بڑا حسن رکھتی ہیں، چوڑیاں، مہندی، نئے خوبصورت ملبوسات اور مزے دار پکوان۔ آپ عید پر کیا اہتمام کرتی ہیں؟
2. عید کے دن کا آغاز کیسے ہوتا ہے؛ نمازِ عید سے پہلے اور بعد میں سارا دن کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟
3. ہر گھر کی کچھ روایتیں ہوتی ہیں۔ ایک روایت تہواروں پر خصوصی ڈشز کا اہتمام بھی ہے۔ کیا آپ کے ہاں کوئی خاص ڈش بنتی ہے؛ ہماری قارئین کے لیے اس کی ترکیب لکھیں۔
4. عید پر دوستوں اور احباب سے ملنے آپ جاتی ہیں یا وہ آپ سے ملنے آتے ہیں، عیدی لیتی یا دیتی ہیں؟
5. مہنگائی اور حالات سے تہوار بھی متاثر ہوتے ہیں۔ آپ محدود آمدنی میں کس طرح کفایت شعاری سے تمام اخراجات پورے کرتی ہیں؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 25 جولائی تک ہمیں موصول ہو جائیں۔ بہترین جواب پر انعام دیا جائے گا۔

اس شمارے میں،

- نگہت سیما کا مکمل ناول۔ زمین کے آنسو،
- آسیہ رزاقی، سمیرا حمید اور آمنہ ریاض کے ناولٹ،
- عنیزہ سید اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- انوشے عباسی سے ملاقات،
- عائشہ نصیر احمد کا ناول۔ میرے ساجن کی کیا بات،
- سائرہ رضا، عنبرین اعجاز، امایہ خان اور مسز عظیم کے افسانے،
- باتیں سوہانے علی ابڑو سے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- میری خاموشی کو بیاں ملے، ہمارے نام، خبریں دبریں، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

غلط فہمی

حضرت اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ابر آلود دن میں ہم نے روزہ کھول دیا (یہ سمجھے کہ سورج غروب ہو چکا ہے) لیکن پھر (بادل ہٹ گئے اور) سورج نکل آیا۔" (بخاری)

ابو اسامہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ میں نے ہشام بن عروہ رضی اللہ سے کہا۔

"کیا انہیں (روزے کی) قضا کا حکم دیا گیا تھا؟"

انہوں نے کہا۔

"یہ تو ضروری تھا۔"

فوائد مسائل :

1۔ حدیث میں مذکورہ صورت بھول کر کھانے پینے سے مختلف ہے کیونکہ انہوں نے بھول کر نہیں کھایا پیا بلکہ ارادے سے اپنے خیال میں روزہ کھولا تھا۔ اگرچہ غلط فہمی کی بنا پر وقت سے پہلے کھول دیا تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر وہ گناہ گار تو نہیں ہوئے لیکن روزہ یقیناً "ناقص ہو گیا۔ ایسے روزے کی قضا کی بابت علما میں اختلاف ہے" تاہم جمہور علما کے نزدیک ایسی صورت میں افطار کیے ہوئے روزے کی قضا واجب ہے۔

روزے دار کو قے آجائے

حضرت فضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے دن ان کے پاس تشریف لائے جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ نے (پانی کا) برتن طلب فرمایا اور پی لیا۔ ہم نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو وہ دن ہے، جس دن آپ روزہ رکھا کرتے تھے۔"
فرمایا "ہاں، لیکن مجھے قے آگئی تھی۔" مسند احمد

روزے میں مسواک کرنا اور سرمہ لگانا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"روزے دار کے بہترین اعمال میں سے ایک عمل مسواک بھی ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ یہ روایت اگرچہ سنداً "ضعیف ہے" تاہم صحیح روایت سے روزے کی حالت میں مسواک کرنا ثابت ہے۔ اس سے روزے میں فرق نہیں آتا۔ امام بخاری رحمتہ اللہ نے صحیح بخاری میں کتاب الصوم میں ایک باب کا عنوان اس طرح درج کیا ہے۔ "روزے دار کا تازہ یا خشک مسواک کرنا۔" اس کے بعد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے، انہوں نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں مسواک کرتے اتنی بار دیکھا ہے کہ میں شمار نہیں کر سکتا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں سرمہ لگایا۔

روزے دار کے لیے غیبت اور فحش گوئی (کی ممانعت) کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے جھوٹ اور بیہودہ باتوں اور بیہودہ اعمال سے اجتناب نہ کیا، اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ شخص کھانا پینا ترک کر دے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ روزے کا بنیادی مقصد تقویٰ کا حصول ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔" البقرہ 2۔183

2۔ تقویٰ کے حصول کے لیے صرف کھانے پینے سے پرہیز کافی نہیں بلکہ ہر قسم کے گناہوں سے بچنے کی شعوری کوشش مطلوب ہے۔ روزہ رکھ کر ہم اللہ کی حلال کردہ چیزوں سے بھی اللہ کے حکم کے مطابق پرہیز کرتے ہیں تو جو کام پہلے بھی ممنوع ہیں، ان سے بچنا زیادہ ضروری ہے تاکہ مومن ان سے پرہیز کا عادی ہو جائے۔

3۔ شریعت اسلامیہ میں روزے کے دوران بات چیت کرنا جائز ہے بلکہ چپ کا روزہ شرعاً "منع ہے۔

4۔ عبادات انسان کے روحانی اور جسمانی فائدے کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ان اعمال پر آخرت میں بھی عظیم انعامات عطا فرماتا ہے۔

روزہ ضائع ہونا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"بعض روزے داروں کو روزے سے بھوک کے سوا کچھ نہیں ملتا اور بعض قیام کرنے والوں کو قیام سے بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ اخلاص کے بغیر نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔

2۔ عبادت میں جس طرح ظاہری ارکان کی پابندی ضروری ہے، اسی طرح باطنی کیفیات اخلاص، اللہ کی محبت، اللہ کا خوف، اللہ سے امید وغیرہ بھی مطلوب ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ظاہری عمل بے فائدہ ہے۔

3۔ اگر کسی موقع پر مطلوبہ باطنی اور قلبی کیفیت موجود نہ ہو تو نیکی کو ترک نہیں کر دینا چاہیے کیونکہ اس کا کم از کم یہ فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا کہ فرض کا تارک شمار نہیں ہو گا اور وہ نیکی مسلسل انجام دینے سے امید کی جا سکتی ہے کہ دل پر تھوڑا بہت اچھا اثر

لازماً" ہو جائے گا۔

4۔ عبادات میں ان کے آداب کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

روزے میں احتیاط

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب تم میں سے کسی کا دن کو روزہ ہو تو وہ فحش گوئی نہ کرے اور ناروا حرکت نہ کرے، اگر کوئی اس سے بدتمیزی کرے تو کہہ دے میں روزے دار آدمی ہوں۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ روزے کے فوائد کماحقہ حاصل کرنے کے لیے آداب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

2۔ جہل (ناروا حرکت) سے مراد لڑائی جھگڑے کی بات ہے، یعنی روزے دار کو لڑائی میں پہل بھی نہیں کرنی چاہیے اور اگر کوئی دوسرا شخص ایسی بات کرے یا ایسی حرکت کرے جس سے روزے دار کو غصہ آجائے تب بھی روزے دار کو جواب میں جھگڑنا نہیں چاہیے بلکہ اپنے روزے کا خیال کرتے ہوئے برداشت اور تحمل سے کام لیتے ہوئے جھگڑے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

3۔ یہ کہنا کہ میں روزے سے ہوں، اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ دل میں اپنے روزے کا خیال کرے تاکہ جھگڑے سے بچنا ممکن ہو سکے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جھگڑنے والے سے کہہ دے کہ میں تمہاری غلط حرکت کا جواب تمہارے انداز میں اس لیے نہیں دے رہا کہ میرا روزہ مجھے اس سے روکتا ہے۔ امید ہے اس سے اس کو شرم آجائے گی اور وہ روزے دار کے روزے کا احترام کرتے ہوئے جھگڑا ختم کر دے گا۔

سحری کھانے کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ المسحور کا لفظ سین کی زبر سے بھی پڑھا گیا ہے اور پیش سے بھی۔ سین کی زبر سے سحور کا مطلب وہ طعام ہے، جو روزہ شروع کرنے سے پہلے کھایا جاتا ہے اور سحور (سین کی پیش سے) کھانے کے عمل کو کہا جاتا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کھانا کھانا باعث برکت ہے۔ اس کا ثواب بھی ملتا ہے کیونکہ یہ ایک مسنون عمل ہے اور اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی بھی ہوتی ہے یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت کھائے جانے والے کھانے میں ایک خاص برکت ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کا تعلق سنت نبوی سے ہے اور اس کی وجہ سے غیر مسلموں کی مشابہت سے بچاؤ بھی ہو جاتا ہے کیونکہ یہود و نصاریٰ سحری نہیں کھاتے۔

2۔ ثواب کا تعلق مشقت سے نہیں، احکام شریعت کی پابندی سے ہے۔ سنت کے مطابق تھوڑا اور آسان عمل اس زیادہ اور مشقت طلب عمل سے بہتر ہے، جو سنت نبوی کے خلاف ہو۔

سحری دیر سے کھانے کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی، پھر اٹھ کر نماز کی طرف چلے۔"
(حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا) میں نے کہا "ان دونوں کاموں کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟"
حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا "پچاس آیتوں کی تلاوت جتنا۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ اگرچہ سحری کا کھانا صبح صادق سے کافی پہلے بھی کھایا جا سکتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ رات کے آخری حصے میں صبح صادق سے تھوڑی دیر پہلے کھایا جائے۔
فجر کی نماز اول وقت میں ادا کرنا افضل ہے۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کے بعد مختصر وقفہ دے کر فجر کی نماز ادا کی۔

عید الفطر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو فرمایا۔ "تم سال میں دو دن خوشیاں منایا کرتے تھے' اب اللہ تعالیٰ نے تم کو ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "یہ ایام یعنی عیدین کھانے پینے' باہم خوشی کا لطف اٹھانے اور خدا کو یاد کرنے کے ہیں۔" عید کے دن صفائی ستھرائی اور نہانے دھونے کا اہتمام کرنا' اچھا لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون اعمال ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ عید کا دن تھا' کچھ لونڈیاں بیٹھی وہ اشعار گا رہی تھیں' جو جنگ بعاث سے متعلق انصار نے کہے تھے کہ اسی دوران حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہا تشریف لائے۔ بولے۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں یہ گانا بجانا؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ابو بکر رضی اللہ عنہا رہنے دو' ہر قوم کے لیے تہوار کا ایک دن ہے۔ اور آج ہماری عید کا دن ہے۔"

ایک بار عید کے دن کچھ حبشی بازی گر فوجی کرتب دکھا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کرتب خود بھی دیکھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اپنی آڑ میں لے کر دکھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان بازی گروں کو شاباش بھی دیتے جاتے تھے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دیکھتے دیکھتے تھک گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اچھا اب جاؤ۔" (بخاری)

عید الفطر کی خوشی منانا مسنون ہے اور نماز عید الفطر کی ادائیگی دراصل ماہ رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رحمت سے ادا کی گئی عبادات اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تقویٰ پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لانا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں۔ "میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز عید ادا کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے سے پہلے بلا اذان و اقامت نماز ادا فرمائی پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہا پر ٹیک لگا کر کھڑے رہے۔ اور تقویٰ اللہ کا حکم دیا اور اطاعت الٰہی کی ترغیب دی۔ لوگوں کو نصیحت اور وعظ کیا۔ پھر عورتوں کی طرف تشریف لے گئے اور ان کو بھی پند و نصائح فرمائے۔" ابو داؤد

عید الفطر کے دن خوشی منانے کا مقصد رمضان المبارک میں گناہوں کی بخشش پر اللہ تعالیٰ سے اظہار تشکر کرنا ہے۔ لیکن ہم لوگ عید الفطر کی تیاریوں میں اس قدر مشغول ہو جاتے ہیں کہ آخری عشرے کی فضیلت اور اس کی بے پناہ رحمتوں سے بھی بے نیاز ہو کر غیر ضروری اور غیر شرعی کاموں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے لگ جاتے ہیں۔

اس طرح عید کے دن بھی طرح طرح کی خرافات اور غیر اسلامی افعال کے ذریعے سارے مہینے کی ریاضت اور عبادت کو اکارت کرنا پر لے درجے کی بے وقوفی اور ظلم و زیادتی کی انتہا ہے۔ عید کی خوشی بجا طور پر منانی چاہیے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ اسراف اور فضول خرچی نہ ہونے پائے اور نہ خوشی مناتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ حدود پامال ہوں۔ ایسے اعمال اور رویوں سے پرہیز کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔

اسلام نے ہمیں غمی اور خوشی منانے کے لیے ایک متعین ضابطہ عطا فرمایا ہے۔ خوشی کے مواقع پر غرور' تکبر اور اپنی مال داری کا اظہار ناپسندیدہ اعمال ہیں۔ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں توازن اور اعتدال کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا عید الفطر کے پر مسرت موقع پر بھی نیاز مندی' وقار' بندگی رب اور عاجزی کا دامن ہاتھ

سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

عید کی تیاریوں اور عید کی خوشیوں میں اپنے پڑوسیوں' غربا' مساکین' یتیموں' بیواؤں' مسافروں اور معاشرے کے تمام محروم طبقات کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے۔ اس جذبے اور عمل سے رمضان المبارک کے فیوض و برکات اور حقیقی روح سے سرشار اور مستفید ہوا جاسکتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہا فرماتے ہیں۔

"عید الفطر کے دن جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند کھجوریں نہ کھالیتے عید گاہ کو تشریف نہ لے جاتے اور آپ طاق کھجوریں تناول فرماتے۔" بخاری

حضرت جابر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن دو مختلف راستوں سے آتے جاتے تھے۔" بخاری

اس حدیث کی رو سے دو مختلف راستوں سے آنے جانے میں یہ فلسفہ کار فرما ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے میل ملاپ ہو اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی حاصل ہو۔ نماز با جماعت اور جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد اسلام میں عید الفطر کی نماز مسلمانوں کی اجتماعیت کو مضبوط کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اس سے مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کو بڑے پیمانے پر تقویت ملتی ہے۔ جس سے یقیناً "اسلام اور مسلمانوں کو اپنی قوت اور شان و شوکت کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔

جو اس رات کی بھلائی سے محروم رہا

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص اس رات میں اللہ کی عبادت کے لیے کھڑا نہیں ہوتا تو گویا اسے قرآن مجید کی اس نعمت عظمیٰ کا احساس ہی نہیں ہے جو اس رات میں اللہ تعالیٰ نے اتاری تھی۔ اگر اسے اس بات کا احساس ہوتا تو وہ ضرور رات کے وقت عبادت کے لیے کھڑا ہوتا اور شکر ادا کرتا کہ اے اللہ! یہ تیرا احسان عظیم ہے کہ تو نے مجھے قرآن جیسی نعمت عطا فرمائی ہے۔ بے شک یہ بھی تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے کھانے کے لیے روٹی اور پہننے کے لیے لباس عنایت فرمایا۔ لیکن تیرا اصل احسان عظیم مجھ پر یہ ہے کہ تو نے مجھے ہدایت دی اور دین حق کی روشنی دکھائی۔ مجھے تاریکیوں میں بھٹکنے سے بچایا اور علم حقیقت کی وہ روشن شمع عطا کی۔ جس کی وجہ سے میں دنیا میں سیدھے راستے پر چل کر اس قابل ہوا کہ تیری خوشنودی حاصل کر سکوں۔

پس جس شخص کو اس نعمت کی قدر و قیمت کا احساس ہو گا۔ وہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے کھڑا ہو گا اور اس کی بھلائی لوٹ لے جائے گا۔ لیکن جو شخص اس رات میں ادائے شکر کے لیے اللہ کے حضور کھڑا نہیں ہوا۔ وہ اس کی بھلائی سے محروم رہ گیا اور در حقیقت ایک بہت بڑی بھلائی سے محروم رہ گیا۔

روزہ اور قرآن کی شفاعت

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کرتے ہیں۔ روزہ کہتا ہے کہ اے رب! میں نے اس کو دن بھر کھانے (پینے) اور شہوت سے روکے رکھا' تو میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہتا ہے کہ (اے رب!) میں نے اسے رات کو سونے سے روکے رکھا' تو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ پس دونوں کی شفاعت قبول فرما لی جائے گی۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روزہ اور قرآن کوئی جان دار ہیں' جو کھڑے ہو کر یہ بات کہتے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک روزہ دار کا روزہ رکھنا اور قرآن پڑھنے والے کا قرآن پڑھنا دراصل خود اپنے اندر ایک شفاعت رکھتا ہے۔

☆

کل کا کام آج پر نہ ڈالو

ابنِ انشاء

جب ہمارے دوستوں کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ کو خواتین ڈائجسٹ کے لیے کچھ نہ کچھ لکھنا ہوگا' ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تو ہم نے عذر کیا کہ۔
"پہلی کو تو ہم کچھ نہیں کرتے۔ بس بال کٹاتے ہیں۔ مالش کراتے ہیں۔ فلموں' جائیدادوں اور سیکنڈ ہینڈ کاروں کے اشتہارات دیکھتے ہیں۔ بہت مصروف دن ہوتا ہے ہمارا۔"
"تو کسی اور دن لکھ دیا کیجیے۔ ہمارا پرچا مہینے میں ایک روز آئے گا۔"
"کیا نام رکھا ہے آپ نے پرچے کا؟"
"خواتین ڈائجسٹ۔"
"اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ پرچا آپ عورتوں کے لیے نکال رہے ہیں؟"
"آپ بہت ذہین آدمی ہیں۔ آپ نے صحیح سمجھا۔"
"لیکن میں تو عورت نہیں ہوں۔"
"ہمیں معلوم ہے۔"
"مجھے کھانا پکانے کی ترکیبیں بھی نہیں آتیں کہ آپ کے لیے کریلوں کے حلوے' بھنڈی کے قورمے یا بینگن کی کھیر کے موضوع پر کچھ لکھ سکوں۔ انڈا البتہ ابال لیتا ہوں۔"
"کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمارے ہاں دستر خوان یا ہنڈ کلیا کا کالم اگر ہوا تو اسے کوئی خانہ دار خاتون لکھیں گی۔"
"تو پھر آپ مجھ سے کشیدہ کاری کے نمونوں کی فرمائش کریں گے۔ اس میں بھی میں کورا ہوں۔"
"یہ بھی ہمیں معلوم ہے۔"
"اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں راتوں کی نیند حرام کرنے والا کوئی ناول آپ کے لیے قسط وار لکھ سکوں گا۔ تب بھی آپ غلطی پر ہیں۔"
"آپ کو ایسی کوئی چیز لکھنے کی زحمت نہ دی جائے گی۔"

اب ہم نے بچ نکلنے کا آخری حربہ استعمال کیا۔
"آپ سے ہمارا اصولی اختلاف ہو جائے گا کیونکہ ہم مردوں اور عورتوں کے لیے برابر حقوق کے حامی ہیں۔"
"اطمینان رکھیے! ہم بھی ہیں۔"
"پھر تو ٹھیک ہے۔ ورنہ بالعموم ہمارے معاشرے میں مرد کو اس کا جائز مقام نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ یہ بھی ایک خاصی ضروری مخلوق ہے۔"
"جی ہاں! ہم جانتے ہیں۔"
"اچھی بات۔"

اس وقت تو ہم بہت خوش ہوئے کہ اپنی بات منوالی لیکن اب ہماری مثال ان نو آزاد ملکوں کی سی ہے' جن کو آزادی مل جاتی ہے تو سوچتے ہیں کہ اب ہم کیا کریں۔ کم از کم لنکا کے ساتھ یہی ہوا کہ انگریز بہادر نے پاکستان اور ہندوستان سے رخت سفر باندھا اور درو دیوار پر حسرت کی نگاہ ڈالتے ہوئے رخصت ہوا تو لنکا سے بھی کہا کہ "آج سے تم بھی آزاد۔ جب مکان ہی چھوڑ دیا تو اس کا غسل خانہ رکھ کر کیا کریں گے۔" اس پر لنکا والے بہت بھنائے کہ "صاحب! یہ کیا بے مروتی ہے۔ آپ کو ابھی کچھ دن اور حکومت کرنا ہوگی۔" لیکن انگریز نہ مانے۔ جلسے جلوس بھی ہوئے' ہڑتالیں بھی۔ حتیٰ کہ کچھ دہشت پسندوں نے بم وغیرہ بھی پھینکے اور "لنکا سے مت جاؤ" کے نعرے بھی خوب لگے۔ لیکن یہ سامراجی ممالک لاتوں کے بھوت ہیں' باتوں کے نہیں اور غریب لنکا کے پاس اتنی طاقت کہاں تھی کہ بزور ان کو روکتا۔ خون کے سے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

ہمارے سامنے بھی اسی قسم کا مسئلہ ہے کہ لکھیں تو کیا لکھیں۔ دیکھا جائے تو آخر عورتوں کے کتنے مسائل ہیں' جو مردوں سے الگ ہیں۔ کھانا پکانا' بٹن لگانا' موزے سینا' بچوں کے منہ دھلانا' کپڑے بدلنا وغیرہ' اکثر گھروں میں بے شک مرد کرتے ہیں تاکہ عورتوں کی مجلسی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ پڑے اور ہمسایوں سے ان کے میل ملاقات میں فرق نہ آئے' لیکن عورتوں کو بھی اس کی کچھ ممانعت نہیں۔ فلمیں دیکھنے میں بھی دونوں برابر ہیں۔ اگرچہ اس کی اصل صلاحیت اللہ تعالیٰ نے عورتوں ہی کو ودیعت کی ہے۔ روپے پیسے کے معاملے میں البتہ مدت سے تقسیم کار ہو چکی ہے۔ نہ عورتیں کمانے میں دخل دے سکتی ہیں نہ مرد خرچ کرنے میں۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ روپے کمانے کے بارے میں ہمارا ذاتی تجربہ بہت کم ہے۔ یوں بھی بازار میں ایسی کتابیں مل جاتی ہیں' جن کی مدد سے انسان راتوں رات لکھ پتی بن سکتا ہے۔ ہم خود کو روپے خرچ کرنے (یا نہ کرنے) کے موضوع تک محدود رکھیں گے۔ بالخصوص اس لیے کہ ہمارا ذاتی اور طویل تجربہ اسی میدان میں ہے۔

سب سے زرین اصول یہ ہے کہ جو کام کل ہو سکتا ہے اسے آج پر نہ ڈالو اور جو چیز کہیں اور مل سکتی ہے اسے سامنے کی دکان سے نہ خریدو۔ ہم فلم دیکھنے میں بالعموم یہی اصول برتتے ہیں۔ شروع کے تین دنوں میں تو ہم رش سے گھبراتے ہیں۔ تاکہ جن کو دیکھنا ہے' دیکھ لیں اور بھیڑ چھٹ جائے۔ پیر کے بعد ہم حساب لگاتے ہیں کہ ابھی چار روز اور ہیں۔ کسی بھی دن دیکھ لیں گے۔ دو تین دن ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں لگ جاتے ہیں کہ میٹنی شو دیکھنا مناسب ہوگا یا رات کا۔ حتیٰ کہ اخبار میں فلم اترنے کا اعلان آجاتا ہے۔ شیطان کے جن کاموں کو ہم برا جانتے ہیں' ان میں تعجیل بھی ہے۔ فلم اب نہ دیکھی۔ پھر آئے گی تو دیکھ لی جائے گی۔ نتیجہ یہ کہ اس وقت تمام اچھی فلمیں ہماری ویٹنگ لسٹ پر ہیں کہ دوبارہ آئیں تو دیکھی جائیں۔ کپڑوں کے بارے میں بھی یہی قیمتی اصول ہمارے پیش نظر رہتا ہے۔ پاکستان میں صنعتیں برابر ترقی کر رہی ہیں۔ ہر سال نئے نئے اور بہتر ڈیزائن کے کپڑے بازار میں آتے ہیں۔ اگر ہم بالفرض گزشتہ سال سوٹ سلوا لیتے' تو آج افسوس ہوتا۔ آج سلوا لیں تو اگلے برس افسوس ہوگا۔ انسان ایسا کام ہی کیوں کرے' جس میں بعد ازاں افسوس کا اندیشہ ہو۔

1961ء میں کنٹرول ریٹ پر ایک کار مل رہی تھی۔ پھر وہ نہ ملی' کیونکہ دکاندار ہمارے اصول سے واقف نہ تھا۔ اس نے بیچنے میں جلدی کی۔ اگر کہیں اس وقت یہ کار ہم خرید لیتے تو اس وقت چار سال پرانی ہوتی۔ کوئی آدھے داموں بھی نہ پوچھتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کفایت شعاری اور جز رسی' جسے فضول خرچ لوگ خسّت کا نام دیتے ہیں۔ اللہ کی دین ہے۔ تاہم ایسی مثالیں بھی ہیں کہ انسان کوشش سے یہ ملکہ حاصل کر لیتا ہے۔ ان میں سب سے روشن مثال خود ہماری ہے۔ ابھی چند سال پہلے تو ہم کبھی کبھار کوئی چیز خرید بیٹھتے تھے اور ظاہر ہے کہ آخر میں پچھتاتے تھے۔ آخر ایک روز اپنے دوست ممتاز مفتی سے' جو ہمارے ساتھ کام کرتے تھے۔ ہم نے گزارش کی کہ ہمارے ساتھ ایک نیکی کیجیے۔

بولے "کہو! کیا بات ہے۔ کچھ قرض چاہیے؟"
ہم نے کہا۔ "جی نہیں۔ وہ تو روز چاہیے ہوتا ہے۔ آج یہ کہنا ہے کہ ہم بازار میں خریداری کو نکلیں تو ہمارے ہم رکاب رہا کیجیے۔ آپ کا کام فقط ہمیں مفید مشورے دینا ہوگا۔ جہاں آپ دیکھیں کہ ہم کوئی چیز خریدنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آہستہ سے اتنا فرما دیا کیجیے کہ یہ اگلی دکان پر چار آنے سستی ہے۔"
بولے "ٹھیک ہے۔" اب ہوا یہ کہ ہم نے ایک جگہ دو روپے موزوں کے طے کیے۔ (دکان دار تین روپے مانگ رہا تھا) اور بٹوہ نکال کر ادائیگی کرنے کو تھے کہ مفتی جی نے کہا۔
"یہاں سے مت لو جی۔" فریئر روڈ کے فٹ پاتھ پر یہی چیز ڈیڑھ روپے کی ہے۔"
یوں ہمارے وہ دو روپے بھی بچے اور وہ ڈیڑھ روپیہ بھی۔ کیونکہ اس روز فٹ پاتھ پر تلاش بسیار کے باوجود دکان دار ہمیں نہ مل سکا۔ مل جاتا تو مفتی صاحب فرماتے کہ "ذرا بندر روڈ پر چلو تو یہ موزہ ایک روپے میں دلا دوں۔"

چند روز میں ہم یہ بھول گئے کہ یہ ترکیب مفتی صاحب کو خود ہم نے سمجھائی ہے۔ قارئین کرام بھی یہ نسخہ استعمال کر کے دیکھیں۔۔۔ اور فائدہ ہو تو اس فقیر کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔

(1970ء میں لکھا گیا)

باتیں سوہائے علی ابڑو سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام۔"
"سوہائے علی ابڑو۔"

2 "پیار کا نام؟"
"سوہائے ہی بولتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایسا نام ہے جو بگڑ نہیں سکتا۔"

3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"13 مئی 1993ء / کراچی"

4 "اسٹار/قد؟"
"ٹورس (ثور) پانچ فٹ تین انچ۔"

5 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویشن۔"

6 "کیا بننا چاہتی تھی؟"
"میرا ایم (Aim) ہے کہ میں لائر بنوں اور ان شاء اللہ ضرور بنوں گی۔"

7 "بہن بھائی/آپ کا نمبر۔"
"ایک بھائی، ایک بہن اور میرا نمبر آخری ہے۔"

8 "شادی؟"
"ابھی صرف 19 سال کی ہوں۔ ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ویسے بھی جب نصیب میں ہوگا، کرلوں گی۔"

9 "پہلا پروگرام/وجہ شہرت؟"
سات پردوں میں اور من جلی۔

10 "پہلی کمائی/کہاں خرچ کی؟"
"جب میں چھوٹی تھی تو میں نے ٹیوشن پڑھائی تھی۔ تھیٹر سے پہلی کمائی تقریباً پندرہ ہزار ملے تھے اور پانچ ہزار گھر کے بلوں پر خرچ کردیے اور باقی کا فون لیا تھا۔"

11 "سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار ہوتا ہے؟"
"ایسا کوئی دن نہیں ہے۔ میں ہر دن کو انجوائے کرتی ہوں۔"

12 "کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"
"بچپن میں دکھایا تھا۔ مگر میں یقین نہیں کرتی۔"

13 "پاکستان کے کس شہر میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟"
"کراچی اور صرف کراچی۔"

14 "کوئی تحفہ جس کو پاکر بہت خوشی ہوئی ہو؟"
"نہیں، ایسا کوئی تحفہ نہیں ہے۔ ویسے تحفے بہت ملے ہیں۔"

15 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"انٹرنیٹ بہت کام کی چیز ہے اور فیس بک بھی۔ مگر ضرورت کے وقت استعمال کرتی ہوں۔"

16 "سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"کہ اس سمندر میں کود جاؤں۔"

17 "نئے سال کو کس طرح ویلکم کرتی ہیں؟"
"ایک پلاننگ کے ساتھ کہ کیا کیا کرنا ہے۔"

18 "مطالعہ کتنا ضروری ہے۔"
"بہت ضروری ہے۔ میری یہ عادت ہے کہ میں کچھ نہ کچھ پڑھ کر سوتی ہوں۔ ناولز اور میگزین وغیرہ۔"

19 "پاکستانی معاشرے کی کوئی اچھی اور بری بات؟"
"بہت ساری ہیں۔ اگر میں بولنے لگی تو چپ کرانا مشکل ہوجائے گا۔"

20 "بیرون ملک کی کوئی بات، جو متاثر کرتی ہے؟"
"خوب صورتی اور لوگ، بہت بااخلاق ہوتے ہیں۔"

21 "آپ کی شخصیت کی کوئی کمزوری؟"
"کہ میں بہت زیادہ سوچتی ہوں۔ انسان کو اتنا نہیں سوچنا چاہیے۔"

22 "اگر میک اپ ایجاد نہ ہوتا تو؟"
"تو پھر ہمیں سب کو نیچرل انداز میں دیکھنے کی عادت ہوتی اور سکون میں ہوتے۔"

23 "میک اپ میں کیا چیز بری لگتی ہے؟"
"بری تو نہیں لگتی، لیکن میک اپ ہلکا کرنا چاہیے۔"

24 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"وہ لوگ جن کے دو چہرے ہوتے ہیں۔ منافق لوگوں کے رویے۔"

25 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"
"میں میوزک فین ہوں۔ میوزک سنتی ہوں۔ ڈانس کرتی ہوں۔"

26 "کس کی یاد تنہائی میں سکون کا باعث بنتی ہے؟"
"اپنے والدین کی۔"

27 "شادی بیاہ کی رسموں میں کون سی رسم پسند ہے؟"
"بہت سی ہیں۔"

28 "کوئی تاریخی شخصیت جس سے آپ ملنا چاہتی ہیں؟"
"بہت ساری ہیں' کس کس کا نام لوں۔"

29 "کبھی ہجوم میں اکیلا پن محسوس کیا؟"
"ہمیشہ۔"

30 "کیا ڈراموں میں فنکار کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے؟"
"کہیں نہ کہیں ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور عکاس ہوتی ہے۔"

31 "زندگی میں کبھی کوئی ایسا کام جس سے دل کو سکون ملا ہو؟"
"نہیں' میرے خیال سے نہیں۔"

32 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کچھ کھانے کو دل چاہتا ہے۔ مجھے بہت شوق ہے ناشتا کرنے کا۔ پھر واک کرتی ہوں۔"

33 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے بستر پر۔ رات کے وقت۔ صرف تین' چار گھنٹے کی نیند ملتی ہے۔"

34 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"جب شدید بھوک لگے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور نہ ہی کچھ کام ہوتا ہے۔ مجھے صرف کھانا کھانا ہوتا ہے۔"

38 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"میری ایک آنٹی ہیں جن کا نام رخسانہ ہے۔ وہ نہ صرف میری امی کی دوست ہیں' بلکہ میری بہترین دوست کی امی بھی ہیں۔ ان کے ہاتھ کا پکا ہوا بہت پسند ہے۔ دنیا کی بہترین کک ہیں۔"

36 "ناشتا جو آپ شوق سے کرتی ہیں؟"
"مجھے ناشتے میں بہت زیادہ ورائٹی پسند ہے۔ دن کا سب سے اہم کھانا میرا ناشتا ہی ہوتا ہے۔"

37 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟"
"جو میرے قریبی لوگ ہیں۔ دوست بھی ہیں' بزرگ بھی ہیں۔"

38 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"پاگل تو نہیں ہوتی' لیکن ظاہر ہے' تھک کر سوتی ہوں تو غصہ تو آتا ہی ہے۔"

39 "آئینے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟"
"جب جب موقع ملتا ہے۔ اپنا آپ دیکھ لیتی ہوں.... قہقہہ۔"

40 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"اپنے لیے۔"

41 "جب پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟"
"اپنا نام۔"

42 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"او ہو.... بہت بار.... یہ ڈرامے اپنی اصل زندگی میں بہت بار کیے ہیں۔"

43 "دل کب ٹوٹتا ہے؟"
"نہیں! اب نہیں ٹوٹتا۔ اب عادت ہو گئی ہے۔"

44 "کیا بات بہت جذباتی کر دیتی ہے؟"
"میں بہت جذباتی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بات پر جذباتی ہو جاتی ہوں۔ لڑکی ہوں نا آخر۔"

45 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"
"لوگوں کی سوچ کو بدلنا ہو گا۔"

46 "کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"
"میں اپنی غلطی کا اعتراف کھلے دل سے کر لیتی ہوں۔"

47 "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"
"یہی کہ جو عزت و مقام ہمارے ملک میں ہم کو حاصل ہے' کسی اور ملک میں نہیں' اس لیے اللہ اسے ہمیشہ قائم رکھے۔"

48 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"اپنے گلاسز اور بیگ کے بغیر نہیں نکلتی۔"

49 "تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتی ہیں؟"
"اپنے آپ سے یا اپنے اللہ سے۔"

50 "اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟"
"بہت مرتبہ.... کیونکہ لوگ بہت فون کرتے ہیں.... اور جب نمبر بہت عام ہو جائے تب۔"

51 "سفر کے لیے بہترین سواری۔ رکشہ' بس یا اپنی کار؟"
"بس میں مجھے کوئی بیٹھنے نہیں دیتا۔ مگر مجھے مزا بہت آتا ہے۔"

52 "کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟"
"لڑکی ہوں تو کپڑے' جوتے' بیگ اور میک اپ پر۔ مجھے شاپنگ کا بہت شوق ہے۔"

53 "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟"
"ایک پاگل اور ذہنی طور پر معذور لڑکی کا۔"

54 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"
"اچھی تو بہت ساری ہیں۔ (قہقہہ) اچھی عادتیں نہیں بتاؤں گی اور بری یہ ہے کہ مجھے ناخن چبانے کی عادت ہے۔"

55 "دھوکا اپنے دیتے ہیں یا پرائے؟"
"کوئی بھی دے سکتا ہے' خواہ اپنا ہو یا پرایا۔"

56 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش! یہ ہمارا ہوتا؟"
"کاش کا لفظ استعمال نہیں کرتی۔ جب ہمارا ملک ہے تو دوسرے کی کیا خواہش کرنی۔"

57 "لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ جملہ؟"
"اف! کیا مصیبت ہے' گیا ہے یار۔"

58 "لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟"
"ہر کوئی مختلف باتیں کرتا ہے۔"

59 "اگر آپ پاور میں آجائیں یا اگر آپ اس ملک کی صدر ہوتیں تو؟"
"شکر ہے کہ میں اس ملک کی صدر نہیں ہوں۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔"

60 "ٹی وی آن کرتے ہی پہلا چینل کون سا لگاتی ہیں؟"
"اب تو جیو لگاتی ہوں۔"

61 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"انسان' دنیا۔"

62 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرتی ہیں؟"
"صبح اٹھتے ہی اور شام کے وقت۔"

63 "محبت ایک بار ہوتی ہے کیا؟"
"نہیں.... بار بار بھی ہو سکتی ہے اور مختلف لوگوں سے ہوتی ہے۔ جس میں بھائی' بہن بھی شامل ہیں۔"

64 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"
"جتنا میں دینے کے قابل ہوتی ہوں۔"

65 "غصہ کب آتا ہے؟"
"بہت کم آتا ہے۔ مگر بہت برا آتا ہے اور ری ایکشن بھی بہت برا ہوتا ہے۔"

66 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"کوئی نہیں۔ سب کی بات سنتی ہوں۔ مگر کرتی اپنی ہی ہوں۔"

67 "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"
"اپنے والدین کی۔"

68 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"ہم بھی انسان ہیں۔ جب ڈیپریشن ہوتا ہے۔ مگر پھر جلدی ٹھیک بھی ہو جاتی ہوں۔"

69 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے۔ لڑکے یا لڑکیاں؟"
"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ بہت دفعہ لڑکے ہوتے ہیں۔ بہت دفعہ لڑکیاں۔"

70 "کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟"
"دل کرتا ہے' اس کا سر پھاڑ دوں۔"

71 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"
"کھانا کھاؤں اور سو جاؤں۔"

72 "اپنی شخصیت میں کیا چیز کم لگتی ہے؟"
"ہائٹ.... کاش میں تھوڑی لمبی ہوتی۔"

73 "موت سے ڈر لگتا ہے۔"
"ہاں! لگتا ہے۔"
74 "جھوٹ آسانی سے بول لیتی ہیں؟"
"نہیں.... ہمیشہ پکڑی جاتی ہوں۔"
75 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"بہت ساری ہیں۔ فون سب سے بڑی ایجاد ہے۔ جس میں سب کچھ ہے۔"
76 "اگر موبائل فون نہ ہوتا تو؟"
"تو بھی جی ہی رہے ہوتے۔ لیکن اچھا ہے کہ اتنی آسانیاں انسان کے لیے پیدا ہو گئیں۔"
77 "شوبز کی بڑی برائی؟"
"جب بندہ مشہور ہو جائے تو اس کی پرسنل لائف ختم ہو جاتی ہے۔"
78 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"
"گھر پر رہنا مجھے بہت پسند ہے۔ فیملی کے ساتھ وقت گزارتی ہوں۔"
79 "کون سا تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"
"کوئی تہوار شوق سے نہیں مناتی۔"
80 "زندگی کب بدلی؟"
"اب تک تو نہیں بدلی' لیکن ان شاء اللہ بہت جلد بدل جائے گی۔"
81 "اپنی شخصیت میں یا اپنے چہرے کے خدو خال میں کیا پسند ہے؟"
"اپنی تعریف خود نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنے بال بہت پسند ہیں۔ ان کا میں خاص خیال رکھتی ہوں۔"
82 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟"
"بات کرنے کا انداز اور یہ کہ جو ان سے کم حیثیت ہوتے ہیں' ان سے وہ کیسے ڈیل کرتے ہیں۔"
83 "لوگ گرنے والوں پر ہنستے کیوں ہیں؟"
"کبھی کبھار اس طرح کی فنی (Funny) سچویشن ہو تو ہنسی آ ہی جاتی ہے۔ یہ نیچرل ہے۔"
84 "حادثہ دیکھ کر کیا ردعمل ہوتا ہے؟"
"اپنے رب کا شکر کرتی ہوں کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔"
85 "ٹریفک جام ہو تو کیا کرتی ہیں؟"
"بہت غصہ آجاتا ہے۔ میوزک سن کر خود کو مصروف کر لیتی ہوں۔"
86 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"اپنا موبائل فون۔"
87 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"
"نوز' روز واٹر' پانی' کتاب اور میرے دیگر استعمال کی چیزیں۔"
88 "مذہب سے آپ کا لگاؤ؟"
"پانچ وقت کی نماز تو نہیں پڑھتی۔ مگر جب ڈیپریسڈ ہوتی ہوں تو نماز پڑھتی ہوں۔ سکون مل جاتا ہے۔"
89 "اچانک چوٹ لگنے پر منہ سے کیا نکلتا ہے؟"
"آوچ"
90 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"
"کروٹیں بدلتی ہوں۔"
91 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ' ٹیبل یا چٹائی؟"
"چٹائی۔"
92 "مرد حضرات کب برے لگتے ہیں؟"
"ہمیشہ.... چوبیس گھنٹے۔"
93 "پیسہ کس شکل میں جمع کرتی ہیں؟"
"بینک میں ڈال دیتی ہوں۔"
94 "کس شخصیت کے بغیر زندگی ادھوری لگتی ہے؟"
"کوئی نہیں ہے ایسی شخصیت۔"
95 "بیرون ملک جا کر کیا باتیں نوٹ کرتی ہیں؟"
"رہن سہن' ماحول' ہر چیز نوٹ کرتی ہوں۔"
96 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ جیسی میں پہلے تھی۔ ویسی ہی ہو جاؤں گی۔"

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ' 37- اردو بازار' کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

فائزہ عرفان.... اسلام آباد

شعاع اور خواتین سے میری اکیس سالہ رفاقت میں بارہا ایسی تحریریں نظر سے گزریں کہ خراج تحسین پیش کرنے کو دل چاہا مگر قاری بہنوں نے اس قدر خوب صورت اور جامع الفاظ میں تعریف اور تنقید کی کہ اپنے الفاظ چھوٹے لگے۔ مگر یہ پہلا موقع ہے کہ دل خط لکھنے کو بے قرار ہوا اور وجہ بنیں "سائرہ رضا" شاید ہی کسی مصنفہ نے ان انتہائی نازک مسائل پر لکھا ہو اس قدر عام فہم کہ ہمارے جیسوں کو بھی بات سمجھ میں آجائے کہانی پڑھتے ہوئے جہاں کہیں کنفیوژن ہوا۔ وہ اگلے صفحات پہ ہوا۔ اس لیے سائرہ جی سے کوئی سوال نہیں۔ بس ایک فرمائش۔

اگر ان مسائل جن سے "اصدق عبدالقیوم" نبرد آزما تھا' اس کو اس مسئلے کا حل بھی ملا' ان سے کسی عورت کا سامنا ہوتا؟ اس موضوع پہ سائرہ کی تحریر کی منتظر رہوں گی۔ آخر میں سمیرا حمید کے افسانے "راکھ" کے بارے میں بات کرنا چاہوں گی۔ بے وفائی تو یوسف نے بھی کی سزا کی مستحق صرف سفینہ ہی کیوں ٹھہری؟

ج: فائزہ آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اکیس سال کی خاموشی کے بعد آپ نے خط تو لکھا خواہ مختصر ہی سہی۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔ آپ کا سوال بہت اہم ہے اور جواب شاید کسی کے پاس بھی نہ ہو کیونکہ ہمارے معاشرے میں خود عورت نے کبھی اپنی صنف کے بارے میں نہیں سوچا تو پھر دوسرا کون سوچے گا۔ آپ کی فرمائش سائرہ رضا تک پہنچا رہے ہیں۔

راکھ میں سفینہ کو سزا نہیں دی گئی' وہ تو تقدیر کے ستم کا شکار تھی۔

مدیحہ نورین.... برنالی

سب سے پہلے محفل کی شہزادیوں کو خراج تحسین پیش کرتی چلوں' عنیزہ سید' نگہت عبداللہ بہت خوب آپ تو شاہی تاج کی حق دار ہیں' رئیلی سمیرا شریف طور آپ بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ سالگرہ نمبر کے لیے دعا۔

تیری محفل کے ستارے چمکتے رہیں
تیری کامیابیوں کے پل بڑھتے رہیں

ج: پیاری مدیحہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کا دعائیہ شعر شامل ہے۔

شائستہ اکبر.... ڈگری کالج گزر

امید کا سایہ ہے نہ رستہ ہے نہ منزل
ہم کتنے اکیلے ہیں محبت کے سفر میں

کیا آپ مجھے بھول گئی ہیں؟ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں سے فیضیاب ہو کر سیدھا اپنے فیورٹ ناول "میرے خواب لوٹا دو" تک چھلانگ لگائی۔ نگہت عبداللہ نے اس بار بھی بہت اچھا لکھا۔ نگہت سیما کا ناول "زمین کے آنسو" بہت ہی اچھا جا رہا ہے۔

پلیز احمد رضا کے ساتھ اچھا کیجیے گا' جب میں احمد رضا کے سین پڑھتی ہوں تو مجھے بہت رونا آتا ہے۔ اللہ کرے احمد رضا کا اینڈ اچھا ہوا۔ (آمین) "کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ سید ویل ڈن جی! آپ بہت کامیاب جا رہی ہیں۔

ج۔ شائستہ! ہم اپنے قارئین کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ آپ کی تحریریں ہر ماہ شامل ہوتی ہیں۔

اشعار آپ کو پسند نہیں آئے۔ یہ سلسلہ قارئین کے انتخاب سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ آپ اچھے اشعار بھجوائیں۔ ضرور شائع کریں گے۔

فرخندہ جبیں۔۔۔ نامعلوم شہر

کچھ عرصہ قبل ایک ناول ضبط تحریر میں لائی' لیکن بھجوانے کا مرحلہ طے نہیں کر سکی' کیونکہ کچھ کمی سی تھی جو محسوس ہو رہی تھی۔ بس اس ناول کی طوالت اور وقت کی کمی ہے کہ میں پھر سے لکھ نہیں پائی اور وہ یوں ہی دھرا ہے۔ کیا اسے یوں ہی بھجوا دوں۔

ج پیاری فرخندہ! آپ اپنا ناول بھجوا دیں۔ نوک پلک ہم خود سنوار لیں گے۔ دوبارہ خوش خط لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اقصیٰ' عائشہ۔۔۔ ہارون آباد

ماشاء اللہ دن بدن خواتین کا معیار بہتر سے بہترین ہوتا جا رہا ہے۔ سب ہی سلسلے بہت خوب ہیں۔ میں ہر قسط وار ناول پڑھ کر اس کی اگلی قسط کے بارے میں اندازے لگاتی ہوں کہ آگے جانے کیا ہوگا' لیکن "کوہ گراں تھے ہم" کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ بہت بہت خوب صورت ناول ہے۔ میں نے "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" ناول منگوانا ہے۔ منی آرڈر میں نہیں کروا سکتی۔ کوئی اور طریقہ ہو تو پلیز بتا دیں' ضرور۔

ج ۔ اقصیٰ' عائشہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ عنیزہ سید تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" منگوانے کے لیے آپ 250 روپے منی آرڈر کر دیں۔ ایڈریس ہے۔
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 ۔ اردو بازار۔ کراچی۔
منی آرڈر کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔

ثمینہ اکرم۔۔۔ لیاری کراچی

"کرن کرن روشنی" ایک ایسا سلسلہ جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے اس ماہ تقدیر کے بارے میں ایمان افروز احادیث پڑھ کر میری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ بے شک ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا جا چکا ہے مگر دعا تقدیر کو بدل سکتی ہے۔ "خامشی کو بیان ملے" میں فائزہ محمود' بہاولپور سے مل کر خوشی ہوئی۔ "کوہ گراں تھے ہم" اگر اس ماہ اس تحریر پر تبصرہ نہ کیا تو بہت زیادتی ہوگی۔ عنیزہ سید ایک باکمال رائٹر ہیں جن کے قلم سے لکھے لفظوں سے فسوں طاری ہو جاتا ہے۔ نور فاطمہ کی کی گئی باتیں اس دفعہ مجھ پر بہت اثر انداز ہوئیں اور میں نے بار بار یہ کہانی کو پڑھا۔ خاص طور پر یہ پیراگراف۔

"غم کا پیمانہ کیا ہے کوئی اس راز کو نہیں سمجھ سکتا۔ غم میں گھرے انسان کو اپنا دکھ ہی سب سے بڑا نظر آ رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے زیادہ دکھی تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔"

اللہ کے ہر کام میں مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ سعد سلطان کو بھی یہ بات دیر سے سمجھ آئی۔

میری بیاض سے میں یاسمین ظفر کا شعر من کو بھایا۔

"ہمارے نام" میں عائشہ فیاض کا خط بیسٹ آف دی منتھ رہا۔ "میرے خواب لوٹا دو" ہر ماہ دلچسپ سے دلچسپ ترین ہوتا جا رہا ہے۔ اب اریبہ کا کردار بڑا جان دار ہو گیا ہے۔ یاسمین کو بھی اللہ نے ہدایت کا راستہ دکھایا۔ شمشیر سے بھی ان کا قریبی رشتہ نکل ہی آیا۔

11 مئی الیکشن ڈے کے حوالے سے مسز ہدایت مردان کی تحریر پڑھی اگر جو مسز ہدایت ایک قاری ہیں تو بہت خوب..... ان کا انداز تحریر رواں اور پختہ ہے اگر ایک لکھاری ہیں تب بھی بہترین۔ ایسی ہلکی پھلکی تحریریں پڑھ کر طبیعت کا بوجھل پن کم ہو جاتا ہے۔ اب آخر میں بات کروں گی اس تحریر کی۔ جو اس ماہ کی سب سے بہترین تحریر ٹھہری۔ جی ہاں سائرہ رضا کا ناول "سیدھی سڑک" جب اس ناول کو نماز عشا کے بعد میں نے پڑھنا شروع کیا۔ تو میں ارد گرد سے غافل ہو گئی۔ کب لائٹ گئی؟ کب غنویٰ نے چارجنگ لائٹ آن کی؟ کب لائٹ کم ہونے کے سبب اکرم دوسری چارجنگ لائٹ میرے پاس رکھ کر گئے؟ گرمی کی شدت..... پسینہ مچھر۔ ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر رات ڈیڑھ بجے تک میں نے یہ ناول ختم کیا۔ تب محسوس ہوا کہ میرے پورے کپڑے پسینے میں شرابور ہیں اور گرمی سے میرا برا حال ہے "سیدھی سڑک" میں انہوں نے کافی بولڈ موضوع چنا اور آخر تک اسے نبھایا بھی۔ ان کے الفاظ کی جادوگری نے کہیں بھی قاری پر بوجھل پن طاری نہیں کیا

"اصدق" میری پیاری دوست طاہرہ مبین کے بیٹے کا نام ہے یہ ناول پڑھتے ہوئے وہ بے تحاشا یاد آئی اگر یہ پڑھے تو ضرور مجھ سے رابطہ کرے۔"

چندرا جس کا پیشہ اچھا نہ سہی۔ مگر اس کی باتیں اچھی تھیں۔

اصدق پر اللہ کی خاص عنایت تھی جو اس نے گناہ کی زندگی گزارنے سے بچ کر پاکیزہ اور سیدھا راستہ اختیار کر لیا۔ بہرحال اس ناول میں ایک اچھا مقصد اور سبق Convey ہو رہا ہے۔ ان بیویوں کے لیے جو اپنے شوہر پر باقی فیملی کو ترجیح دیتی ہیں آخر میں اپنا نقصان کر بیٹھتی ہیں۔

ج : ثمینہ! ہمیشہ کی طرح تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ بہت شکریہ۔

آپ نے اپنی دوست کو یاد کیا تو ہمیں بھی اپنی دوستیں یاد آ گئیں رضیہ امین' عشرت جہاں اور تنویر عالم۔ یونیورسٹی میں ہمارے ساتھ تھیں نہ جانے کہاں گم ہو گئیں شاید یہ سطور پڑھ کر وہ بھی رابطہ کر لیں۔

صفیہ عباس۔۔۔ کروڑ لعل عین (لیہ)

یہ لازمی نہیں کہ ہم کو ہر دن یاد کرو فراز
مگر بھول جاؤ اس کی بھی اجازت نہیں تمہیں

جون کے شمارے کا ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ ماڈل تو اچھی تھی مگر ڈریس کا ڈیزائن اچھا نہیں لگا۔ سب سے پہلے "زمین کے آنسو" پڑھا۔ زبردست اچھا ہوا' ایک قسط بڑھا دی گئی۔ اب تو اصل مزہ آ رہا ہے۔

سائرہ رضا کا "سیدھی سڑک" اچھا لگا۔ فرحین اظفر کا ناولٹ "مقروض گناہ گار" بھی بہت اچھا تھا۔ افسانوں میں "معاف کر دو" اور سمیرا حمید کا "راکھ" بہت خاص لگا۔

ج : صفیہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ آپ نے یہ سوچ کر خط نہیں لکھا کہ شامل نہیں ہوگا لیکن خط شامل ہو نہ ہو تب بھی ہم تمام خط پڑھتے ضرور ہیں۔ اس لیے آپ ہمیں خط ضرور لکھیں۔

فرحانہ اسحاق۔۔۔ فیصل آباد

جون کے ماہنامے میں جس تحریر کو میں نے سب سے پہلے پڑھا وہ "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" تھی۔ عنیزہ سید سے معذرت کے ساتھ اس بار کی قسط زیادہ اچھی نہ لگی۔ اس قسط میں عنیزہ نے صرف گتھیاں الجھائی ہیں اور کسی بھی بات کی وضاحت سے گریز کیا ہے اور اس گریز نے بے زاری میں مبتلا کیا ہے۔ نور فاطمہ کا کردار بھی "سفال گر" کی حلیم بیگم سے متاثر محسوس ہوا ہے۔

میرے خواب لوٹا دو' خوب رہی۔ یاسمین کا صادق آباد جانا' ماں سے ملنا' پرانے رشتوں کی بحالی یہ سب واقعات خوشگوار تاثر چھوڑ گئے۔ نگہت عبداللہ نے ایک جگہ جمیلہ آپا کی تعریف کرتے ہوئے لکھا "خدا نے جمیلہ کو فرصت سے بنایا' تو میں نگہت سے یہ کہنا چاہتی ہوں۔ مصروفیت اور فارغ البالی انسانی خصوصیات ہیں۔ خدا تعالیٰ تو صرف کن کہتا ہے اور سب ہو جاتا ہے۔ ایسے جملے استعمال کرنا غیر مناسب ہے۔

آمنہ تو ہماری پیاری اور پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ تنزیلہ ریاض کی غیر حاضری ہمیں آمنہ کا زیادہ بڑا فین بنا رہی ہے۔ آمنہ کے نئے ناول "ماہ تمام" کا مطلب کیا ہے؟ ضرور بتائیے گا۔

ج : عنیزہ سید کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جو جزئیات نگاری پر بھرپور توجہ دیتی ہیں اور کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتیں۔ ان کا مشاہدہ' مطالعہ اور سوچ ان کی تحریروں میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے قاری چونکہ ایک ماہ بعد قسط پڑھتا ہے تو اس کو لگتا ہے کہانی آگے نہیں بڑھی اور رکی ہوئی ہے جبکہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ عنیزہ گتھیوں کو سلجھا رہی ہیں یہ ضرور ہے کہ ان کا انداز دھیما ہے۔

"فرصت سے بنانا" محاورہ ہے۔ اگر اس میں اللہ تعالیٰ کی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے تو آئندہ خیال رکھیں گے۔

ماہ تمام کا مطلب ہے۔ پورا چاند' چودھویں رات کا چاند۔

فائزہ شیخ محمد عباس۔۔۔ نامعلوم شہر

مئی کے شمارے میں میں نے صرف ماہ تمام کی دوسری قسط اور افسانہ پودینے کی چٹنی پڑھا' دراصل چھوٹے بھائی کا بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ دماغ پر چوٹ آنے کی وجہ سے حالت بہت خراب تھی۔ آئی سی یو میں تھا مگر اب اللہ تعالیٰ کا بہت کرم ہے کہ اس نے بھائی کو نئی زندگی عطا کی۔ کسی کار والے نے بائیک کو بہت زبردست مارا۔ 10

فٹ کی اونچائی سے بھائی آکر گرا اور دماغ میں پتھر لگ گیا۔ سچ تو یہ ہے میرا بھائی میرا بیٹا بھی ہے اور ایک دوست بھی، اپنی ہر بات شیئر کرتا ہے ہمیشہ وہ ہی مجھے ڈائجسٹ لا کر دیتا ہے۔

ج : آپ کے بھائی کے حادثہ کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔ دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت دے۔ آمین۔ قارئین سے بھی درخواست ہے کہ فائزہ کے بھائی کی صحت کے لیے دعا کریں۔

مسز راشدہ یاسین راؤ۔۔۔ کوٹ ادو

خواتین اور شعاع ہمارے لیے اک درس گاہ ہے جو ہم کتابوں سے نہ سیکھ سکے۔ اسکول کالج سے نہ سیکھ سکے۔ اس نے ہمیں گھر بیٹھے زندگی کے وہ سبق دیے جو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں، رشتوں کو نبھانا، زندگی کو سمجھنا کیا کچھ نہیں جو ہمیں ان رسالوں سے نہ ملا ہو۔

میں نے صرف سائرہ رضا کو مبارک دینے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ "سیدھی سڑک"

اتنا حساس موضوع میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ نیا موضوع تھا مگر جس مسئلے کی طرف نشان دہی کی۔ وہ بہت اہم اور نازک مسئلہ تھا بہت کم لکھا کسی نے اس موضوع پر، وہ مبارک باد کی مستحق ہیں وہ واقعی انصاف کرپائی ہیں اصدق کا کردار بہترین تھا۔ اصدق کو اپنے لیے بھی سوچنا تھا۔ اس کا انجام بالکل ٹھیک تھا۔ فائزہ کا کردار بھی ایک فرماں بردار بیٹی اور بہو کا منہ بولتا ثبوت تھا لیکن اچھی بیوی کا نہیں۔ نگہت عبداللہ کو بھی بہترین ناول لکھنے پر مبارک باد۔

ج : پیاری راشدہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سائرہ رضا اور نگہت عبداللہ تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

مسز عنبر سعید۔۔۔ گل دامن لاہور

عنیزہ سید صاحبہ کا ناول "کوہ گراں" جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے کہ الجھتا ہی جاتا ہے ہر کردار بے نام و نشاں۔

"زمین کے آنسو" ایک فیملی میں تو مبالغہ آرائی بہت ہے ہاں احمد رضا کا باب تھوڑا دلچسپ ہے۔ جو ناول پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ "میرے خواب لوٹا دو" بہت زبردست تحریر ہے یعنی شمارے کی جان۔ باقی ناولٹ، افسانے سب اچھے ہیں۔ ہاں از میریٹ، شبلی، جوادی کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ مستقل سلسلے بھی سب اچھے ہیں۔

ج : عنبر! عنیزہ سعید کی کہانی میں کرداروں کا مکمل تعارف ہو چکا ہے۔ اب کہانی واضح ہو گی تو آپ کی الجھن دور ہو جائے گی۔ نگہت عبداللہ تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

شازیہ رضوی۔۔۔ کراچی

میرے خط لکھنے کی وجہ "محترمہ آمنہ ریاض کا ناولٹ "ماہ تمام" ہے آمنہ ریاض بلاشبہ بہت اچھی رائٹر ہیں اور یقیناً" یہ ناولٹ بھی بہت اچھا ہو گا اس ناولٹ میں محترمہ نے گھر کے سربراہ کا نام "عبدالباقر لودھی" رکھا ہے۔

میں آپ کی توجہ اس امر کی جانب دلانا چاہتی ہوں کے "عبد" کے معنی "بندہ" ہوتا ہے اور "عبد" صرف اسماء ربانی کے آگے ہی لگتا ہے۔ جیسے عبداللہ عبدالرحمان عبدالودود وغیرہ۔

ج : شازیہ! آپ نے بہت اہم اور صحیح مسئلہ کی جانب توجہ دلائی بہت شکریہ۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔

صفورہ حسین۔۔۔ پاکستان

عنیزہ سید ایسی رائٹر ہیں جو بھی لکھیں ہر تحریر قیمتی، ہر جملہ شان دار اور ایک ایک لفظ انمول ہے۔ "زمین کے آنسو" میں کچھ آنسو ہمارے بھی شامل کر لیجیے احمد رضا جیسے نوجوانوں کی سادہ لوحی پر جو اپنے خوابوں کی تعبیر تک اڑان بڑھنے کے لیے ایسے راستوں کے مسافر ہو جاتے ہیں جہاں سے پھسلنا تو مقدر بنتا ہی ہے "میرے خواب لوٹا دو" کے بارے میں کیا کہوں سورج تو سورج ہے جب نکلتا ہے تو سب دیکھتے ہیں۔

سمیرا حمید کا "راکھ" شان دار رہا۔ باقی افسانے کچھ خاص تاثر نہیں دے سکے۔

ماہ جون کا شمارہ تو ویسے بھی میں اپنا برتھ ڈے گفٹ خیال کرتی ہوں۔ لیکن اس دفعہ ایسا لگا کہ سائرہ رضا اور ثمرہ بخاری کو کچھ تو خبر تھی کہ جون کے مہینے میں کچھ بہت خاص اور اہم وقوع پذیر ہوا ہے (آہم) جب ہی ان کی خاص الخاص تحاریر ہمارے تحفہ کو تکمیل دے گئیں۔ آخر میں صرف اتنا کہنا ہے کہ اللہ آپ کو اجر دے کہ ایسے انمول فن پارے دیے بلکہ بے شمار ذہن اور شوقین لکھاریوں کو ایسا پلیٹ فارم بھی مہیا کیا کہ شاید کہیں مشکل سے ہی ملتا۔

ج : صفورہ جی! جون کا شمارہ آپ کو اپنی سالگرہ کا خصوصی تحفہ محسوس ہوا۔ بہت شکریہ۔ ہماری جانب سے سالگرہ کی مبارک باد قبول کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ خواتین ڈائجسٹ کی کامیابی کے لیے صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر کرم ہے کہ اس نے ہماری محنتوں کو پذیرائی بخشی۔

حنا سلیم اعوان۔۔۔ گاؤں آخون بانڈی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔ کہانیوں میں، میں سب سے پہلے، حسب معمول قسط وار ناولز سے شروع کرتی ہوں "میرے خواب لوٹا دو" میرا فیورٹ ہے۔ نگہت عبداللہ کا بے ساختہ انداز تحریر مجھے از حد پسند ہے۔ اریبہ کا کردار تو پہلے سے فیورٹ تھا۔ اب شمشیر اور اریبہ کی جوڑی بہت بہت اچھی لگ رہی ہے۔ سارہ اور رازی کے درمیان استوار تعلق بہت ناگوار گزر رہا ہے۔ "کوہ گراں تھے ہم" کو پڑھتے ہوئے عجیب سا سُرور طاری رہتا ہے۔ ایک ان دیکھا سا سحر جو قاری کو اپنے حصار میں لیے رکھتا ہے۔

"زمین کے آنسو" پڑھتے ہوئے کبھی کبھار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے اریب فاطمہ اور ایبک کے درمیان رابیل آنے والی ہے۔ "سیدھی سڑک" بلاشبہ سائرہ رضا نے بہت اچھا لکھا ہے۔ اس کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑنے لگے ہیں۔ "ماہ تمام" ساحر کی دوہری شخصیت پر بے تحاشا غصہ آتا ہے۔ شفا کی جوڑی یقیناً" تقی کے ساتھ ہو گی۔ "مقروض گناہ گار" میں، آخر میں راجی پہ بے پناہ ترس آیا۔ اس رویے پر دکھ ہوا، جو مدثر نے شادی کے بعد راجی سے روا رکھا تھا۔ "ہم سے ہے زمانہ" پہلے کی طرح جان دار نہیں تھا۔ پتا نہیں ذرا مزہ نہیں آیا اور نام بھی کچھ چینج تھے۔ جیسے شہربانو کا سویرا۔ اور جوادی کی اماں کا نام بھی تبدیل ہو چکا ہے۔ افسانے سب ہی ہمیشہ کی طرح بہترین اور سبق آموز تھے۔ انٹرویوز میں اریج فاطمہ کو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ شکل اور باتوں سے وہ کافی معصوم سی لگی۔ "خاموشی کو بیاں ملے" میں حمیرا عروش کے جوابات نے مزہ دیا۔ ایک بہن نے اذان شاہ اور عینا کی کہانی کے بارے میں پوچھا تھا۔ یہ درثمن کی کہانی تھی نام شاید "میں محبت اور تم" تھا۔ یہ اگست 2006ء کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوئی تھی۔

اور ٹائٹل گرمیوں کے حساب سے ہی دیا کریں۔ گرمیوں میں کھلے بالوں اور چوڑیوں، جیولری وغیرہ سے سخت الجھن محسوس ہوتی ہے۔ آپ سے ایک گزارش ہے کہ پلیز ابرار الحق سے تفصیلی ملاقات کروائیں۔ اور ایف ایم 101 کراچی کے آر جے زعدیل عباسی۔ انس کے عباسی کے انٹرویوز دیں۔

ج : پیاری حنا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ شعاع میں تو آپ کے خط ہر ماہ باقاعدگی سے ملتے ہیں۔ خواتین میں آپ نے پہلی بار لکھا ہے، بہت خوشی ہوئی۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نگہت عبداللہ کے ناول میں سارہ پر غصہ نہ کریں۔ وقت کے کچھ لمحے، کچھ گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان خود کو بہت کمزور، بہت بے بس پاتا ہے، ممکن ہے کہ سارہ بھی ایسے ہی کسی کمزور لمحے کا شکار ہو گئی ہو۔

عنیزہ سید کا ناولٹ کتابی شکل میں نہیں آیا۔

اقصیٰ مریم ملغانی، اسوہ مریم ملغانی۔۔۔ کاسی اسٹریٹ کوئٹہ

زندگی کے اجالوں میں بعض مرتبہ ایسے موڑ بھی آتے ہیں کہ جب یہ سارے اجالے اڑن چھو ہو جاتے ہیں۔ سوائے اندھیری راہوں کے کچھ نہیں رہتا۔ میری زندگی میں بھی ایسا ہی لمحہ آیا اور یہ لمحہ دو ماہ، ساٹھ دنوں کی طویل مدت تک میرے ساتھ ساتھ رہا۔ پھر اپنوں نے اپنی اپنائیت کا احساس دلایا۔ اپنے پرائے سب لوگوں نے ڈھیر ساری دعائیں کیں۔ رو کر، چیخ کر بے ہوشی میں، غنودگی میں رت جگوں میں میں نے بھی اپنے رب کو ہر گھڑی یاد رکھا پھر وہ کیسے مجھے نا امید لوٹاتا۔ اب میں مکمل طور پر فٹ ہوں۔ لیکن صد افسوس کہ ان افسردہ وقتوں میں میرا خواتین اور شعاع مجھ سے چھوٹ گئے "زمین کے آنسو" کی کئی اقساط پڑھ ہی نہیں پائی۔ عنیزہ سید کی داستان کی دو قسطیں نہ پڑھ سکی۔ لیکن اب جیسے ہی ٹھیک ہوئی تو فوراً" سے پہلے جون کا خواتین منگوایا۔ سائرہ رضا کو مبارک باد۔ "سیدھی سڑک" بہت عمدہ تحریر تھی۔ ناولٹ میں ثمرہ بخاری بازی لے گئیں۔ آسیہ رزاقی نے بھی اچھا لکھا۔ اس کے علاوہ افسانوں میں سارے ہی اپنی جگہ انمول تھے۔ اریج فاطمہ اور عائشہ گل سے ملاقات خوب رہی۔

باقی سارے سلسلے بھی اچھے تھے۔

ج : پیاری اقصیٰ! آپ کو صحت یابی پر مبارک باد۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر بیماری اور پریشانی سے محفوظ رکھے۔ سچ یہ ہے کہ صحت کی قدر تب آتی ہے جب ہم بیمار ہوتے ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نیلم بنت گل حسن..... عطاریہ

سائرہ رضا کا ناول سیدھی سڑک پڑھا۔ بہت ہی عمدہ لکھا گیا۔ زبردست مزہ آیا پڑھ کر۔

ہرماہ کسی نہ کسی تحریر میں اللہ میاں کالفظ لکھا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یا اللہ پاک لکھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کو اوپر والا نہیں لکھنا چاہیے۔ عنیزہ سید کا ناول بھی رواں دواں ہے۔ کھاری لگتا ہے۔ شہناز کا بیٹا ہے اور سعد تو ہے ہی رابعہ کا۔ ریحانہ اسلم نے بھی اچھا لکھا۔ فرحین اظفر کا ناولٹ پورے شمارے کی جان تھا۔

آمنہ ریاض اچھا لکھ رہی ہیں لیکن اس کو زیادہ طویل نہ کریں۔ میرے خواب لوٹا دو میں تو مجھے اس اریبہ پر اتنا غصہ ہے کہ حد نہیں..... شبلی جوادی کو ہم اتنے عرصہ سے یاد کر رہے تھے۔ ثمرہ بخاری کا ناولٹ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ زمین کے آنسو بہت ہی اچھا جارہا ہے۔ نگہت سیما ہیں بھی بہت پیاری رائٹر۔

ج : نیلم! دس گیارہ سال پہلے آپ نے خط لکھا اور پھر خاموشی۔ اتنا طویل عرصہ تک آپ نے کوئی خط نہیں لکھا کیا کسی بھی تحریر نے آپ کو متاثر نہیں کیا؟ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھیے گا۔

تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

مسز عابد..... نارتھ ناظم آباد کراچی

سائرہ رضا کا ناول سیدھی سڑک ویسے تو صحیح تھا لیکن ایک غلطی بار بار کھٹکتی رہی۔ سائرہ رضا نے جگہ جگہ دبئی کی کرنسی کا نام ریال لکھا ہے۔ ریال سعودی کرنسی ہے جبکہ دبئی میں کرنسی کا نام درہم ہے۔

ج : مسز عابد! غلطی کی نشان دہی کے لیے بہت شکریہ۔ یہ سائرہ کی نہیں ہماری بھی غلطی ہے۔ آئندہ ان جزئیات کا خیال رکھیں گے۔

آسیہ ثبات..... حافظ آباد

تمام رائٹرز کو پڑھا ہے اور ہر کسی کے کسی نہ کسی الفاظ نے متاثر کیا۔ بس تبصرہ نہ کر سکی۔ کیوں کہ خط لکھنا نہیں آتا اس ڈائجسٹ میں ہمیں ماں، بہن استاد تمام رشتوں کی جھلک ملتی ہے۔

آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ یہ بتادیں کہ خط لکھنے کے اصول و آداب کیا ہیں اور کب سے کب تک خط آپ کو مل جانا چاہیے۔

ج : پیاری آسیہ! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی خط لکھنے کا کوئی طریقہ یا اصول نہیں ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی جو تحریریں اور سلسلے آپ کو پسند آئے ان کے بارے میں لکھ دیں اور جو پسند نہیں ان کے بارے میں اپنی رائے بتا دیں۔

خواتین ڈائجسٹ کے لیے ہمیں 20 تاریخ تک خط مل جانا چاہیے اس کے بعد ملنے والے خط شامل نہیں ہو پاتے۔

آپ نے بہت اچھا خط لکھا ہے۔ بس آئندہ خط لکھیں تو تمام کہانیوں اور سلسلوں کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔

ثمینہ کوثر عطاری، صبا نوشاہی..... ڈوگہ گجرات

السلام علیکم! خواتین 9 کو اچانک بھائی آفس سے واپسی پہ لے آیا میری تو خوشی دیدنی تھی کہ بغیر ترلہ منت کیے اتنی جلدی خواتین مل گیا۔ سرورق کچھ خاص نہیں لگا "زمین کے آنسو" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے سارے کردار ہی بہت زبردست ہیں خواہ وہ ایبک شاہ ہو رابیل ہو احمد رضا ہو یا پھر اریب فاطمہ "میرے خواب لوٹا دو" بھی زبردست جارہا ہے اور سائرہ رضا کے لیے فقط اتنا کہوں گی "نام ہی کافی ہے" افسانے سارے اچھے تھے۔

خطوط میں اگر فوزیہ ثمر اور امبر گل کا تبصرہ نہ ہو تو بالکل مزا نہیں آتا۔

ج : ثمینہ اور صبا! امبر گل اور فوزیہ ثمر ہماری بہت اچھی تبصرہ نگار ہیں بہت تفصیلی لکھتی ہیں بلکہ ہماری سب ہی قارئین بہت اچھے خط لکھتی ہیں۔ خواتین کے سلسلوں کا حسن ان کے ہی دم سے ہے۔ فوزیہ اور امبر نے خط لکھا تو ضرور شامل کریں گے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

الف اے انا..... واہوا

خواتین ڈائجسٹ سے وابستگی؟ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کہاں سے شروع کروں ہوش و شعور کی منزل پر پہنچنے سے پہلے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو اپنے آس پاس بہت سارے رسائل میگزینز اور کتب کو پایا۔ پڑھا سب کو لیکن جواب تک ساتھ ہے "وہ خواتین اور شعاع ہے ویسے تو ٹو کلاس سے ہی پڑھنا شروع کردیا تھا لیکن ٹھیک طرح سمجھ کر فائیو کلاس سے پڑھا اور ساتھ ہی ساتھ لکھا بھی، میرے نظریے کے مطابق خواتین میں شائع ہونے والی کہانیاں صرف وقتی ٹائم پاس نہیں بلکہ ایک وے آف لائف۔ یعنی زندگی گزارنے کا طریقہ دیتی ہیں۔

ج : انا! آپ نے اپنا نام نہیں لکھا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ شاعری اور افسانہ پڑھا نہیں۔ قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔

افشین فاروق..... کراچی

ماڈل بہت زبردست اور فریش تھی۔ آمنہ ریاض کی ماہ تمام پڑھ کر بڑا مزا آیا۔ نند بھابھی کے مسائل شاید کبھی نہ کبھی ختم ہو جائیں گے۔ ان کی غلط فہمیاں دور ہو ہی جائیں گی۔ ان کے بھائی کو چاہیے کہ گھریلو معاملات پر بھی غور کریں۔ بیوی کی یک طرفہ باتیں نہ سنا کریں یا بہن کی سنتے تھے اب بیوی کی سنتے ہیں۔ نمیرا احمد کا "راکھ" پڑھ کر حقیقت سے قریب تر لگا واقعی۔

سائرہ رضا "سیدھی سڑک" حقیقت سے قریب تر ہے انسان اپنی خواہشات جتنی چاہے بڑھاتا جاتا ہے اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنا نقصان کرجاتا ہے خواہشوں کا غلام ہو جاتا ہے۔

ج : افشین خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ اطمینان رکھیں، قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

رضیہ عطا، خدیجہ عطا اور مریم عطا..... لنگروٹھہ تونسہ شریف

خواتین ڈائجسٹ کی ہر تحریر دل کو چھو لیتی ہے۔ اس کے انتظار میں ہم بہنیں مہینے کا ایک ایک دن گن گن کر گزارتی ہیں۔ کرن کرن روشنی اور ہمارے نام ہمارے پسندیدہ ہیں۔

عنیزہ سید ویل ڈن۔ آپ کی ہر تحریر دل کو چھو لیتی ہے۔ آپ کا ناول بہت خوب صورت ہے۔ اس میں ہر کردار بڑا خوب صورت ہے خاص کر سعد سلطان عنیزہ جی پلیز سعد اور ماہ نور کو کبھی علیحدہ نہ کیجیے گا۔

"میرے خواب لوٹا دو" اریبہ نے شمشیر کے ساتھ شادی کرنے کا بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ سارہ کا کردار پڑھ کر بہت دھچکا لگا۔ کوئی بہن ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ ہم نے سوچا نہ تھا۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول "سیدھی سڑک" بے مثال تھا جس میں انسانی فطرت، اپنوں کی خود غرضی اور حسد دکھایا گیا ہے۔ "زمین کے آنسو" بھی خوب صورتی سے جاری ہے۔ نگہت جی ایبک شاہ کی شادی رابیل سے کیجیے گا۔

آمنہ ریاض کا ناول "ماہ تمام" بھی اچھا ہے۔ مجھے اس میں ماہ میں سب سے زیادہ "معاف کر دو" افسانہ بہت اچھا لگا جس میں ہمارے معاشرے کی تلخ سچائی کو ظاہر کیا گیا ہے۔

ج : رضیہ، خدیجہ اور مریم! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ آپ نے خط لکھا۔ بہت خوشی ہوئی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

ایمن قیوم خان..... ایبٹ آباد

بات ہو جائے کچھ اپنی تو مجھے اس ارض فانی پر آئے ہوئے تقریباً" سولہ سال ہونے کو ہیں اور خواتین اور میرا رشتہ تقریباً" تین سال پرانا ہے۔ میں عمر کے اس حصے میں ہوں جس میں انسان سے کئی نادانیاں سرزد ہو جاتی ہیں اور کہتے ہیں ناکہ یہ عمر ایک پل کی مانند ہے گزر گئے تو آگے بہار ہی بہار اور گر گئے تو کانٹے ہی کانٹے اور خواتین نے میرے سمیت کئی لڑکیوں کو اس پل کو پار کرنے کے گر سکھائے۔ کئی اجڑے گھر بسائے اور کئی بے سہارا لوگوں کو سہارا دیا اور مجھے اتنی پیاری پیاری باتیں سکھائیں کہ اکثر میرے عزیز مجھ سے پوچھتے ہیں۔

"ایمن تم اتنی اچھی باتیں کیسے کرتی ہو؟"

میری دعا ہے کہ خواتین ہمیشہ ایک ایسے شجر کی مانند رہے جو دوسروں کو سایہ اور پھل دے کر فائدہ پہنچاتا ہے۔

ج پیاری ایمن! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں ہمیشہ بہار ہی بہار رکھے۔ آمین

صدف صابر...... سعودی عرب

سعودی عرب میں رہنے کے باوجود میں "شعاع" اور "خواتین ڈائجسٹ" کی ایک مستقل قاری ہوں۔ آپ کے رسالے کی خاص بات یہ ہے کہ آپ ایک ہی شمارے میں ہر طرز زندگی کو بخوبی سمو لیتے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے۔ آپ کے ادارے اور شمارے کو جو بات نمایاں کرتی ہے، وہ ہے آپ کا نئے لکھنے والوں کو موقع دینا۔ آپ کے شمارے میں مقبول لکھنے والوں کے علاوہ نئے لکھنے والوں کے نام بھی میری نظر سے اکثر گزرے ہیں اور پھر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ نئے لکھاری کس طرح آپ کے رسالے کے توسط سے مقبول ہوئے ہیں۔ اسی بات نے مجھے متاثر کیا ہے اور اسی لیے میں نے بھی قلم اٹھانے کی ہمت کی ہے۔

ج: پیاری صدف! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اس میں شک نہیں ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ان کی صلاحیتوں کو سامنے لانے میں ادارہ خواتین ڈائجسٹ کا کردار بہت اہم ہے۔ اطمینان رکھیں! کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

شیریں ظفر...... راجن پور

کراچی جیسے خوب صورت شہر کو ایک بھیانک عفریت نگل رہا ہے، جو نظر نہیں آتا مگر اچانک کسی سمت سے حملہ آور ہو جاتا ہے کیا انسانی جان اتنی ارزاں ہو گئی ہے، ہمارے ملک میں کسی کو بھی سینکڑوں لوگوں کے سامنے مار کر بچ سکتے ہیں ہزاروں بوری بند لاشیں اپنا قاتل کیسے ڈھونڈیں گی۔

رسالے کی جان عنیزہ سید کا "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" تھادسویں قسط تک، عنیزہ نے تمام کرداروں کو گرفت میں لے رکھا ہے۔ شاہکار ناول ہے ہر کردار پرفیکٹ ہے۔ جیسے انگوٹھی میں نگینہ "عنیزہ جی! اتنا سارا کیسے سوچ لیتی ہیں آپ۔"

دوسرا ناول گرچہ نگہت عبداللہ لکھ رہی ہیں مگر کہانی میں کئی جگہ جھول ہیں، پھر بھی لازمی پڑھتی ہوں۔ "زمین کے آنسو" میں کردار بلکہ کرداروں کی بھرمار، صرف احمد رضا والا پورشن نیا ہے۔

ج شیریں! کراچی کے حالات سے پورا ملک متاثر ہوا ہے خصوصاً "بیرونی سرمایہ کاری میں بے حد کمی ہوئی ہے۔ ملکی سرمایہ کار جب یہاں سرمایہ کاری نہیں کر رہے تو باہر سے سرمایہ آنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس قتل و غارت کا مقصد بھی یہی ہے کہ حالات اس قدر خراب کر دیے جائیں کہ پاکستان معاشی طور پر دیوالیہ ہو جائے۔

اس ماہ کی تحریروں پر آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ثمینہ کوثر...... ڈوگر گجرات

سرورق بہت پیارا تھا، سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" پڑھا۔ اس کے بعد "زمین کے آنسو" بہت خوب صورت موڑ پہ ہے نگہت جی احمد رضا کو حسن رضا سے ملا دیں پلیز اور مائرہ کے ساتھ تو ضرور برا ہونا چاہیے "میرے خواب لوٹا دو" ویری نائس۔ ویسے سارہ کی شادی جلال سے ہی ہوگی اور شمشیر علی کی اریبہ اور سمیر کی تاجور سے۔ باقی یہ تو اندازے ہیں حقیقت تو نگہت جی ہی جانتی ہیں۔ اتنے دلچسپ موڑ پہ آکر آئندہ ماہ لکھ دیتے ہیں پورا مہینہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ افسانوں میں حقیقت اچھا لگا۔

ج ثمینہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی، جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

سولہویں قسط

"لشنا روک رہے ہیں سب بی بی! انہیں 'مگر تم ہو کے رکنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔" تائی صابرہ نے ماہ نور کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ماہ نور باجی کو اسی طرح واپسی کی چڑھتی ہے۔" رضیہ جو کھاری والے غم کی گہرائیوں سے تازہ تازہ باہر نکلی تھی بغیر سوچے سمجھے بولی۔ "یاد نہیں آپ کو بی بی جی!" اس نے چودھرائن کو یاد دلایا۔ "پچھلی دفعہ بھی جب ماہ نور باجی کو اپنی مرضی کا باندر والا نہیں ملا تھا منگو کے میلے پر۔ یہ اسی طرح تیز و تیزی (جلدی جلدی) واپس چلی گئی تھیں۔"

"ہاں! کہتی تو تو ٹھیک ہے۔" چودھرائن نے دوپٹا سر پر جماتے ہوئے کہا "ہماری لاڈلی ہے نا بہت من موجی ہے' جو دل میں آیا کہہ دیا' جب موڈ خراب ہوا تو ضد کر کے اڑ گئی۔" انہوں نے پیار بھری نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماہ نور باجی کو اپنی مرضی کا باندر والا نہیں ملا تھا منگو کے میلے پر۔" ماہ نور تائی صابرہ کی بات نہیں سن رہی تھی۔ اس کا دھیان رضیہ کی کہی بات میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ "بندر والا' سائیں' کمہار' لوک میلہ کا گائیک' اسکیچز کا خریدار' ایک ہنستا مسکراتا' بولتا' کہتا چہرہ اس کی نظروں میں اپنی شبیہ جمائے بیٹھا تھا نہ اس کے ہٹائے ہٹتا تھا' نہ دھیان کسی اور چیز یا چہرے کی طرف ہونے دیتا تھا۔ یہ کیفیت کیا تھی' اس کی ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ کسی امتحان میں پڑ گئی تھی یا آزمائش سے گزر رہی تھی۔ ایک شخص کے من چاہا بن جانے کا جرم کر بیٹھی تھی' جو ان چاہے سراب کی اسیر ہو گئی تھی' جدھر دھیان کرتی تھی' وہی چہرہ نظر آتا تھا۔ باقی چہرے جیسے اپنی شناخت گنوا بیٹھے تھے۔

"میں تو کہتی ہوں بس دو دن اور رک جا بیٹی! آج پچھلے پہر میں نے درس کی محفل کرانی ہے۔ نعت بھی ہو گی۔ گانا بجانا تو پورا سال کرتے ہیں۔ ایک شام اس کا ذکر سن لیں گے تو باقی کی شامیں اچھی گزر جائیں گی۔" تائی صابرہ نے ایک بار پھر ماہ نور کو مخاطب کیا۔

"نسرین۔۔۔ نی جندو! مولوی کی بی بی کو پیغام دے دیا ہے کہ نہیں؟"

وہ خیال آنے پر اپنی مصاحباؤں کو پکارنے لگیں۔ "کیا کہتی تھی' آئے گی کہ نہیں۔" وہ کسی سے پوچھ رہی تھیں۔

"اچھا! آئے گی۔" کسی کے جواب سے مطمئن ہوتے ہوئے وہ بولی تھیں۔ "اسے کہنا تھا' ٹائم پر پہنچ جائے۔" ایک ہدایت جاری کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "اور اسے بھی پیغام دینا ضرور' تو ئیں وہٹی (نئی دلہن) کو۔۔۔ اس کی ابھی تک روٹی بھی نہیں کی ہم نے۔"

"شادی پر چار دن اور چار راتیں دیگیں چڑھتی رہی تھیں۔ پورا پنڈ روٹی کھاتا رہا تو کیا اس نے نہیں کھائی ہو گی روٹی۔" جواب الگ سے روٹی کرنی ہے آپ نے شہزادی کی۔ رضیہ نے منہ بنا کر کہا۔

"نی تو تو کام دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہے۔" تائی صابرہ نے غصے سے رضیہ کو ڈانٹا۔ "چل اٹھ جا کر جو چاندنیاں منگوائی ہیں علی پور سے باجی مریم کے گھر سے' وہ صاف ستھری ہیں نا' باجی مریم بھی بڑی اللہ والی بندی ہے۔ ابھی تو ان چاندنیوں کے پیکٹ بھی نہیں کھلے تھے کہ انہوں نے مجھے بھیج دیں۔ میں نے بھی چوہدری صاحب سے کہہ دیا ہے کہ میں نے چاندنیاں نہیں واپس بھیجنی' ڈبل رقم بھیج دیں باجی مریم کو۔ وہ خود ہی نئی خرید لیں گی۔"

تائی صابرہ کی گفتگو کے دوران ان کی ملازماؤں کی آمد و رفت جاری تھی۔ صحن میں بڑی بڑی دیگیں دھوئی جا رہی تھیں۔ برتنوں کے آپس میں ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک ہنگامہ تھا جو بپا تھا۔ ماہ نور نے اس چہل پہل کے درمیان بیٹھے بیٹھے اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں ویرانی تھی اور خاموشی بھی۔

"سب کتنے خوش باش ہیں اور کتنے شاد آباد۔" اس نے آنکھ میں اتری ہلکی سی نمی کو انگلی سے چھوتے ہوئے

سوچا۔

"چل شاباش! میری دھی رانی اپنا سامان ادھر ہی منگوا لے۔ آج میلاد شریف دیکھ کے کل سویرے ٹھنڈے ٹائم نکل جانا۔" تائی صابرہ نے ایک بار پھر اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"کل صبح تک تو میرے اور اس کے درمیان نہ جانے اور کتنے پل' کتنے گھنٹے' کتنے دن اور کتنے کوس حائل ہو جائیں گے۔" اس نے دل میں جواب دیا۔ ابراہیم نے کوئی اطلاع دی۔ نہ ہی اس کا اپنا نمبر آن ہوا۔ "اب کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

"نہ آپ آئے نہ بھیجی پتیاں۔"

کانوں سے آواز ٹکرائی۔

"سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں۔"

کسی نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"اوکھے پینڈے لمیاں نیں راہواں عشق دیاں۔"

کہیں دور کوئی اکتارہ بجاتا گا رہا تھا۔

"یار ڈاہڈی عشق آتش لائی ہے۔"

کسی آواز نے الفاظ بدل کر گانا شروع کیا۔

"ہو یار سانوں لگ گئی بے اختیاری۔

سینے دے وچ نہ سمائی ہے۔"

بار ہا سنے ہوئے لفظوں کا مفہوم اچانک سمجھ آنے لگا تھا۔ کیفیت خود پر گزر رہی تھی اور لفظوں میں چھپے پیغام ڈی کوڈ ہونے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں اب چلتا ہوں۔" خالی کا کپ میز پر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"اس وقت' کہاں جاؤ گے؟" جواب میں سوال آیا۔

"گھر جانا ہے کیا؟" دوسرا سوال وارد ہوا۔

"گھر۔" وہ مسکرایا۔ "آپ کو پتا ہے ہمیں اپنی ملکیت میں کچھ گھر ہوتے ہوئے بھی' اپنے پاس دو مختلف ملکوں کی دہری شخصیت رکھتے ہوئے بھی' اپنے پاس دنیا کے کئی ملکوں میں جا سکنے کا اختیار رکھتے ہوئے بھی' اس پوری کائنات میں جلاوطن ہوں۔"

"بھٹکتے رہو گے' جو یوں ہی خود پر خود ساختہ جلاوطنی طاری رکھتے رہے۔ ایک عمر چلتے رہو گے' گھر نہیں آئے گا۔ منزل پر پہنچ کر بھی منزل کو پہچان نہیں پاؤ گے۔ کیونکہ تمہارے پاس نہ تو راستوں کا کوئی نقشہ ہے۔ نہ ہی نشان منزل کی کچھ خبر۔" اس کی میزبان نے کافی کی خالی پیالی میں نقرئی چمچ چلاتے ہوئے جواب دیا۔

"جانتا ہوں' بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا "مگر بے بس ہوں' بے اختیار ہوں۔ کلیو بے شمار ہیں۔ معمے کا صفحہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ اور کاغذ اتنا خستہ ہے کہ ہاتھ لگانے سے مزید پھٹتا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میزبان مسکرائی۔ "حقیقت کا سامنا کرنا چاہتے بھی ہو اور اس کے عریاں ہو کر سامنے آنے پر آنکھیں میچ لیتے ہو۔"

"کیونکہ آنکھیں کھلی رکھ کر دیکھنے سے تاش کا وہ محل جس کے فرش پر میرے قدم جمے ہیں' اکھڑ کر ہوا میں بکھر جانے کا خطرہ ہے۔ فاؤنڈیشن مائی ڈیئر میم!" اس نے میزبان کی طرف دیکھا۔ "بنیاد اکھڑ جائے تو انسان بے شناخت ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر ڈٹے رہو' تاش کے محل میں جس کے تم کراؤن پرنس ہو۔ کیوں بلاوجہ اس کھوج میں جاتے ہو کہ جو رائل بلڈ تمہاری رگوں میں دوڑتا ہے' اس کا رنگ نیلا ہے یا سرخ۔"

"نیلے' سرخ کی پروا نہیں۔ سفید اور سیاہ سے ڈر لگتا ہے۔ جو ان میں سے کوئی رنگ نکل آیا تو مسئلہ بن جائے گا۔"

"مسئلوں سے ڈرتے ہو۔ مسئلہ تو میں بھی ہوں۔ مسئلہ تو تم بھی ہو۔" وہ گنگناتے ہوئے بولی۔

"یہ ہی تو سارا مسئلہ ہے کہ مسئلہ تو آپ بھی ہیں۔ مسئلہ تو وہ بھی ہیں اور مسئلہ تو میں بھی ہوں۔" وہ برجستہ بولا۔

اس کی میزبان کے چہرے پر لمحہ بھر کو ایک تاریک سایہ لہرایا اور اپنی نامحسوس چھب دکھا کر غائب ہو گیا۔

"اچھا! ایک بات تو بتائیں۔ پھر وہ اچانک بولا۔

"پوچھو! یہ اور بات ہے کہ اب مجھے تمہارا یہ سوال پھونک پھونک کر سننا چاہیے۔" اس نے صوفے کی پشت سے کمر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے جلے دودھ کا اور یجن ایک ہی ہے۔ میرے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی۔ لہٰذا چھاچھ بھی بغیر تفتیش و تسلی کے نہیں پینی۔ نہ میں نے۔۔۔ نہ آپ نے۔"

"وہ دودھ جس میں پانی زیادہ' دودھ کم ہو' جل بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایسے دودھ کا خریدار اس طرح بھی نقصان میں۔ یوں بھی نقصان میں۔" میزبان کا لہجہ زہر خند ہو گیا۔

"یہ ہی تو آپ کی غلط فہمی ہے اور اس غلط فہمی کا شکار لوگ بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کا سب سے بڑا نقصان بھی کر ڈالتے ہیں۔"

"نقصان تو جو ہونے تھے' ہو چکے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ لکیر کیسے پیٹی جاتی ہے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

"بس تو پھر یوں سمجھیے میم! کہ میں دوبارہ سے آپ کو لکیر پیٹنا سکھانا چاہتا ہوں۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"کیا فائدہ۔۔۔ سانپ تو کبھی کا نکل چکا۔"

"سنپولیا پیچھے چھوڑ گیا بھولا سانپ۔۔۔ سنپولیا نہیں' بلکہ سنپولیے۔۔۔ آپ انہیں ہی پیٹ کر دل کا کچھ غبار کم کر لیجیے گا۔"

"رہنے دو۔ وہ جو ایک کیفیت ہوتی ہے نا! جس کا نام ہے بے حسی' وہ دل و جاں سے میرے ہاں بسیرا کر چکی ہے۔ لہٰذا یہ مار اپیٹی' اور اکھیڑ اکھاڑی چاہے ان مُردوں کی ہو' جو کب کے گڑ چکے' ان کا ذکر سن کر بھی کوئی خاص ولولہ دل میں نہیں اٹھتا۔"

"آپ کی یہ بے حسی سانپ کے لیے نعمت ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اپنا پھن اٹھائے مزید اکڑ کر چلتا ہو گا۔ آپ جیسے لوگ' جو نہ سانپ کا پھن کچلنے کے قائل ہیں۔ نہ ہی لکیر پیٹنے کے۔" اب کے وہ نیچی آواز میں بولا۔

"جانے دو' اس طرح کی گفتگو بھی لکیر پیٹنے ہی کی مترادف ہے' تمہیں کچھ پوچھنا تھا' کیا وہ نہیں پوچھو گے؟"

"ہاں لو۔" وہ لمبا سانس لینے کے بعد بولا۔ "کیا آپ مجھے اپنا وہ اسٹوڈیو ایک مرتبہ پھر دیکھنے کی اجازت دے سکتی ہیں' جو پہلے میں نے دیکھ رکھا ہے؟"

"کیا کرو گے دوبارہ دیکھ کر؟ وہاں کیا رکھا ہے دیکھنے کو؟" وہ تھوڑے توقف کے بعد بولی۔

"آپ اس اسٹوڈیو کے بارے میں خاصی بے نیاز ہیں۔ جبکہ میرا یہ معاملہ ہے کہ ایک بار دیکھا ہے۔ دوبارہ

بلکہ بار بار دیکھنے کی ہوس ہے' والی صورت حال میں ہوں۔"

"اچھا؟" رکو میں آتی ہوں۔" وہ اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

"یہ اس کی چابی ہے۔" تھوڑی دیر بعد واپس آ کر اس نے ایک چابی اس کی طرف بڑھائی۔ "راستے سے تم واقف ہو' خود ہی چلے جاؤ اور دیکھتے رہو' جب تک دیکھنا چاہتے ہو۔"

"آپ نہیں چلیں گی میرے ساتھ؟" سعد نے اس کی ہتھیلی پر رکھی چابی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ہتھیلی پر دھری چابی اٹھائی اور پاؤں میں چپل پہن کر کھڑا ہو گیا۔ "میں آپ کی اجازت سے جا رہا ہوں وہاں' ہے نا؟"

"ہاں بالکل۔" میزبان نے جواب دیا۔

☼ ☼ ☼
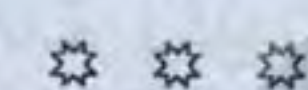
"کمال ضبط کی اس اسٹیج کا نام کیا ہو سکتا ہے' جس سے میں اس وقت گزر رہا ہوں۔" بلال سلطان نے اپنے سامنے رکھی فائلز کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"جو بھی نام ہے اور جو بھی اسٹیج ہے' میرے جیسے شخص کا شاید یہ ہی علاج ہے۔" انہوں نے سنہری فریم کا قیمتی چشمہ آنکھوں سے اتارنے کے بعد آنکھوں کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے مسلا۔

"کیا وہ کوئی خزانہ ہے' جس کے چوری ہو جانے یا گم ہو جانے کا خدشہ ہے؟" انہوں نے اپنے سامنے پھیلی دیوار کی طرف دیکھا۔ "اس میں کسی غفلت کے سبب کمی آ جانے کا ڈر ہے۔"

"شاید ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔"۔ انہوں نے خود ہی فیصلہ دیتے ہوئے سوچا۔ "حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس پوری دنیا میں شاید وہی ہے' جس سے میں نے صحیح معنوں میں دل لگایا ہے۔"

To the world you are one of many
To me you are all the world

انہوں نے اپنے سامنے رکھی فائلوں میں سے ایک میں جڑے پہلے صفحے پر قلم سے سنہری الفاظ لکھے۔

"اور ٹریجڈی نہیں' بلکہ کامیڈی یہ ہے کہ وہ میری اس کیفیت سے' بخوبی آگاہ ہے۔ اسی لیے میرے ساتھ ایک عرصے سے لکن مٹی' چھپن چھپائی' ہائیڈ اینڈ سیک یعنی ایک ہی کھیل مختلف زبانوں میں کھیل رہا ہے۔" انہوں نے اپنے لکھے الفاظ کے نیچے بے دھیانی میں لائنیں کھینچتے ہوئے سوچا۔

"لیکن وہ ایک پیشہ ورانہ ذمہ دار شخص ہے' اور۔۔۔ پیشہ ورانہ ذمہ دار شخص جیسے الفاظ کی حقیقی تصویر ہے۔"

پھر انہوں نے مزید الفاظ اس کاغذ پر نوٹ کیے۔ "اور یہ ہی وہ حقیقت ہے' جس نے مجھے کل سے اب تک بے چین کر رکھا ہے۔ اسے پرسوں تک اس شہر میں اور کل صبح اس دفتر میں پہنچ۔۔۔ جانا چاہیے تھا۔ اس نے اب تک اپنی پروفیشنل ذمہ داریوں سے جان نہیں چھڑائی۔ کون سا کام کس دن' کتنے بج کر کتنے منٹ پر سرانجام دینا ہے' وہ اپنے حساب کتاب میں کبھی کمزور نہیں پڑا۔ اس دفتر میں ۔۔۔ کام کرنے والے کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسا شخص ہے' جسے دیکھ کر گھڑی کی سوئیاں درست کی جا سکتی ہیں۔ پھر اب تک وہ کہاں ہے؟" انہوں نے بے چینی سے دائیں بائیں دیکھا اور اپنا فون اٹھا کر کال ملانے میں مصروف ہوئے۔

"ہاں! کیا پتا چلا؟" دوسری طرف سے کال وصول کیے جانے پر انہوں نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

"گاڑی بلیو ایریا میں کھڑی ہے' ساجد نے بتایا ہے۔" دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔

"مائیلیج کتنی ہے؟"
"چیک نہیں کیا سر!"
"ہوں!" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' بس اتنا کافی ہے۔ اب تم لوگ اپنا اپنا کام کرو۔" انہوں نے فون بند کردیا۔
"اس کا مطلب ہے کہ تم کہیں قریب ہی موجود ہو۔ مگر نظروں سے دور ہو۔"
انہوں نے اپنے سامنے موجود کاغذ پر مزید الفاظ رقم کرتے ہوئے لکھا۔ ان کے سینے میں بے چینی سے دھڑکتے دل کو قدرے سکون حاصل ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆
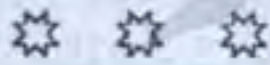
مولوی سراج سرفراز نے تسبیح کے دانے گراتے گراتے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھی رابعہ بی بی پر ڈالی' جن کا دھیان کمرے میں موجود کسی چیز کی جانب نہیں تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔
"سعدیہ کی جدائی نے رابعہ بی بی کی صحت پر خاصا اثر کر ڈالا۔" مولوی صاحب کے ذہن میں خیال آیا۔ "نہ کوئی رنگ روپ رہا ہے۔ نہ صحت باقی ہے۔ عجیب ہی ہوتی ہیں یہ بیبیاں بھی۔ ایک فرض بحسن و خوبی پورا ہو گیا۔ یوں کہ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آیا۔ پھر بھی پریشان حال بیٹھی ہیں۔ کیسی ناشکری ہے' کتنی بے وجہ کی بے اطمینانی ہے۔ دوسری طرف سعدیہ ہے۔ میں ابھی کل ہی تو اس سے مل کر آیا ہوں۔ اس کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ ایسی بھولی ہے اپنی خوشیوں میں مگن ہو کر کہ واپس ادھر پل بھر کی ملاقات کو آنے کو جی نہیں چاہا بھی اس کا۔"
کسی بھی قسم کے تفکر سے آزاد مولوی صاحب نہ جانے کس اسم کا ورد جاری رکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔
"آج تو لگتا ہے۔ گھر میں کچھ پکا بھی نہیں۔۔۔ آج کیا' کئی دن سے کچھ نہیں پکا۔ جس روز سے فارم ہاؤس سے واپسی ہوئی ہے۔ گھی میں ملی شکر یا پھر دہی کے ساتھ ہی روٹی کھانے کو ملتی ہے۔ بہت ہوا تو دہی میں پودینہ پیس کر ڈال لیا۔ سعدیہ نے تو چند ہی دن کھانا بنایا تھا۔ ورنہ رابعہ بی بی ہی کھانا بناتی تھیں۔ سادگی اور غنا کی قائل تو سدا سے تھیں۔ مگر ایسا فقیرانہ انداز پہلے کبھی نہ تھا۔ بھلا ہو قائم دین کا' جو کہتا ہے۔ "مولوی جی! پیشی اور دیگر (ظہر اور عصر) کے درمیانی وقفے میں صرف کھانا کھانے کے لیے گھر جانے کی ضرورت نہیں۔ اتنا لمبا راستہ۔ بھری دھوپ میں چل کر کہاں جائیں گے۔ ہم آپ کو کھانا یہیں مسجد میں پہنچا دیا کریں گے۔" سو شکر کہ دوپہر کی روٹی ڈھنگ سے ملنے لگی ہے دو دن سے۔ آج بھی کیا بھون کر تیار کیا تھا مرغ کا قورمہ۔ قائم دین کی گھر والی نے۔ مرغ کا پٹ (ٹانگ) کیا پر خور تھا' جسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ صحت مند جانور ذبح کیا تھا قائم دین نے۔ کیا لال شوربا تھا تری (چکنائی) والا سبحان اللہ! سواد آگیا تھا۔ چلو! کم سے کم دوپہر کی روٹی میں تو شکر گھی اور چٹنی سے نجات ملی۔"
وہ دانے پر دانہ گراتے سوچ رہے تھے اور سوچ کا بہاؤ بے کنار تھا۔ کبھی کسی جانب بہنے لگتا۔ کبھی کسی دوسری جانب۔
"نکھاری لوٹ کر آیا۔ نہ کچھ خیر خبر لایا۔" دوسری طرف آپا رابعہ اپنی سوچ میں گم تھیں۔
"اور ایک میں ہوں کہ گرم توے پر بیٹھی مانو جل جل کر راکھ ہو رہی ہوں۔ اس گھر اور فارم ہاؤس کا فاصلہ کتنا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ بھاگتے قدموں سے جاؤں اور وہ من موہنا چہرہ دوبارہ دیکھوں۔ جس کے دیکھنے سے دل کو سکون ملتا ہے اور کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ بے اختیار دل کرتا ہے کہ اسے سینے سے لگالوں۔ وہ سراپا جو تمکنت اور وقار سے چلتا پھرتا' اٹھتا بیٹھتا ہے' وہ چہرہ چوم لوں' جس پر نرمی چھائی ہے اور جب وہ ۔۔۔ مسکراتا ہے تو چاروں طرف سکون بکھر

جاتا ہے۔ اس لہجے اور آواز کے قربان جاؤں۔ جو ہوا کے دوش پر ابھرتی ہے تو اس میں نرمی محسوس ہوتی ہے' عروج محسوس ہوتا ہے' جس میں احترام ہے اور عاجزی بھی۔"

وہ ایک ٹک سامنے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

"مگر کیسے جاؤں" انہوں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا "عمر اور رتبہ آڑے آتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اور پھر ادھر سے بے نیازی کا بھی خدشا ہے۔ منع کر دیے جانے کا خوف بھی ہے۔ وہ کہہ دے۔ "میں تو وہ نہیں جس کو تم تلاش کرتی پھرتی ہو۔" تو کیا ہوگا۔ امید یاس میں بدل جائے تو کیسا لگتا ہے' دل اس احساس کو محسوس کرنے سے خائف ہے۔ مگر اے کاش اے کاش۔"

"یا اللہ!" انہوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

"برسوں گزر گئے۔ میری دعاؤں میں کوئی دنیاوی خواہش شدت سے تو کیا' معمول بن کر بھی نہیں اتری۔ جب بھی اور جتنا بھی مانگا' اس کا تعلق دنیا سے نہیں۔ آخرت سے رہا۔ مگر آج تیری یہ گناہ گار' حقیر بندی تجھ سے دنیا کی ایک نعمت کی دعا کر رہی ہے اور اتنی شدت سے کر رہی ہے کہ ایسی شدت کبھی آخرت سنور جانے کی دعا میں بھی نہ آئی ہوگی۔ میرا دل جانتا ہے کہ شدت کے اس فرق کی وجہ سے آج مجھ پر بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ظاہر ہو گیا۔۔۔ ہوں نا میں کھوٹے دل کی' بدنیت' عام سی انسان۔ اتنے برس اپنے تئیں دنیا نہیں' آخرت مانگتی رہی اور اس نعمت کی جھلک دیکھتے ہی ہاتھ اٹھا کر دنیا دنیا پر اتر آئی۔ نفس خواہش کرنے لگا۔ ہمک ہمک کر دل پکارنا شروع ہو گیا کہ مجھے یہ عطا کر دے۔ میری تمنا پوری کر دے۔ جانتی ہوں تو نے دنیا کی یہ نعمت' آزمائش' میں شمار کر دی ہے' پھر بھی آزمائش میں پڑنا چاہتی ہوں۔ میرے اللہ! عطا کر دے' عطا کر دے' میری التجا قبول کر لے۔ میری منتظر نظروں کا انتظار ختم کر دے۔ میں پل پل گھر کی دہلیز دیکھتی ہوں۔ کب کھاری کی آواز آئے اور وہ قدم اس گھر کی دہلیز پر نظر آئیں۔ میرے اللہ! مجھے انتظار کی اس جان لیوا کیفیت سے نکال لے۔"

"لو اب یہ بیٹھے بیٹھے رونے لگیں۔" مولوی سراج نے رابعہ بی بی پر دس منٹ کے وقفے کے بعد نظر ڈالی۔

"آپا جی کہا کرتی تھیں۔ رابعہ تو پلک متی ہے' پلک متی۔ مجھے تو بڑی دیر تک اس لفظ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پھر آپا جی نے ہی بتایا' یہ جو بات بے بات آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے ان کو پلک متی کا خطاب دے رکھا ہے۔ عمر جوں جوں بڑھتی جا رہی ہے توں توں یہ عادت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ بیٹھے بٹھائے نامعلوم اسباب کے نتیجے میں آنسو بہے چلے جاتے ہیں۔"

مولوی سراج نے سوچا اور ماحول پر چھائی طویل یکسانیت سے اکتا کر سفید رومال اٹھایا اور سلیقے سے سر پر باندھنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ایک نظر رابعہ بی بی پر ڈالی۔ وہ اس طرح ایک ٹک خلا میں دیکھتے ہوئے آنسو بہائے چلی جا رہی تھیں۔

"اوہ بھئی!" مولوی صاحب نے الجھ کر دائیں بائیں دیکھا اور جھلائے ہوئے انداز میں شانے پر رکھنے والا رومال زور سے جھاڑا۔

"عصر کا وقت ہو رہا ہے۔ میں چلتا ہوں۔" انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے اعلان کیا۔ وہ جانتے تھے' یہ محض ایک رسم تھی' جو وہ نبھا رہے تھے' اس اعلان کو جن کانوں تک پہنچنا تھا۔ وہ یکسر بے نیاز تھے۔

"دروازہ بند کر لینا بھئی' دروازہ کھلا رہے تو میدان میں کھیلتے بچے بے وجہ گھستے نکلتے رہتے ہیں۔" مولوی صاحب نے نکلتے نکلتے ایک اور اعلان کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر آگے چل دیے۔

"اور ہاں!" کچھ یاد آنے پر انہوں نے مڑ کر دیکھا "چوہدری صاحب کے گھر سے محفل کا جو پیغام آیا تھا' اس کا کیا جواب دیا؟"

"ہوں؟" یوں براہ راست دیکھے اور مخاطب کیے جانے پر رابعہ بی بی بھی خیالات کی رو سے چونک کر باہر نکلیں۔

"چوہدری صاحب کے گھر کا پیغام؟" مولوی صاحب نے بات دہرائی۔

"کھاری کو بتا دیا تھا۔" رابعہ بی بی نے ایسا مختصر جواب دیا۔ جس میں جواب کی صورت نہ تھی۔

"ہوں!" مولوی صاحب کچھ دیر وہیں رکے آپا رابعہ کو دیکھتے رہے "دروازہ بند کر لینا۔" انہوں نے ایک بار پھر تاکید کی اور باہر کی طرف چل دیے۔

"غریب کے گھر طمانیت اور سکون نام کا خزانہ ہو تو بھی کچھ لوٹے جانے کا خدشا ہوتا ہے مولوی صاحب! یہاں تو وہ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے' دروازہ کھلا رہے یا بند۔"

رابعہ بی بی نے دل میں کہا اور کمرے سے باہر نکل آئیں۔ لکڑی کا دو پٹ کا سادہ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ یہ دروازہ بے روغن تھا اور زمانے کے ہاتھ لگنے سے میلا ہو رہا تھا۔ اس کی کنڈی نیچے کو لٹکی ہوئی تھی۔ ایک کنڈی دروازے کے قدموں سے ذرا اوپر جڑی تھی۔ جس کو اس کی جگہ سے کبھی ہلایا بھی نہیں گیا تھا۔ وہ سانپ کی طرح کنڈلی مارے ایک کیل میں اتنی سالوں سے ساکن پڑی تھی اور گرد آلود ہو رہی تھی۔ کب اس دروازے کا کوئی ایک پٹ اس کے لیے کھلے گا' جس کی یہاں آمد کے انتظار میں میری آنکھیں روزن ہوئی جاتی ہیں۔" انہوں نے ایک بار پھر دروازے اور گھر کی دہلیز پر نظر ڈالی۔ اسی لمحے دروازے کا بایاں پٹ اندر کی طرف دھکیل کر کوئی باہر دروازے تک پہنچنے والے قدمچے پر کھڑا ہو گیا۔

"بھین جی! میں ہوں کھاری۔" باہر سے آواز آئی۔ رابعہ بی بی کے دل نے خوشی' شوق اور سرمستی کے عالم میں ایک کروٹ سی لی۔

"آجاؤ۔ آجاؤ کھاری!" انہوں نے بلند آواز میں کہا۔ اس دم انہیں آواز کے پردے کا بھی یکسر خیال نہ رہا تھا۔

"السلام علیکم بھین جی!" سفید شلوار قمیص اور سیاہ پشاوری چپل میں پہلے سے بالکل مختلف حلیہ بنائے وہ اندر داخل ہوا۔

"وعلیکم السلام!" کھاری کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھی ان کی نظریں ابھی دروازے پر ہی ٹکی تھیں۔

"بھین جی!" کھاری نے ان کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور شرمندہ سے لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔

"اوتے ٹر گئے ہیں (وہ تو چلے گئے ہیں)" اس نے نظریں نیچی رکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" آپا رابعہ کو اپنے دل میں جھکڑ سے اٹھتے محسوس ہوئے۔

"جدوں میں ادھر سے گیا۔ فارم ہاؤس میں جا کر پتا لگا کہ سعد باؤ تو واپس چلے ہیں۔" کھاری کا لہجہ ایسا تھا۔ جیسے سعد کے واپس چلے جانے میں سارا قصور اسی کا تھا۔

"پر کہاں چلا گیا وہ؟" آپا رابعہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"واپس اپنے گھر ہی گئے ہوں گے۔" کھاری نے خیال ظاہر کیا۔

"اس کا گھر کہاں ہے کھاری؟" آپا رابعہ نے کھاری کو جھنجوڑا۔

"اے تو مینوں پتا نئیں جی۔" کھاری بوکھلا کر بولا۔

"پتا کرو نا کھاری! مجھے اس کا نشان پتا لے دو کہیں سے۔ مجھے اس کا فون نمبر ہی پتا کروا دو۔" آپا رابعہ کا انداز ایسا تھا۔ جیسے وہ جو مانگ رہی ہیں' نہ ملا تو ان کی موت واقع ہو جائے گی۔

"آرام نال بھین جی! آرام نال۔" کھاری آپا رابعہ کے اس انداز پر مزید بوکھلا گیا۔

"میں ماہ نور باجی کی منت کروں گا۔ ان کا ترلا کر کے کسی طرح کوئی نام پتا لے آؤں گا۔ پر آپ خود کو سنبھالو۔" اس نے آپا رابعہ کے کانپتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"اب کی بار بھی وہ کھو گیا ناں کھاری تو پھر کبھی نہیں ملے گا۔" آپا رابعہ خلا میں گھورتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"جس نے ملنا ہوتا ہے بھین جی! اس واری گواچ کے بھی مل جاتا ہے۔ آپ فکر نہ کرو۔ ایک باری پتا چل گیا تو ہم اسے ڈھونڈ کے ہی دم لیں گے۔"

"میں سوچ رہی تھی بس آنکھوں کی سوئیاں باقی ہیں کھاری! مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ انتظار کی سوئیاں جا بجا لگی ہیں اور کوئی انہیں نکالنے والا نہیں۔" آپا رابعہ نے بدستور خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"میں ہوں بھین جی!" کھاری نے فوراً جواب دیا "آپ دیکھو گے بھین جی کھاری کا اس دنیا میں اپنا تو کچھ نہیں بننا۔ مگر آپ کا کچھ ضرور سنوار کے جائے گا۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے کھاری!" آپا رابعہ کو جیسے ایک دم ہوش آیا۔ وہ اپنی دھن میں اس لڑکے کو بھی کیسا جذباتی کر رہی تھیں۔

"اللہ تمہیں خوشیوں سے، دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازے، تمہارا اقبال بلند کرے۔" انہوں نے مخصوص دعاؤں کی بارش برسائی۔

"رہن دیو بھین جی!" کھاری ہلکا سا مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں مایوسی بھی تھی اور تمسخر بھی۔ "اس دنیا میں بندہ جو اوقات لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اسی اوقات پر تمام عمر گزار دیتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہوتا کھاری!" آپا رابعہ دفعتاً اپنی پریشانی بھول گئی تھیں۔ "وہ لوگ جو دنیا میں ترقی کرتے ہیں، اپنا مقام بناتے ہیں، نامور بن جاتے ہیں ان کے بارے میں نہیں سنا تم نے۔"

"پتا نہیں وہ لوگ کون ہوتے ہیں بھین جی! غریب بندہ تو اپنی شخصیت کے سوراخ ڈھانپتا ہی عمر گزار دیتا ہے جی۔" کھاری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

آپا رابعہ کی نظریں کھاری کے چہرے پر چھائی مایوسی کو ٹٹولنے لگیں۔ ابھی دو دن پہلے جب وہ آیا تو بہت خوش اور مطمئن لگ رہا تھا۔ دو دن کے اندر کیا ماجرا ہو گیا تھا۔

"اچھا جی! ہن میں چلتا ہوں۔" پھر وہ اچانک اٹھتے ہوئے بولا۔

"ٹھہرو کھاری!" آپا رابعہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا "کیا بات ہے تم اتنے ناخوش کیوں ہو؟"

"ناخوش کیا ہوندا اے جی؟" کھاری نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔

"یعنی تم خوش نہیں لگ رہے ہو۔" انہوں نے اس بات کو دوسرے الفاظ میں کہا۔

"خوش؟" کھاری نے سر جھٹک کر کہا۔ "چھڈو بھین جی! خوشی دی بات نہ کرو۔"

"اس کا مطلب ہے تم خوش نہیں ہو۔" رابعہ آپا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"سعدیہ نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟" انہوں نے سر اٹھا کر سوال کیا۔ جواب میں کھاری نے ان کی طرف دیکھ کر ایک بار آنکھیں بند کیں اور دوبارہ کھول کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"سعدیہ والا کام میری اوقات سے بڑا ہے۔"

"کیا مطلب؟" آپا رابعہ نے حیرت سے پوچھا۔ "تم دونوں تو ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے۔"

"میرے جیسے عاجزی پسند بندے کو غلط فہمی بہت جلدی ہو جاتی ہے بھین جی!" کھاری نے چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

"اوہ!" آپا رابعہ نے جیسے کچھ بھانپ لیا۔ "کیا کیا ہے سعدیہ نے؟"

"اس نے کچھ نہیں کیا بھین جی! میرے مقدر کی بات ہے۔" وہ کوئی بھی وضاحت دیے بغیر بولا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ ماہ نور باجی وڈی بی بی کے گھر آئی ہوئی ہیں۔ میں جا کر ان کا ترلا کرتا ہوں۔ کیا پتا وہ باؤ سعد کا نمبر یا پتا دے دیں۔" اس نے کہا اور ہاتھ چھڑا کر آپا رابعہ کی طرف دیکھے بغیر چل دیا۔

"ایک کے بعد ایک آزمائش ہے۔ ایک نہیں، کئی کئی آزمائشیں۔" کھاری کو دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر آپا رابعہ کو خیال آیا۔ "میں مطمئن تھی، سعدیہ کا بوجھ میرے سر سے اتر کر کسی اور کے سر پر جا پڑا۔ مگر اب یہ بے چارہ معصوم دکھی ہو کر کیا سا گیا ہے۔" انہوں نے پریشان ہوتے ہوئے سوچا۔

"سعدیہ پر جو سرکشی اور بغاوت کی لہر سوار تھی۔ وہ نشیب سمجھ کر کھاری کی جانب تو نہیں بہنے لگی؟" انہوں نے سوچا اور ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کمرے کی طرف مڑ گئیں۔ ان کے دل پر دھری بے چینی سوا ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس چھوٹے سے پارک میں موجود بچوں کا دل بہلانے کے لیے پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اچھل کود میں مصروف تھا ——— پارک میں بچوں کی تعداد کم تھی۔ ریسٹورنٹ میں لنچ کے لیے آنے والے زیادہ تر لوگ بھی دفتری اوقات کار میں کھانے کے وقفے کے دوران آنے والے باقاعدہ کسٹمر تھے۔ بچوں کے ساتھ تفریح کے لیے نکلنے والے شام ڈھلے گھر سے نکلتے تھے اور شام ڈھلے سے رات گئے تک اس ریسٹورنٹ اور پارک میں بہت رونق رہتی تھی۔

زیادہ تر بچے پارک کے شمالی کونے میں بنے چھوٹے سے سوئمنگ پول کے لیے یہاں آنے کی ضد کرتے تھے۔ پول کے ساتھ ہی ریسٹورنٹ کی انتظامیہ نے چھوٹا سا چڑیا گھر بھی بنا رکھا تھا، جس میں مختلف نسلوں کے خوش نما طوطے، چڑیاں، مور، بندر اور خرگوش وغیرہ بچوں کی دلچسپی کا باعث بنتے تھے۔ پارک میں مختلف طرح کے جھولے بھی لگے تھے۔ بچوں کے والدین بچوں کو پارک میں چھوڑ کر خود بے فکری سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ سکتے تھے۔

بچوں کے لیے جھولوں، پول اور چڑیا گھر کے علاوہ جیتا جاگتا بھاگتا دوڑتا وہ خرگوش سب سے بڑی دلچسپی کا باعث تھا، جو ان سے ان ہی کی زبان میں باتیں ——— کرتا تھا۔ ان کے پسندیدہ میوزک پر ان کے ساتھ ناچتا تھا اور مختلف کرتب بھی دکھاتا تھا۔

اس پارک کا یہ خرگوش یہاں آنے والے بچوں کا پکا دوست تھا۔ اکثر بچے اپنے ماں باپ سے رو رو کر یہ ضد بھی کیا کرتے تھے کہ انہیں خرگوش کو اپنے ساتھ گھر لے جانا تھا۔ لوگ مذاق مذاق میں خود اس سے اور ریسٹورنٹ انتظامیہ سے اس کی قیمت پوچھتے۔ اس کا اپنا جواب ہوتا، وہ بے مول تھا۔ لہٰذا اس کی خواہش کرنا حماقت تھی۔ جبکہ ریسٹورنٹ انتظامیہ کے لیے وہ قیمتی اور انمول تھا، جس کی وجہ سے سال کی تمام شاموں میں ان کا ریسٹورنٹ اور اوپن ایریا بار بی کیو سائیڈ گاہکوں سے بھر جاتی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ بچوں والی فیملی کی پہلی ترجیح بن چکا تھا۔

اس شام بھی وہ اپنی مخصوص اچھل کود، ناچ گانے میں مصروف تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی فراک پہنے، بالوں میں گلابی پونیاں ٹکائے، پاؤں میں گلابی سفید جوگرز پہنے وہ چھوٹی سی گپلو سی بچی اس شام پارک میں آنے والی پہلی بچی تھی۔ وہ جب سے آئی تھی، خرگوش کے ساتھ کھیل کود میں مشغول تھی۔

"You Are My Dear Bugs Bunny (تم میرے پیارے بگز بنی ہو)" اس نے اسے آتے ہی کہا اور اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔

"تم گاجریں کھاتے ہو یا نہیں؟" اس کے ماں باپ اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش میں ہار کر اندر ریسٹورنٹ میں چلے گئے تو وہ اس سے پوچھنے لگی۔ "تمہارے لمبے لمبے کانوں میں آواز زیادہ آتی ہوگی' ہے نا؟" "تمہارے دانت جو باہر کو نکلے ہوئے ہیں' ان کی مدد سے کیا تم چھوٹے بچوں کو کھاتے ہو... تمہارا گھر کہاں ہے' کیا تم نے اسی پارک میں کسی جگہ سوراخ کرکے زمین کے نیچے اپنا گھر بنا رکھا ہے... ؟تم سوتے کدھر ہو۔ تمہاری تو ٹانگیں اتنی لمبی ہیں کہ کسی بیڈ پر پورے ہی نہ آؤگے کبھی۔" وہ مسلسل سوال کررہی تھی اور ایک جھولے سے اتر کر دوسرے جھولے پر چڑھ رہی تھی۔ اس نے اس بچی کے تمام سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ساتھ کھیلتا بھی رہا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ اس کے پاس سے ہٹ کر دوسرے بچوں کی طرف متوجہ ہوتا وہ رونے اور چیخنے لگ جاتی۔

"تم میرے ہگز بنی ہو... تم صرف میرے دوست ہو۔" وہ چلا چلا کر کہتی اور بلند آواز میں رونے لگتی۔ مجبوراً اسے واپس اس کے قریب آکر کھڑے ہونا پڑتا۔

"کیا اس لڑکی نے تمہیں خرید لیا ہے؟" باقاعدہ آنے والے بچوں میں سے ایک دو نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ اس نے کسی دوسرے بچے کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس گلابی بچی میں کچھ ایسی بات ضرور تھی' جو وہ اس کی ضدوں سے تنگ آنے کے باوجود اس کی ہر ضد پوری کیے جارہا تھا۔

رات ساڑھے نو اور دس بجے کے درمیان بچی کے ماں باپ جب اسے پارک کے خرگوش سے واپس لینے کے لیے آئے تو انہوں نے دیکھا خرگوش نے بچی کو اٹھا کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا رکھا تھا اور وہ اس کے شانے پر سر رکھے مزے سے سو رہی تھی۔

"کم آن پری! گھر چل کر سوتے ہیں' اٹھ جاؤ شاباش۔" اس کی ماں نے اسے جگاتے ہوئے کہا تھا۔

"پری ڈارلنگ! چلو اب گھر چلتے ہیں جانو۔" باپ نے نرمی اور احتیاط سے اسے پارک کے خرگوش کی گود سے اپنی بانہوں میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"پری!" خرگوش زیر لب بڑبڑایا۔

"صاحب! اس کو روزانہ لے کر آنا۔ یہ بہت سویٹ ہے۔" اس نے بے اختیار کہا۔ بچی کے ماں' باپ اپنی بچی کے لیے اس توصیفی جملے پر مسکرا دیے۔

"ضرور۔" باپ نے سرہلایا اور جیب سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیے۔

"یہ تو پری ہے صاحب! اس سے میں پیسے کیسے لے سکتا ہوں؟" وہ بے اختیار بولا۔ مگر وہ "رکھ لو رکھ لو شاباش!" کہتے وہاں سے چلے گئے تھے۔

"پریوں سے لیتے نہیں' پریوں کو تو دیتے ہیں صاحب۔" ہاتھ میں پکڑے نوٹ کو دیکھتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑایا۔

☼ ☼ ☼
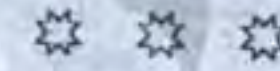
"میں تو نہیں سمجھتا کہ تمہاری زندگی کے حالات غیر فطری ہیں۔" ڈاکٹر رضا حسین نے نادیہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "غیر فطری ہوتے تو تم آج اس مقام پر نہ ہوتیں' جہاں کھڑی ہو کر مجھ سے مخاطب ہو۔"

"یہ اس رد عمل کا نتیجہ ہے' جو میں نے غیر فطری حالات پر اپنایا اور اس کی تقلید کی۔ منصوبے بنانا اور منصوبوں پر عمل کرنا تو انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہی ہے۔"

"چلو! فرض کرتے ہیں کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" ڈاکٹر رضا نے اپنی میز پر رکھی ایک کتاب کا ذرا سا اکھڑا ہوا کونا درست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن پھر اس سوال کا ممکنہ جواب کیا ہوگا کہ منصوبے بنانا تم نے کہاں سے سیکھا۔ ایک منفی عمل کا رد عمل مثبت ہو تو بھی یہ سوال تو ذہن میں آنا چاہیے تاکہ منفی عمل اور منفی سوچ کے درمیان رہنے والا شخص مثبت ہوا تو کیسے ہوا؟ تمہارے بقول تمہاری والدہ کی شخصیت منفی تھی۔ تمہارے والد کا قول و عمل تمہارے حق میں منفی ثابت ہوا۔ تمہارے بچپن سے لے کر اس وقت تک کے حالات' جب تم نے ان سے فرار حاصل کرنے کی ٹھانی' سب کا سب منفی تھا۔ پھر تم مزید منفی سوچ' سوچنے کے بجائے مثبت کیسے ہو گئیں؟ کچھ تو ایسا ہوگا تمہارے اردگرد جس نے تمہیں یہ مشورہ دیا کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے؟"

"انسان کے پاس اپنا دماغ بھی تو ہوتا ہے نا۔" نادیہ نے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یقیناً"... مگر دماغ تو اپنے اردگرد کہی سنی باتوں سے ہی نقوش لیتا ہے۔" ڈاکٹر رضا نے سرہلایا۔

"پھر..." نادیہ نے اپنی کرسی پر سیدھے ہوتے ہوئے اپنا کوٹ درست کیا۔ "آپ بتائیں کہ حقیقت کیا ہے' آپ وہ بتادیں جو آپ اس بات میں سے مجھے سمجھانا چاہتے ہیں۔"

ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "میں تمہیں خود کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ میں فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے سبق آپ پڑھو۔ زندگی کی کتاب میں کس سوال کا حل' کس صفحہ پر درج ہے۔ میں صرف صفحہ نمبر کی نشان دہی کرسکتا ہوں تمہارے لیے۔ باقی کا کام تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔"

"تو؟" نادیہ نے ابرو چڑھا کر سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"تو یہ کہ آج واپس جاکر غور کرنا کہ کیا تمہارے اردگرد کچھ ایسا تھا' جس نے تمہیں مثبت اور منفی میں تفریق کرنا سکھائی اور پھر تمہیں اپنا راستہ خود انتخاب کرنے کا شعور دیا؟ اگر اس سوال کا جواب سمجھ میں آجائے تو مجھے ضرور بتانا۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"ان چھوٹی چھوٹی گتھیوں کو سلجھاتے تو میرا یہ فارغ وقت یوں ہی گزر جائے گا۔" نادیہ نے شکوہ بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"چھوٹے چھوٹے قدم ہی نقطۂ آغاز ثابت ہوتے ہیں۔ ابتدا میں ہی بڑا قدم اٹھانے کی کوشش کروگی تو گر جاؤ گی۔" وہ ایک بار پھر نرمی سے مسکرا کر بولے۔ "یہ مت بھولنا کہ فن لینڈ سے انگلینڈ تک کی ہجرت تم نے یوں ہی نہیں کی۔"

"آپ کی باتیں بظاہر بالکل معمولی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتی وہ دراصل غیر معمولی ہیں... اور غیر معمولی ہونے کا یہ احساس ہی مجھے باور کراتا ہے کہ میں غلط جگہ پر نہیں آئی۔" نادیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"خود کو ابھی وقت دو۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پیپر ویٹ گھماتے ہوئے کہا۔ "فوراً" فیصلہ مت کرلو کہ کیا معمولی ہے' کیا غیر معمولی... اور یہ کہ تم درست جگہ پر آئی ہو یا غلط جگہ پر۔"

"چلیں... ٹھیک ہے۔" نادیہ نے سرہلا کر کہا۔ "جب سمجھ میں آجائے گا' دوبارہ حاضر ہوجاؤں گی۔"

"کسی مذہب کی تقلید کرنا مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ تب ہوتا ہے' جب انسان کو اپنے لیے خود فیصلہ کرنا پڑے کہ اگر وہ کسی عالمی ضابطہ حیات سے منسلک ہونا چاہتا ہے تو وہ ضابطہ حیات کون سا ہو۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو کسی ایک مذہب کی تقلید کرنے والے گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی کے زیر اثر پیدا شدہ ماحول میں پلتے بڑھتے ہیں۔ آنکھیں بند کرکے اسی ضابطہ حیات کے صحیح اور غلط اور رسومات پر عمل کرتے کرتے اپنی زندگی گزار کر دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ کارزار حیات کا کم از کم ایک پہلو تو ہوتا ہے' جس میں انہیں اپنے لیے فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مسئلہ تو میرے جیسے لوگوں کے لیے جنہیں اپنے لیے ایک ضابطہ حیات انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اور بدقسمتی سے' جو مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان زندگی گزارتے رہے ہوں۔ آنکھ بند کرکے

پرچی اٹھا لینے کا سا انتخاب تو یہ ہے نہیں۔ اس میں تو منتخب کرنے والے کی آنکھیں اور کان دونوں ہی کھلے ہونے چاہئیں۔ میں لندن میں ہوں۔ جہاں مجھے اذان کی آواز سن کر سر ڈھانپ لینے والے بھی ملتے ہیں۔ مندروں میں بجتی گھنٹیاں سن کر اشلوک پڑھنے والے بھی، ست سری اکال کرتے کیس اور کرپان کے مقلد بھی، اپنے مردوں کو کھلے میدان میں چیل کوؤں کا شکار بن جانے کے لیے چھوڑ دینے والے آتش پرست جین بھی، صلیب کا نشان سینوں پر بنا کر خدا کا کرم مانگنے والے عیسائی بھی۔ یہاں کیسری لبادے پہنے سر منڈوائے ممبو جمبو کرتے بودھ بھی اور داؤدی ستارے کو مقدس جاننے والے بھی ہیں اور وہ بھی ہیں جو کسی الہامی یا غیر الہامی مذہب یا نظریے کو سرے سے مانتے ہی نہیں۔ اب جہاں انتخاب کے لیے ترجیحات کا ایسا رنگا رنگ مجموعہ سامنے ہو۔ وہاں انسان کی آنکھیں کھلی نہ ہوں اور کان ٹھیک سے سنتے نہ ہوں تو کیا وہ اپنے لیے کوئی درست فیصلہ کر سکتا ہے؟" اس شام اس نے شیکھر کو ایک لمبی میل میں لکھا تھا۔

"فیصلہ تو تم کر چکی ہو نادیہ بلال! اب تو بس اس پر عمل در آمد کا مرحلہ در پیش ہے۔ لہٰذا مجھے تو ترجیحات کے رنگا رنگ مجموعے کی کہانی نہ سناؤ۔" شیکھر شاید اس وقت آن لائن تھا۔ جب ہی اس کا فوری جواب آگیا تھا۔

"میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" شیکھر کا جواب پڑھ کر نادیہ نے خود سے پوچھا تھا۔ "شاید ایسا ہی ہے۔" اسے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "جب ہی میں ڈاکٹر رضا حسین کے پاس پہنچی۔ کسی روی شنکر، کسی ویم اسمتھ، کسی ایز ہر مز ہوائے یا وکرم سنگھ کے پاس نہیں گئی۔" وہ سوچ کر خود ہی مسکرا دی۔

"سچ تو یہ ہے کہ شیکھر ٹھیک کہتا تھا۔ میرے لاشعور میں بیٹھے تعصبات مجھے کسی اور سمت رخ موڑنے دے ہی نہیں سکتے تھے۔"

☼ ☼ ☼

وہ سفید چاندنی پر گھٹنے موڑ کر بیٹھی تھی اور مبہوت ہو کر کھاری کی ساس کی آواز میں نعت سن رہی تھی۔ اس نے چند ہی محافل میلاد و ذکر میں شرکت کی تھی اور وہ محافل بھی بہت فیشن ایبل طبقہ اول کے گھروں پر ہونے والی محافل تھیں۔ جن میں محافل میں ہونے والے درس اور حمد و نعت پر کان دھرے جانے سے زیادہ حاضرین محفل کے لباس و انداز اور نشست و برخاست پر نظر دھری جاتی تھی۔ جوں ہی پروگرام کے تمام جز نپٹتے گویا زبانوں کے قفل کھل جاتے۔ باتیں، قہقہے، دوپٹے سروں سے اتار کر ہیر اسٹائلز کی نمائش، لباس و تزئین کو سراہے جانے کا عمل شروع ہو جاتا۔ مگر تائی صابرہ کے گھر میں ہونے والی محفل میلاد و ذکر میں سادگی تھی اور درس سنے جانے کے دوران لرز لرز کر اپنے گناہوں کی معافی کے لیے روتے ہوئے فریاد کرنے والیوں کی کمی نہ تھی۔

تائی صابرہ کے بہت اصرار پر بھی کھاری کی ساس نے درس نہیں دیا تھا۔ وہ ناسازیٔ طبع کا عذر کر کے ایک طرف ہی بیٹھی رہی تھیں۔ لیکن نعت گوئی کی محفل کے دوران تائی صابرہ نے ان کا کوئی عذر نہیں سنا تھا اور اب وہ حاضرین محفل کے درمیان بیٹھی آنکھیں بند کیے نعت گوئی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ نعت خواں کی آواز میں وہ کیا چیز ہوتی ہے، جو لفظ سیدھے دل پر اثر کر جاتے ہیں۔ دل میں سکون اترتا ہے اور اس عظیم ترین ہستی سے محبت میں سرشاری بھی عطا ہو جاتی ہے۔ آنسو آنکھوں سے خود بخود بہہ نکلتے ہیں۔

ماہ نور کو ایسا لگا جیسے ایسی صاف شفاف آواز اس نے شاید ہی کبھی سنی ہو۔ الفاظ کا بہاؤ تھا اور جذبات کا عقیدت کا رچاؤ۔ منہ سے لفظ موتیوں کی طرح جھڑ رہے تھے۔

اس نے نظریں گھماتے ہوئے اپنے ارد گرد بیٹھی ان پڑھ، سادہ، دیہاتی عورتوں کو دیکھا۔ ان سب پر بھی جیسے کھاری کی ساس کی آواز کا جادو طاری تھا۔ ان میں سے اکثر آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھیں۔ ان میں سے اکثر کو یہ

الفاظ سمجھ میں آرہے تھے یا نہیں۔ لیکن ان کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ یہ الفاظ اس ہستی کے لیے کہے جارہے ہیں۔ جس کی ناموس پر وہ خود بھی کٹ مرنے کو تیار ہو سکتی ہیں اور اپنے بھائی' بیٹے اور شوہر بھی کٹا سکتی تھیں۔

"شاید اس لیے اس کو عالم گیر مذہب کہا جاتا ہے۔" ماہ نور نے سوچا۔ "نہ اس کے لیے نسل کی کوئی اہمیت ہے' نہ رنگ کی' نہ جغرافیائی سرحدوں کی۔ بس عقیدہ ہے اور عقیدت ہے۔"

اسے لگا جیسے اس محفل میں بیٹھ کر خود اس پر بھی کئی دنوں سے چھائی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی تھی۔ عرق گلاب کا چھڑکاؤ' اس نے لمبا سانس لیتے ہوئے اس مخصوص خوشبو کو محسوس کیا۔

"یقیناً" خوشبوؤں کے اس استعمال کی کوئی منطقی روایتی اور تاریخی وجہ ہوگی۔ یوں ہی تو ایسے ہر ماحول میں ان کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ ان کا استعمال ماحول میں پاکیزگی کا ایک تاثر ابھارتا ہے اور دلوں اور ذہنوں کو ایک نفسیاتی سکون عطا کرتا ہے۔" اسے خیال آیا۔

"آج کی جدید دنیا اروما تھراپی کے ذریعے جو طریقہ علاج کا شور مچا رہی ہے' ہو سکتا ہے' اس کا اوریجن یہ ہی ہو۔" اسے یاد آیا۔

"میری پیاری بہنو! میں بالکل مختصر بات کرنا چاہوں گی۔" نعت خواں کی آواز بلند ہوئی۔ "اور وہ یہ کہ دنیا کی تمام دولتوں سے اوپر سب سے بڑی دولت وہ ہے' جو اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو عطا کر رکھی ہے اور جسے ہم باقی دنیاوی دولتوں کے حصول کی خاطر ہاتھوں سے گنوائے چلے جارہے ہیں۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

"میری بہنو! وہ دولت' سکون کی دولت ہے۔ لیکن دنیاوی چیزوں کی کشش کے پیچھے لگ کر ہم زندگی کی یہ سب سے بڑی دولت اپنے ہاتھوں سے ضائع کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے گھر سازو سامان سے بھر جاتے ہیں۔ ہمارے دسترخوان پر قسم ہا قسم کے کھانے چن جاتے ہیں۔ ہمارے بکسے نئے لباسوں سے بھر جاتے ہیں۔ فرشوں پر قالین' کھڑکیوں پر پردے' بستروں پر آرام دہ گدے۔ ہم اپنی نظر اور جسم کے لیے خوب صورتی اور آسانیاں خریدنے کے لیے جائز و ناجائز طریقوں سے اپنے بٹوے بھرتے ہیں اور بازاروں میں جا کر دکانوں پر کھڑے کھڑے خرچ کر دیتے ہیں۔ مرد ششماہی محنت کی کمائی فصل بیچ کر ہماری ہتھیلیوں پر رکھتے ہیں تو ہمارے من چاہے منصوبوں کی خریداری کی حد اس کمائی کی حد سے پہلے ہی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ مرد مقروض ہو جاتا ہے اور ہمارے دل کی حسرتیں اب بھی پوری نہیں ہوئی ہوتیں۔"

کھاری کی ساس بول رہی تھیں اور حاضرین میں بیٹھی خواتین' جن میں سے اکثریت کم پڑھی لکھی' بلکہ ان پڑھ' سیدھی سادی دیہاتی عورتیں تھیں۔ آنکھیں بند کیے "بے شک بے شک' سچ آکھیا جے" قسم کے الفاظ دہرا رہی تھیں۔

"ہم جس ہستی کی یاد میں یہ محفلیں سجاتے ہیں۔ اس ہستی کی تعلیم یہ نہیں تھی۔ میری بہنو! سادگی اور غنا' فقر اور توکل۔" کھاری کی ساس کی آنکھیں بھیگنے اور آواز بھرانے لگی۔ "چار نکات کا ایجنڈا۔" کانپتی آواز میں وہ بمشکل بولیں۔

"اور ہماری زندگیوں میں اس ہستی کا صرف ذکر باقی رہتا جاتا ہے۔ نکتے تو ایک ایک کر کے ہم نے اپنی خواہشوں کے ربڑوں سے مٹا دیے۔ ان کی مدح میں نعت کے لفظ وقتی تحسین' وقتی عقیدت ابھارتے ہیں' دل کی تسلی کی جاتی ہے' لو جی! ہم نے ذکر کر کے اپنے سیاہ کو سفید کر لیا۔ مگر کیا اس دربار میں ان کھو کھلی باتیں کرنے والوں کی شفاعت کی کوئی گنجائش بنے گی؟ کیا یہ سوال نہیں اٹھے گا کہ ہم نے تو سیدھا سادا سبق پڑھایا تھا۔ تمہیں

وہ بھی یاد نہ رہا۔ ہائے میری بہنو! میرے سوہنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت کی بی بیو! میری تم سے ہاتھ جوڑ کر درخواست ہے۔" انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر خواتین کے سامنے کیے۔

"ان سانپوں اور بچھوؤں کی خریداری میں' لپلپاتی آگ کو روشنی جان کر اس کے تعاقب میں اپنی اصلی' سچی دولت نہ گنوا دو۔ اپنے دل کے چین اور سکون کو اپنی مٹھیوں میں اس طرح بھینچے رکھو کہ خواہش کے رہزن اور نفس کے ڈاکو ان پر حملہ کر کے انہیں اڑا نہ لے جائیں۔ ان چار نکات کے ایجنڈے کو سمجھو۔ اس کے رنگ اور روشنائی کو پھیکے نہ پڑنے دینا میری بہنو! ایک وقت جلنے والا چولہا بھلا۔ ایک دھویا ایک پہنا لباس بھلا۔ دو کمروں کا سادہ گھر بھلا۔ اپنی ہانڈیوں کو نت نئے پکوانوں سے بھر دینے کے شوق میں' جسم کو ہر روز نئے لباس سے سجانے کی چاہ میں' سب سے بڑی دولت' اپنا بہترین خزانہ لٹانے سے بچو میری پیاری بہنو! میری آپ سب سے بس یہی ایک درخواست ہے اور ہاتھ جوڑ کر درخواست ہے۔"

بات ختم کرتے ہوئے ان کے آنسو تواتر سے بہنے لگے اور ان کے دونوں ہاتھ ایک بار پھر آپس میں جڑ کر ان کے سامنے تھے۔ محفل میں موجود خواتین نے الفاظ کی تاثیر میں کھو کر زارو قطار رونا شروع کر دیا تھا اور چند خواتین عقیدت کے مارے کھاری کی ساس کے ہاتھ چومنے میں مصروف تھیں۔ وہ "ہائے ہائے اور توبہ توبہ" کرتی اپنے ہاتھ چھڑا رہی تھیں۔ مگر خواتین تھیں کہ نہ ہاتھ چھوڑ رہی تھیں' نہ ان کی ٹانگیں' جن سے وہ لپٹی جارہی تھیں۔

"نی پیچھے ہٹو نی' مولوانی جی کو پنکھے کی ہوا لگنے دو' کیوں ان کے اوپر چڑھی مری جارہی ہو؟"

تائی صابرہ نے اٹھ کر شدت گریہ سے سرخ پڑتی ناک کو ہاتھ میں پکڑے رومال سے رگڑتے ہوئے کہا۔ کھاری کی ساس کی درخواست ان پر بھی اثر کر چکی تھی۔ ان کی آواز پر خواتین ذرا ذرا پیچھے کھسکیں' مگر اس طرح کہ پیچھے کھسکنے پر بھی کھاری کی ساس کے قریب ہی رہ سکیں۔

"نی رضیہ! نی سکینہ! چلو شربت پلاؤ پہلے سب کو اور باہر مردانے میں اطلاع کر دو' محفل ختم ہو گئی۔ روٹی کھول دیں' ادھر کھاری ہو گا باہر حویلی میں۔ اسے پیغام دو بس' باقی وہ خود ہی دیکھ لے گا۔"

وہ بلند آواز میں نہ جانے کس کس سے مخاطب تھیں۔ اپنا اعلان ختم کر کے واپس اونچے پیڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہ گھٹنوں کے درد کے باعث وہ فرش پر نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ ان کی نظر ایک کونے میں سمٹ سمٹا کر بیٹھی کھاری کی نئی نویلی دلہن پر پڑی۔

"ہا ہائے نی دھی رانی!" انہوں نے بے اختیار کہا۔ "تو ادھر ایک طرف الگ تھلگ کیوں بیٹھی ہے؟ چل ادھر آ' پنکھے تلے بیٹھ' آجا شاباش ادھر آ کر اپنی ماں کے پاس بیٹھ۔"

انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لڑکی کے ساتھ بیٹھی خاتون نے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

اوھر ادھر بیٹھی خواتین کے درمیان کی تنگ جگہ پر بمشکل پاؤں جماتی پہلے وہ تائی صابرہ کے پاس پہنچی۔ جنہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار دیا اور پھر ذرا تیز قدم رکھتے اپنی والدہ کے پاس پہنچی۔ کھاری کی ساس آنکھیں بند کیے درود پاک کے ورد میں مشغول تھیں۔

"اماں!" کھاری کی دلہن نے ماں کے گھٹنے پر سر رکھا اور رونے لگی۔ کھاری کی ساس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

"اماں! ساری عمر آپ کہاں تھیں؟" کھاری کی دلہن نے روتے روتے ان کا چہرہ پکڑ کر کہا۔ "مجھ سے بھی پردہ کیے رکھا آپ نے۔ میری نظروں سے بھی پوشیدہ رہیں خلقت کو جو سبق آپ نے آج پڑھایا' میری الف ب کے ساتھ مجھے کیوں نہیں پڑھایا اماں؟ ساری عمر آپ کہاں رہیں اماں؟"

کھاری کی دلہن کے یہ الفاظ اس محفل میں بیٹھی کسی عورت کی سمجھ میں نہ آئے تھے۔ وہ حیرت سے منہ کھولے، دانتوں میں انگلیاں دبائے، سرگوشیوں میں تبصرے کرتی، اس عمل پر ردعمل ظاہر کر رہی تھیں۔ مگر جو کچھ کھاری کی دلہن کہہ رہی تھی۔ اسے صرف وہ خود یا اس کی اماں ہی سمجھ سکتی تھیں۔ خلقت نہیں جان سکتی تھی کہ الفاظ کے بیان و اثر نے ماں اور بیٹی کے درمیان عمر کا فاصلہ کتنا کم کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
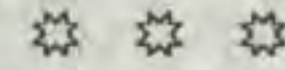
اس نے گرد آلود تاریک اسٹوڈیو میں بلب کا بٹن دبا کر اسے روشن کیا۔ بلب پر بھی یقیناً "گرد کی" ایک دبیز تہ موجود تھی، جب ہی اس کی روشنی کمرے میں موجود ہر چیز کو پوری طرح روشن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اس نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر کم روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا۔ اسے اس پینٹنگ کو ڈھونڈنا تھا۔ جس کا عنوان "midnight in heaven" تھا۔ طائرانہ نظر ڈالنے پر اسے وہ پینٹنگ نظر نہیں آئی۔ آگے بڑھ کر اس نے عین اس جگہ پر چیزوں کو الٹنا پلٹنا شروع کیا۔ جہاں وہ پینٹنگ پچھلی بار اسے دکھائی دی تھی "اوہ!" اس کے ہونٹ سکڑے۔ وہ پینٹنگ اپنی جگہ سے غائب تھی۔

"اس کا مطلب خاتون یہاں آتی رہتی ہیں۔" اس کے ذہن میں فوراً "خیال آیا۔

"ہو سکتا ہے یہ محض میرا خیال ہو، دیکھنا چاہیے مزید۔" اس نے کاٹھ کباڑ ہٹا ہٹا کر دیکھنا شروع کیا۔ مختلف چھوٹے چھوٹے اوزاروں، جو غالباً "مجسمہ سازی کے کام آتے ہوں گے۔ پھٹے پرانے کاغذوں اور اخبارات کے انباروں تلے اس کے ہاتھ نے ایک نرم کپڑے کو جا چھوا۔ ایک اونچی میز کے پیچھے چھپے اس کاٹھ کباڑ تک بلب کی روشنی تقریباً" نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے اٹکل پچو ہاتھ مار کر اس کپڑے کو دوبارہ چھونا چاہا۔ جس سے لمحہ بھر پہلے اس کا ہاتھ مس ہوا تھا۔

"اف..." اگلے لمحے اسے تڑپ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کا ہاتھ کسی تیز دھار چیز سے جا ٹکرایا تھا اور اس کے انگوٹھے کے نیچے کلائی اور ہتھیلی کے درمیان ایک لمبا کٹ آ چکا تھا۔ پتلا، سرخ خون تیزی سے بہنے لگا۔ اس نے کسی ایسی چیز کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھا جس کو بہنے والے خون کے منبع پر رکھا جا سکے۔ مگر وہاں موجود سب گرد آلود چیزوں میں سے کسی ایک کا بھی استعمال برا ثابت ہو سکتا تھا۔

زخم کی پروانہ کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر جھک کر وہیں ہاتھ ڈالا جہاں ہاتھ ڈالنے پر زخم آیا تھا۔ کپڑا اس کے ہاتھ میں آیا اور اسے محسوس ہوا کپڑے کے نیچے کوئی ٹھوس چیز موجود تھی۔ کپڑے کو ایک طرف ہٹانے کے بعد اس نے اندازے سے ہی اس ٹھوس چیز کو ہاتھ سے جانچنے کی کوشش کی۔

"شاید یہ کوئی ریلیف ہے۔" ہاتھ کے سگنلز نے اس کے ذہن میں خیال پیدا کیا۔ اس نے مضبوطی سے ہاتھ جمایا۔ وہ ٹھوس شے بازو پر زور ڈالنے سے ہاتھ کے شکنجے میں دبی اوپر اٹھ گئی۔

"ہوں۔" اس نے لمبا سانس لیتے ہوئے اس چیز کو میز کی سطح پر رکھا۔ مدھم بلب اس چیز کو روشن کر رہا تھا۔ یہ ایک سنگی سر تھا۔ سعد نے اس سنگی سر کا ہاتھ سے رخ موڑ کر اس کا چہرہ روشنی کی طرف کیا اور اس پر نظر پڑتے ہی دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"آہ۔" اس نے نہ جانے کس تکلیف کی شدت کے اثر میں آنکھیں بند کر لیں۔ ہتھیلی سے بہتا خون کلائی پر چلتا بازو تک پہنچ رہا تھا۔ خون کے ٹپکتے قطرے گرد آلود فرش پر بھی گر کر جم رہے تھے۔ یقیناً "یہ خون اس کے شکن آلود ٹراؤزر اور شرٹ پر بھی تجریدی نمونے ظاہر کر رہا تھا۔ مگر اس وقت شاید وہ کسی دوسری چیز کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میز کی سطح پر رکھا سنگی چہرہ اس کے ذہن سے باقی ہر احساس لے اڑا تھا۔ شاید اسے اس سنگی چہرے کے

نقوش، زخم سے زیادہ تکلیف دے رہے تھے۔ اس نے آنکھیں ایک بار کھولنے کے بعد دوبارہ میچیں اور پھر کھول کر اس چہرے کے خطوط دیکھنے لگا۔

"کیا مزید بھی کچھ دیکھنا باقی ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"نہیں۔" پھر اس نے خود ہی نفی میں سر ہلایا۔

"سوئے ہوئے محل کا ہر فرد جاگ چکا ہے، مجھ سمیت۔" اس نے نچلا ہونٹ عادتاً" دانتوں تلے دباتے ہوئے جیسے اس سنگی چہرے کو مخاطب کیا اور پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ "میرا لہو بھی اس چہرے پر نظر آنے لگا ہے۔"

اس کی نظریں اس چہرے کے اس حصے پر رک گئیں، جہاں اس کے ہاتھ کے نشان اُبھر آئے تھے۔ چہرے کے خطوط پر پڑی ہلکی گرد پر خون آلود ہاتھ کے نشان۔ وہ ایک بار پھر تکلیف کی شدت سے آنکھیں میچتا پیچھے مڑا۔ شاید اب وہ مزید اس کمرے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ پیچھے مڑ کر اس نے تیزی سے وہاں سے نکل جانا چاہا۔ نکلتے نکلتے اس کی نظر کھڑکی کے قریب الٹے پڑے ایک کینوس پر پڑی۔

اس نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھنے کی کوشش کی اور پھر آگے بڑھ کر اس الٹے کینوس کو سیدھا کیا۔ وہی پینٹنگ تھی۔ جس کی تلاش میں وہ اس کمرے تک آیا تھا۔

"midnight in heaven" نامی پینٹنگ پر زیادہ بالوں والے برش سے آڑے ترچھے، سیدھے الٹے رنگ پھیر دیے گئے تھے۔ رنگوں کی ان بے ترتیب لکیروں کے نیچے سے کہیں کہیں دردِزہ میں مبتلا بچہ جنتی اس عورت کا چہرہ نظر رہا تھا۔ جسے اپنے ذہن میں وہ ایک نام سے محفوظ کر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆
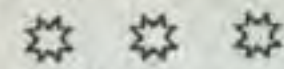
"کنوؤں میں بانس بھی ڈل گئے اور ویرانوں میں شکاری کتے بھی چھوڑ دیے گئے۔ پھر بھی ولی عہدِ سلطنت کا کچھ پتا نہیں چلا۔" رازی نے صوفے پر گر کر ہانپنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"سو؟" ضوفی نے ہاتھ میں پکڑا میگزین میز پر رکھتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ "اب بادشاہ سلامت کا نیا فرمان کیا ہے، منادی کرائی جائے یا پھر خفیہ والوں سے رابطہ کیا جائے؟"

"منادی کے جو ذرائع ہیں نا ضوفی! وہ بادشاہ سلامت کی کاروباری سلطنت کے لیے انتہائی برے ثابت ہو سکتے ہیں۔ منادی وہ رقم لے کر کریں گے اور چیدہ چیدہ منحوس خبریں کاروباری سلطنت کے بارے میں مفت نشر کریں گے۔"

"یہ تو ہے۔" ضوفی نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ "توڑتی خبریں یعنی بریکنگ نیوز کی مد میں جو کچھ ٹوٹے گا۔ باس اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، ہے نا؟" اس نے رازی کی طرف دیکھا۔

"یا اللہ! یہ کیسی نوکری ہے، جہاں کبھی گھر کا ساگ اور ٹنڈوں کا تسمہ بنانا پڑتا ہے اور کبھی ولی عہد سلطنت کی تلاش میں دشت و صحرا میں گھوڑے دوڑانے پڑتے ہیں۔" رازی نے ضوفی کی بات کا جواب دینے کے بجائے دونوں بازو ہوا میں بلند کر کے دہائی دی۔

"ضوفی! چلو بھاگ چلیں۔" پھر وہ پہلو بدل کر ضوفی سے مخاطب ہوا۔ "وہیں واپس دبئی چلیں، چل کر شیخ کے گھوڑوں کی نعلیں جوڑتے ہیں اور کتوں کو شیمپو کرتے ہیں، دوبارہ سے۔"

"اُفوہ رازی!" ضوفی نے اس کی تجویز کو ذرہ برابر بھی گھاس نہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اتنا ذرا سا پریشر نہیں برداشت کر سکتے، سارا سال عیش کرنے کے بدلے؟ سال کے آخر میں اگر تمہیں ٹویوٹا کمپنی کے ٹرک اور مرسڈیز کے

گھوڑے مارگلہ کے دشت اور گلیات کے کوہ ساروں میں دوڑانے پڑ گئے ہیں تو بس تمہارے والی بس ہو گئی اور تم دوبارہ سے اس درجہ "ب" کی نوکری کا سوچنے لگے 'جس کے عوض تمہیں رہنے کو اصطبل کا کمرا اور خرچنے کو چند سو در ہم ملتے تھے۔ تف ہے تم پر بھی رازی۔" اس نے سر جھٹکا اور دوبارہ سے میز پر رکھا میگزین اٹھالیا۔

"کاش! تمہیں ان کونوں کھدروں کی سیر کرنا پڑتی 'جہاں باس کے خیال میں اس کے سپوت کے پائے جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں تو میں تمہیں پوچھتا 'وہ درجہ "ب" کا اصطبل بہتر ہے یا یہ درجہ "الف" کی ایکسی؟" رازی نے اردگرد نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اوپر سے وہ توندیل وہ ابراہیم جو ہے 'جس کی ذہنی حالت پر مجھے پورا شک ہے۔ وہ صاف لگتا ہے 'ہمیں چکر دے رہا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے 'سعد سلطان کہاں چھپا بیٹھا ہے اور وہ ہمیں کبھی گوجر خان کے کسی بابا کے آستانے پر اور کبھی کسی رکی ماسٹر کے پاس لے جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ سعد سلطان ایسی ہی جگہوں پر جایا کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے 'صاف چکمہ دے رہا ہے۔ چاہے سعد سلطان اسی کے گھر کے کسی کونے کھدرے میں بیٹھا ہو۔"

"ایسا لگتا ہے تو اس کا بالکل سادہ علاج ہے۔ کسی وقت بغیر اطلاع کے جاؤ ھمکو اس کے گھر۔ اس سے بولو تمہارے گھر کا نیا انٹیریر چیک کرنا ہے۔ اس لیے گھر تو گھماؤ اپنا۔" ضوفی نے میگزین سے نظریں اٹھا کر مشورہ دیا۔

"چوہے پکڑنے کا پنجرہ نہ ہاتھ میں پکڑلوں ابراہیم کے گھر جانے سے پہلے۔" رازی نے جھلا کر کہا۔ "اور اسے بولوں 'مجھے گھر کا ہر کونا دکھاؤ۔ میں چوہے پکڑنے کا ماہر ہوں۔ انٹیریر دیکھنے کے ساتھ ساتھ تمہارے گھر سے سب چوہوں کا بھی صفایا کردوں گا۔"

"سب چوہوں کا نہیں 'صرف ایک بے مونچھ چوہے کا 'جو پانچ گھر سے نکلے چوہوں کا سردار ہے۔" ضوفی نے فی البدیہہ جواب دیا۔

"ہیں پانچ گھر سے نکلے چوہے؟" رازی نے احمقوں کی طرح ضوفی کی طرف دیکھا۔ "وہ کون ہیں؟"

"تم اور تمہاری کمزور معلومات عامہ۔" ضوفی نے سر جھٹکا۔ "تم نے پانچ چوہے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار والی نظم نہیں پڑھ رکھی نا؟"

"نہیں۔" رازی نے سر ہلایا۔

"بس پھر تمہیں کیسے سمجھ میں آئے کہ آخر میں 'جو اکیلا چوہا رہ جاتا ہے 'وہ شادی کرلیتا ہے۔ جس سے بربادی کی داستان مکمل ہو جاتی ہے۔" ضوفی ہنس رہی تھی۔

"اکیلا چوہا شادی کرلیتا ہے؟" رازی نے چونک کر کہا۔

"ہاں!" ضوفی نے سر ہلایا۔

"بس پھر اکیلا چوہا یعنی باس شادی کرلے گا آخر میں 'ہے نا؟" رازی کو خیال سوجھا۔

"باس۔" ضوفی زور سے ہنس دی۔ "وہ بے چارہ جو بیوی کے بغیر برسوں سے تنہا زندگی گزارتے گزارتے اس عمر کو آن پہنچا ہے کہ کنپٹیوں اور مونچھوں کے بال سفید ہونے کو آئے ہیں۔ بات کرو کوئی کرنے والی۔"

"تم کیا سمجھتی ہو باس کے یہ چند بال دھوپ میں سفید ہوئے ہیں کیا؟" رازی نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "مجرّد زندگی گزارنا بڑی ریاضت کا کام ہے ضوفشاں خانم! باس کو باس ہی سمجھو 'تارک الدنیا درویش نہیں۔"

"میں تو باس کو جو سمجھنا چاہتی ہوں 'سمجھ ہی لوں گی 'لیکن تم اپنی فکر کرو۔" ضوفی نے دیوار پر سجے کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم کو یاد دلادوں کہ رات کا نصف ہو چکا 'یعنی بارہ بج چکے ہیں اور اگلا دن آگیا۔ اگلا دن 'نئے کنویں 'نئے بانس 'یوسف ثانی خواہ بازار مصر میں بک رہا ہو 'تمہیں کنویں بہر حال کھنگالنے ہی پڑیں گے۔" وہ مسکرائی۔

"اوہ میرے خدا!" رازی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

ماہ نور نے اپنی ماں کی ٹانگوں سے لپٹی کھاری کی دلہن کو دلچسپی سے دیکھا۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح رو' رو کر ان سے پوچھ رہی تھی۔

"اماں! آپ کہاں تھیں اب تک؟ اماں! آپ مجھے ملیں کیوں نہیں؟"

محفل میں شریک خواتین کا خیال تھا کہ وہ شادی کے بعد ماں سے دور ہو جانے کی وجہ سے ایسا کر رہی تھی' جبکہ ماہ نور کا اپنا خیال تھا کہ اس کی اس بات کے پیچھے ضرور کوئی اہم راز چھپا تھا۔

"او کھاری' وے کھاری!" رضیہ نے والان کے دروازے پر کھڑے ہو کر تمسخر اڑانے کے سے انداز میں آواز لگائی۔ "بھاگ کے آ' تیری وہٹی بے ہوش چلی ہے۔" رضیہ کے انداز سے لگ رہا تھا' وہ تماشا بنانے کے موڈ میں تھی۔

"خاموش رہو رضیہ' کیا بے وقوفی ہے۔" ماہ نور نے تیزی سے اٹھ کر اسے ڈانٹا اور دروازے سے باہر کھڑے کھاری کی طرف دیکھا جو پریشانی کے عالم میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا کھاری! اسے' بس اپنی ماں کو دیکھ کر شاید جذباتی ہو گئی۔" ماہ نور نے نرمی سے سمجھایا۔

"ماہ نور باجی! میں اس لیے پریشان تھا کہ اس نوں ڈرامے بڑے اچھے لگدے نیں۔" کھاری نے بے چارگی سے کہا۔ "آٹھ بجے والا ڈرامہ وہ بڑے شوق سے دیکھتی ہے' مرزے رئیس کی گھر والی کے ساتھ بیٹھ کے تو مجھے وہم ہوا کہیں ڈرامے کا کوئی منظر تو نہیں ادھر دکھانے بیٹھ گئی۔" کھاری نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف ہو تم بھی' وہ کوئی پاگل ہے یا کم عقل ہے۔ اور وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ بغیر سوچے ایسے حرکت کرے۔" ماہ نور نے کھاری کو بھی ڈپٹا۔ "جاؤ تم وہ کرو جو تائی جی نے تمہیں کرنے کو کہا ہے۔"

ماہ نور کی بات سن کر کھاری وہاں سے ہٹ گیا۔ ماہ نور رضیہ کو گھورتی ہوئی واپس دالان میں آ گئی۔ کھاری کی ساس اب اپنے گھٹنے پر رکھے سعدیہ کے سر کو سہلا رہی تھیں۔ وہ خواتین کے درمیان جگہ بناتی ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"آپ کی بیٹی شاید آپ کے لیے اداس تھی۔" اس نے بھی نرمی سے سعدیہ کے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

جواب میں انہوں نے سر کو اثبات میں ہلایا۔

"کھاری بتا رہا تھا' آپ کو سعد سے کوئی کام تھا۔" ماہ نور نے سعدیہ کے شیمپو ہوئے بالوں کو بے دھیانی میں سلجھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" انہوں نے سر ہلایا۔ "میں نے کھاری سے کہا تھا کہ میں اس لڑکے سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتا دیں۔ آپ اس سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟" ماہ نور نے کہا۔

"بیٹا! بات بھی تو امانت ہوتی ہے نا۔" انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔ "اب مجھے کیا پتا کہ جو بات میں نے اس سے کہنی تھی' وہ تم سے کہنی چاہیے یا نہیں۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں' لیکن" ماہ نور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ کوئی اگر سعد کے لیے سنبھالی بات مجھ سے کر دے گا تو سعد کو برا نہیں لگے گا۔"

"تم اس کی۔۔۔" انہوں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس کی کوئی نہیں ہوں آنٹی۔" ماہ نور نے بمشکل مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن زبردستی کی یہ مسکراہٹ اس کی آنکھوں کو بھیگنے سے نہیں بچا پائی تھی۔

"مگر پھر بھی۔" اس نے انگوٹھوں کی پوروں سے اپنی آنکھوں کی نمی کو چنا۔ "وہ مجھ پر ٹرسٹ کرتا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "ٹرسٹ سمجھتی ہیں نا آپ؟" اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" وہ آہستہ سے سر ہلا کر بولیں۔ "میں سمجھتی ہوں۔" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "جس بھروسے کی بات تم کر رہی ہو' وہ کسی کسی ہی پر کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر آپ کا دل مانے کہ مجھ پر کیا جا سکتا ہے تو ضرور کیجیے گا۔"

ماہ نور نے کہا اور سر جھکا لیا۔ اس کا سعد سے تعلق اتنا بودا اور نامحسوس تھا کہ کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ سعد کے سلسلے میں اس پر اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ ایک نیا تکلیف دہ احساس اس کے اندر جاگا اور اسے لگنے لگا جیسے وہ دنیا کی سب سے مظلوم لڑکی تھی۔

"اگر دو گھڑی فرصت کا ٹائم ہو تو میرے غریب خانے پر آنا' میں تمہیں وہ بات سناؤں گی جو مجھے اس بچے سے کرنی تھی۔" کتنی دیر وہاں بیٹھے رہنے' کھانا کھانے اور خواتین سے مختلف موضوعات پر بات کرنے کے بعد واپس گھر جانے سے پہلے کھاری کی ساس نے اس کے قریب آ کر کہا تھا۔

وہ جو محفل کے فوراً" بعد واپس چلے جانے کا تہیہ کر بیٹھی تھی۔ سب خواتین کے جانے کے بعد بھی فرش پر بچھی چاندنیوں میں سے ایک پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔

تائی صابرہ نے آخری مہمان خاتون کو رخصت کرنے کے بعد دالان میں آ کر دیکھا۔ ہلکے سرمئی رنگ پر کاسنی پھولوں والے پرنٹ کی قمیص' سرمئی شلوار اور دوپٹے میں ملبوس' کسی طرح کے بھی میک اپ سے بے نیاز سر جھکائے گہری سوچ میں گم ماہ نور پر انہیں بے تحاشا پیار آ گیا۔ سر پر اوڑھا دوپٹا پنکھے کی ہوا سے سرک کر آدھے سر تک ڈھلک گیا تھا اور کیچو میں جکڑے بال تیز رفتار پنکھے کی ہوا سے ـــــ آزاد ہو کر اڑ رہے تھے۔

"چوہدری صاحب کو پیغام بھجواتی ہوں کہ گاڑی تیار کروا کر ادھر ہی بھیج دیں۔" انہوں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم دھیان سے کھانا کھالو' میں کھانا لگواتی ہوں' ادھر تو ان عورتوں نے خوب گند پھیلایا۔ بے چاری باجی مریم نے نئی نکور چاندنیاں بھیجی تھیں' لے کر بیڑا غرق کر دیا۔ دھوبی کے پاس بھیجنی پڑیں گی۔" انہوں نے ایک ہی سانس میں تین الگ الگ باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں تائی جی!" ماہ نور نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ "میں کل صبح چلی جاؤں گی' اب تو نکلتے نکلتے دیر ہو جائے گی۔"

"چلو' یہ تو اچھی بات ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ "آئے ہائے ماہ نور! تمہاری آنکھوں کے گرد تو سیاہ حلقے پڑ گئے پتر' رنگ بھی خراب ہو رہا ہے۔" "تمہاری ماں کیا کہے گی' میری بیٹی کا یہ حال کر کے بھیجا تائی نے۔ ایک تو ادھر گرمی زیادہ ہے۔ اُدھر فارم ہاؤس میں تو چوبیس گھنٹے اے سی چلتے ہیں۔ ادھر میں نے اے سی نہیں لگوائے' بیاری لکڑ کی چھتیں ہیں' مٹی کی چنائی دیواروں میں' کمرے یوں بھی ٹھنڈے رہتے ہیں' میں رات کو صحن میں سوتی ہوں پنکھا لگا کر' مجھے کمروں میں نیند نہیں آتی گرمیوں میں' اس لیے مجھے اے سی کی ضرورت ہے نہ عادت' اس کی ٹھنڈ میں تو میرے ہڈ پیر اکڑنے لگتے ہیں۔"

"مجھے بھی یہاں گرمی نہیں لگتی تائی جی! اور آپ کو وہم ہو رہا ہے کہ میری رنگت خراب ہو رہی ہے۔ میں ویسی ہی ہوں جیسی تب تھی' جب یہاں آئی تھی۔" ماہ نور نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

"تائی جی۔" "کھاری ادھر ہی ہے یا چلا گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"چلا گیا ہے۔ منیر بتا رہا تھا اسے بخار چڑھا ہوا تھا۔ جسم آگ بنا ہوا تھا۔ پھر بھی کیونکہ میں نے بلایا تھا آ گیا۔ منیر

کو لگا اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھ کر اسے واپس فارم ہاؤس بھجوا دیا۔"
"تائی جی! سردار چاچا کھاری کو کہاں سے لائے تھے۔ آپ کو انہوں نے کبھی بتایا۔" ماہ نور نے اگلا سوال ان کی طرف دیکھے بغیر پوچھا تھا۔
"کھاری کو۔" زندگی میں شاید پہلی مرتبہ ماہ نور نے تائی صابرہ کو نیچی آواز میں بولتے سنا۔ "کھاری کو وہ بسوں کے اڈے سے اٹھا کر لائے تھے۔"
"یہ تو سب ہی جانتے ہیں، مگر کیا سردار چاچا کو کھاری کے آگے پیچھے کا کچھ پتا نہ چلا۔"
"پتا چلا ہوتا تو بے چارہ غریب ادھر تیرے میرے ہاتھوں میں تو نہ پلتا، جو بھی، جیسی بھی اس کی ماں تھی اس کے ہاتھوں میں پلتا۔" تائی صابرہ نے کچھ یاد کرتے ہوئے سر ہلایا۔
"بس اتنی ہی کہانی ہے کھاری کی تائی جی؟" اس نے ٹٹولتی نظروں سے تائی صابرہ کو دیکھا۔
"مجھے تو اتنی ہی پتا ہے، باقی اللہ جی جانیں۔" تائی صابرہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولیں۔ "اب پتا نہیں یہ سب کہاں مر گئیں۔ بریانی میں سے بوٹیاں نکال نکال کر کھا رہی ہوں گی کم بختیں۔" وہ بولیں۔ "نی رضیہ، نی رانی" وہ آوازیں دیتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔
"سعد کو اگر کھاری کی کہانی میں کچھ چونکا دینے والی بات محسوس ہوئی تھی تو مجھے کیوں نہیں ہوئی اور اگر وہ اس ادھوری پینٹنگ کو دیکھ کر بھاگا تھا تو وہ پینٹنگ تو وہ اتنے دن سے دیکھ ہی رہا ہوگا۔ پھر اسی دن کیوں بھاگا۔" ماہ نور کا ذہن ایک بار پھر ممکنات پر غور کرنے لگا۔
اور "ابراہیم کے بقول اگر وہ واقعی اسلام آباد نہیں پہنچا تو پھر وہ کہاں گیا۔ اس کا نمبر ابھی تک کیوں بند ہے۔ میرے ساتھ تو چلو وہ یہ سب کچھ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ ابراہیم اور اپنے ڈیڈی کے ساتھ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔"
"تم نے مجھے کس مشکل صورت حال میں ڈال دیا سعد! میں کیسی بے فکری کی زندگی گزارتی تھی تم سے پہلے۔" اس نے تصور میں بیٹھی شبیہ کو مخاطب کیا۔ "تم سے پہلے اور تم سے بعد" میری کہانی اگر لکھی جائے تو اس کے صرف دو ہی باب ہوں گے اور دیکھو تو تم سے بعد کیا کیا نہیں ہوا۔"
وہ سوچنے پر آئی تو سوچ کے دھارے کہاں کہاں بہہ نکلے۔ "میرا سمسٹر ضائع ہو گیا، ابھی واپس جا کر مجھے ممی اور بابا کا سامنا کرنا ہے۔ میرے پاس نہ کوئی وجہ ہے، نہ دلیل، ممی مجھ سے اتنی ناراض ہیں کہ خود فون کرتی ہیں، نہ میرے فون کرنے پر ڈھنگ سے بات کرتی ہیں۔ بابا ناراض سی ٹون میں کہتے ہیں، تم نے برا کیا ماہ نور جو اپنی ممی کو ناراض کر دیا۔ سلمان کہتا ہے میں ہمیشہ سمسٹر مس کرنے کی خواہش کرتا تھا اور ممی کے خوف سے نہیں کر پاتا تھا۔ تم نے ممی کے خوف کی حد پار کر لی، تمہیں گولڈ میڈل ملنا چاہیے۔ شاہ بانو نے سمسٹر مکمل کر لیا۔ وہ اپنے کزن سے منگنی کروا چکی۔ وہ اپنی نانی کے پاس جرمنی جانے کی تیاریوں میں مگن ہے اور میں کہیں بھی نہیں کھڑی۔ میں تمہارے سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں بس، جانتی ہوں تم میری رسائی سے کتنی دور ہو۔ میری پہنچ سے باہر، پھر بھی میں ہوں کہ اس وقت کے انتظار میں سارے نقصان کیے جا رہی ہوں کہ ہاتھ بڑھاؤں اور تمہیں چھو لوں، کیا میں نہیں جانتی کہ تم بادل ہو، پانی نہیں جسے ہاتھ بڑھا کر چھونے کی تمنا صرف اونچائی پر جا کر ہی پوری ہوتی ہے اور بلندیوں پر میں نہیں سارہ خان رہتی ہے۔"
اس کی جلتی آنکھیں ایک مرتبہ پھر بھیگنے لگیں۔
"یہ ہے میری کہانی۔ "تمہارے بعد" سعد سلطان! میلے کا سائیں کہتا تھا۔ اس کی آواز میں سوز عشق نے پیدا کیا۔ نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا کہ کس کے عشق نے "ان پوچھا سوال" "ان کہے جواب" کا منتظر ہی رہے گا۔ سید پور فیسٹول کا سنگر کہتا تھا کہ اسے محبت وہاں ملی جہاں پر ملنے کی امید نہیں تھی۔ وہ جگہ کون سی تھی۔ محبت

جو ملی وہ کس کی محبت تھی۔ سوال بے انت ہیں۔ مگر جواب میں جامد خاموشی۔ میں کس سے پوچھوں اور کدھر کا رخ کروں۔ تم نے مجھے کس مشکل اور طویل راستے کا مسافر بنا دیا ہے۔ سعد، نہ راستہ چھوڑنے کو دل مانتا ہے، نہ منزل کا کوئی نشان ہے۔
اس نے سوتے جاگتے ذہن کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہتے ہوئے تھک کر اٹھ گئی۔
"رانی! تمہیں مولوی صاحب کے گھر کا راستہ آتا ہے؟" کمرے سے باہر نکل کر اس نے تائی صابرہ کی ایک خاص ملازمہ سے پوچھا۔
"مولوی صاحب، جو کھاری کا سوہرا ہے وہ۔" رانی نے برتن دھونا چھوڑ کر اس کی طرف رخ کیا۔
"ہاں وہی۔"
"آتا ہے راستہ، کیوں؟"
"مجھے ان کے گھر جانا ہے۔"
"اچھا جی!" رانی خوش ہوتے ہوئے بولی اور نل سے نکلتے پانی کی دھار کے نیچے ہاتھ دھونے لگی۔ ہاتھ دھو کر دوپٹے سے خشک کرنے کے بعد اس نے چادر سر پر رکھی اور کھڑی ہو گئی۔
"چلو، پھر چلتے ہیں جی مولوی صاحب کے گھر، راستے میں ٹیوب ویل بھی آتا ہے، ٹھنڈے پانی سے کھیلیں گے اور کھیرے، ٹماٹر توڑیں گے۔" رانی کو باہر جانے کے تصور ہی سے خوشی ہو رہی تھی۔
"تائی جی کو بتا دیں۔" ماہ نور نے کہا۔
"لیں وہ تو شوگر کا ٹیکہ لگا کے بریانی کھانے کے بعد سو بھی گئیں۔ انہوں نے نہیں جاگنا عصر کے وقت سے پہلے، اتنی دیر میں ہم نے مولوی جی کے گھر سے ہو کے بھی آجانا ہے۔" رانی نے لاپروائی سے کہا۔
"اچھا ایسا کرو، مولوی صاحب کے گھر والوں کے لیے تھوڑا کھانا اور پھل ساتھ لے لو، ہم کہیں گے ہم کھانا دینے آئے ہیں۔" ماہ نور کو خیال آیا۔
"مولوی جی کی جولی بی ہے، وہ بڑی ہی تنک چڑھی ہے۔" رانی نے برتنوں کے انبار کے درمیان سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "ہماری بی بی جی نے بڑا کہا بی بی کے ساتھ کھانا باندھ دو، پر نا جی، وہ نہیں مانی۔"
"چلو پھر تو اور بھی اچھا ہے، تم فٹافٹ ان کے لیے کھانا باندھ لو ساتھ۔" ماہ نور نے اسے اسی کی زبان میں جواب دیا۔
بیس منٹ بعد ماہ نور دوپٹے میں چہرا چھپائے رانی کے ہمراہ کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈیوں پر قدم جماتی مولوی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
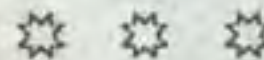
"آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں، سوئی کیوں نہیں؟" وہ اسٹوڈیو سے نکل کر واپس لاؤنج میں آیا تو میزبان کو ہنوز اسی پوزیشن میں صوفے پر پاؤں چڑھائے بیٹھے دیکھا جیسے چھوڑ کر گیا تھا۔
"ہاں!" وہ جیسے کسی گہری سوچ سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔ "آج عرصے کے بعد میں نے دھیان لگا کر گھڑی کی ٹک ٹک سنی ہے۔ ورنہ میں سمجھتی تھی دنیا بے آواز کلاک بنانے لگی ہے۔"
"اوہ! میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ میری وجہ سے بے آرام ہو رہی ہیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا کینوس ایک میز کی ٹانگ کے ساتھ ٹکا کر فرش پر رکھتے ہوئے کہا اور تیز روشنی میں اپنا ہاتھ نظروں کے سامنے پھیلا کر دیکھنے لگا۔
"تمہارے آنے سے عرصہ بعد احساس ہوا کہ جب کوئی آتا ہے تو کیسا لگتا ہے لہٰذا زحمت، تردد، بے آرامی

جیسی باتیں مت کرنا۔" اسے جواب ملا۔

"ارے تمہارا ہاتھ تو زخمی ہے۔" پھر اس کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑ گئی اور وہ صوفے سے اتر کر اس کے قریب آ گئی۔

"اُف وہ! خون تو ابھی بھی بہہ رہا ہے' کتنا خون جم بھی گیا تمہاری کلائی پر۔ زخم گہرا ہے اور تم کتنے سکون سے اسے دیکھ رہے ہو۔" میزبان کے چہرے پر اضطراب جھلکا۔

"میں یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کلائی کاٹ کر خودکشی کرنے والے کتنی دیر خون بہنے اور اس کے بہنے کے نتیجے میں موت کا انتظار کرتے ہوں گے۔" وہ بدستور اپنے ہاتھ پر نظریں جمائے بولا۔ "اس دوران ان کا کبھی واپس زندگی کی طرف دوڑ آنے کو جی تو چاہتا ہوگا۔ ہے نا؟" اس نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"بے وقوف لڑکے' چلو فوراً" زخم کو دھو کر آؤ' میں ڈریسنگ کا سامان لے کر آتی ہوں۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ وہ اسی طرح مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتا کچن کے سنک کی طرف مڑ گیا۔ "اینٹی جرمز ہینڈ واش!" اس نے سنک پر رکھے ہاتھ دھونے کے محلول کی بوتل پر چپکے معلوماتی کاغذ پر چھپے الفاظ کو پڑھا۔

"نہاتے دا صابن' ہتھ دھونے دا صابن لیتوے دھونے تے بھانڈے دھونے دا صابن (نہانے' ہاتھ دھونے' کپڑے اور برتن دھونے کا صابن۔)" اسے نور فاطمہ یاد آ گئی جس نے کہا تھا کہ اس کے پاس ہر طرح کی دھلائی کے لیے ایک ہی صابن تھا اور تیز و مخصوص بو والے اس صابن سے ہینڈ پمپ کے پانی کے نیچے ہاتھ منہ دھوتے ہوئے اسے جانے کیا محسوس ہوا تھا' محسوسات اپنی جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔

"ایک سفر اور کتنے پڑاؤ۔" جراثیم کش ہاتھ دھونے کے محلول سے اپنا زخمی ہاتھ دھوتے ہوئے اس نے سوچا اور دھلے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھا' زخم چھ انچ کی لکیر کی مانند کلائی سے انگوٹھے تک پھیلا ہوا تھا۔ شاید کوئی نازک رگ کٹ گئی تھی جب ہی اچھی طرح ٹھنڈے پانی میں دھلنے کے بعد بھی خون بھل بھل بہہ رہا تھا۔

"چلو ادھر آؤ۔ میں تمہاری مرہم پٹی کر دوں۔" میزبان فرسٹ ایڈ باکس اٹھائے واپس لاؤنج میں آئی۔

"ویسے تو اس زخم پر ٹانکے لگنے چاہئیں۔" نزدیک کا چشمہ آنکھوں پر جما کر اس نے زخم کا جائزہ لیا۔

"ادھر ایک کلینک ہے جہاں میری دوست بیٹھی ہوگی۔ اس وقت نائٹ ڈیوٹی پر۔" اس کے پاس چلیں تمہارا ہاتھ سلوانے۔ اس نے چشمے کے اوپر سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاتھ ہی سلوائیں گی نا ہونٹ تو نہیں۔" وہ اس کے سامنے سے فرسٹ ایڈ باکس اٹھا کر کھولتے ہوئے بولا۔

"بس اس گاز بینڈیج کو اس محلول میں بھگو کر زخم پر رکھ دیں اور اگر پٹی باندھنی آتی ہے تو کس کر باندھ دیجیے' خون بہنا بند ہو جائے گا۔" اس نے گاز کا پیکٹ نکال کر انہیں پکڑاتے ہوئے کہا۔

"میں چاہ نہیں رہی تھی کہ اس وقت تم اس کمرے میں جاؤ' مگر تمہاری مرضی اور موڈ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔" وہ پٹی باندھتے ہوئے بولی۔

"وہاں جو جاتا ہے' زخم ہی کھا کر آتا ہے۔" پٹی کی گرہ باندھتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

"دل پر' روح پر یا جسم پر۔" وہ بلا ارادہ بولا۔

"شاید سب پر۔" اس نے کہا اور دوا اور پٹی کے پیکٹ واپس باکس میں رکھنے لگی۔

"اور یہ کیا ہے؟" اس نے میز کی ٹانگ سے ٹکے کینوس کی طرف دیکھا۔

"یہ پینٹنگ ہے جو مجھے آپ سے خریدنی ہے۔" سعد نے ہاتھ کے درد کی شدت سے آنکھیں بند کرنے کے بعد کھولتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ یہ بیچنے کے لیے نہیں ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔

"پھر گفٹ کر دیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"گفٹ!" باکس اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف جاتے جاتے اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں گفٹ نہیں دان کر چکی۔" وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔ "اِٹ نائٹ ان ہیون۔" وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں گھس گئیں۔

"واقعات و حقائق کے ڈانڈے یوں اچانک مگر اتنی خوبی سے آ کر آپ کی نظروں کے سامنے جڑنے لگیں تو نظریں چرانا ممکن ہے کیا؟" سعد نے خود سے سوال کیا۔ "نہیں' یہ ایسے نہیں ویسے ہوا ہوگا' نہیں یہ تو نظر کا دھوکا اور محض اتفاق ہے' یہ سب لغو اور بے معنی باتیں ہیں۔" اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کو دباتے ہوئے سوچا اور تھکے ہوئے جسم کو صوفے پر گرا دیا۔

"یہ پین کلر لو اور ساتھ میں دودھ کا گلاس اور جا کر آرام کرو اب' تم چہرے سے اس وقت بہت تھکے ہوئے اور بے آرام نظر آ رہے ہو۔" دودھ کے گلاس کی ٹرے میں دو گولیاں اور ساتھ ہی مفت مشورہ سامنے آیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے' میں آرام کرتا ہوں۔" اس نے چپ چاپ دوا منہ میں رکھی اور نیم گرم دودھ کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

"تمہارے بال الجھے ہوئے ہیں اور گرد آلود بھی۔" ایک ہاتھ اس کے بالوں میں آ کر ٹھہرا اور ان کی گرد جھاڑنے لگا۔ "کیوں اور کب سے خود کو خوار کر رہے ہو۔" ایک پُرسکون اور لطیف احساس اس کی رگ و پے میں اترا۔ وہ تپتی دھوپ میں چلتا جیسے ایک دم کسی چھتنار درخت کے ٹھنڈے گہرے سائے میں آ گیا تھا۔

ساری دنیا میں' میں محض اس احساس کو پانے کی سعی کے جرم ہی میں تو جلاوطن ہوا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ اسی دم وہ ہاتھ اس کے بالوں سے الگ ہو گیا اور وہ واپس دشت نار میں پہنچ گیا۔

"سو جاؤ جا کر۔ نیند تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔" لہجہ اور الفاظ دونوں ہی سپاٹ ہوئے اور روایتی بھی۔

اس نے سر ہلایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کمرے میں پہنچ گیا' جہاں بیڈ پر سے سفید چادریں اٹھا کر اسے ایک آرام دہ مہمان خانہ بنا دیا گیا۔

☼ ☼ ☼

"مولوی کی بیٹی کو دیکھا تھا آپ نے ماہ نور باجی! کتنے ہپھرے کھلا (ڈرامے) رہی تھی آج۔" اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے رانی نے اس سے کتنی ہی باتوں کے دوران ایک بات یہ بھی کی تھی۔ "میں نے سنا ہے۔ اس لڑکی نے کھاری سے پسند کی شادی کی ہے۔ اس سے ملنے فارم ہاؤس جایا کرتی تھی۔ بڑی کوئی جگرے والی لڑکی ہے۔ ماہ نور باجی! فارم ہاؤس جانے سے پہلے بڑے بڑے دل والوں کو پسینہ آ جاتا ہے۔ جگہ جگہ تو ادھر بندوقوں والے مچھڑ (مونچھوں والے) پھرتے ہیں۔"

"ارے نہیں۔۔۔ غلط ہے یہ۔۔۔ وہ لڑکی تو شکل سے اتنی انوسینٹ (معصوم) لگتی ہے۔" ماہ نور نے کہا۔ "اور کھاری۔۔۔ توبہ کرو' وہ بے چارہ کہاں ایسا لڑکا لگتا ہے' جو کسی لڑکی سے چھپ چھپ کر ملے۔"

"ادھر گاؤں کے لڑکی لڑکوں کا آپ کو نہیں پتا جی۔ وہ بڑے چلاک (چالاک) ہوتے ہیں' اب کھاری کی جو ووہٹی ہے۔ بندہ اس سے پوچھے' اتنی تم ماں سے او دھری (اداس) تھیں تو پھر ماں کے ساتھ کیوں نہیں گئی' کھاری وچارے کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس کو کہتی ہے۔ "واپس چلو واپس چلو۔" اس کو بھی ساتھ لے کر ہی ٹل گئی۔" رانی نے ناک چڑھا کر کہا۔ ماہ نور کو اندازہ ہو رہا تھا کہ تائی صابرہ کی مصاحبین کی نظر میں کھاری کی دلہن کا رتبہ کیا تھا۔ اس نے رانی کی اس بات کے جواب میں کوئی بات نہیں کی۔

"جی! آگیا مولوی جی کا گھر۔" ایک کشادہ میدان کے درمیان بنے مختصر سے گھر کے رنگ اڑے دروازے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے رانی نے کہا۔ ماہ نور نے سر گھما کر اس گھر کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ جو کچھ مولوی صاحب کی بی بی نے آج محفل میں کہا' یہ گھر ان الفاظ کی عملی تصویر تھا۔

☼ ☼ ☼

"اٹس اوکے رازی! تھینک یو سوچ۔ آج ہم اپنا اپنا معمول کا کام کریں گے۔" باس نے صبح آٹھ بجے رازی کو اطلاع دی تھی۔ صبح صبح باس کا فون آنے پر رازی نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"گروسری ایڈمنسٹر کرلیں آج سر؟" اس نے خوشی سے چھلانگیں مارتے دل پر قابو پاتے ہوئے بے تکی سی بات کی۔

"جو دل چاہتا ہے' کرو۔ میں جانتا ہوں' گزشتہ دو دنوں سے میں تمہیں خاصے ٹف ٹاسک دے رہا تھا۔"

"نہیں سر! آپ کی خواہش ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔" رازی نے مودب لہجے میں کہا۔ دوسری جانب فون بند ہو جانے پر وہ ناچتا ہوا صوفی کی طرف دوڑا۔ اس روز وہ دونوں اپنی مرضی سے ہر وہ کام کر سکتے تھے' جو وہ کرنا چاہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں جتنا اس کو جانتا ہوں انکل! اس کے مطابق میرا وجدان کہتا ہے کہ وہ محفوظ ہے اور یہیں کہیں ہے۔" ابراہیم نے بلال سلطان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اس کی گاڑی کا جائزہ لینے کے بعد میرا بھی یہی خیال ہے۔ اسے فوری طور پر کوئی خطرہ لاحق ہے۔ نہ ہی پچھلے دنوں وہ کسی حادثے کا شکار ہوا۔" انہوں نے پرسکون انداز میں کہا۔ "میں معذرت خواہ ہوں' میں نے اپنی گھبراہٹ میں تم سب کو پریشان کیا۔ مگر شاید تم بیٹے کے لیے ایک باپ کے جذبات کو اس وقت زیادہ بہتر سمجھ سکو' جب تم خود باپ بن جاؤ گے۔"

"جی انکل!" ابراہیم نے احتراماً" سر جھکایا۔

"دیکھو! تم اس کی کوئی غیر معمولی ایکٹویٹی' معمول سے ہٹ کر کسی سے تعلق' کسی ایسی جگہ پر اس کا آنا جانا' جہاں کے بارے میں' میں نہ سوچ سکتا ہوں' مجھ سے نہیں چھپاؤ گے۔" انہوں نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ تم میرے جذبات کو سمجھ سکتے ہو۔"

"جی انکل! میں سمجھتا ہوں۔" وہ بولا اور تیزی سے اٹھ گیا۔ "میں اب چلوں۔"

"ہاں! جاؤ۔" انہوں نے سر ہلایا۔

ابراہیم کے جانے کے بعد انہوں نے اپنی تھکی ہوئی آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے ہاتھ کے زخم کی صورت حال کیا ہے اب؟" اگلے روز گیارہ بجے جب وہ اس کمرے سے برآمد ہوا تو میزبان میز پر ناشتے کے برتن لگا رہی تھی۔ "اور ہاں! اب تم کچھ کچھ انسان لگ رہے ہو۔" انہوں نے رک کر جملہ اچھالا۔

"میں نے غسل کیا ہے اور کپڑوں کا واحد جوڑا' جو میں ایک چھوٹے بیگ میں ساتھ لایا تھا' زیب تن کر لیا۔" وہ مسکرایا۔ "میں جانتا ہوں میری شیو بڑھی ہوئی ہے اور چہرے کی وحشت ابھی گئی نہیں۔ لہٰذا میں کچھ کچھ انسان ہی لگ رہا ہوں۔ پورا انسان نہیں۔"

"میں امپریس نہیں ہوئی۔" اس نے سفید جاذب کپڑے سے کھانے کی میز کے کور پر گرا پانی خشک کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری عمر کے اکثر لڑکے یوں ہی ذرا سی بات پر فرسٹریڈ ہو جاتے ہیں اور شیو بڑھا لینا وغیرہ تو عام سی بات ہے۔"

"ہاہا!" وہ کئی دن بعد بے اختیار ہنس دیا۔ "میری شیو اس لیے بڑھی ہوئی ہے میم! کہ میرے پاس شیونگ کٹ نہیں ہے۔ ورنہ میری فرسٹریشنز شیو پر نہیں نکلا کرتیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" اس نے جاذب کپڑا سنک میں جھاڑتے ہوئے کہا اور کھانے کی میز کے قریب واپس آئی۔ "آؤ ناشتا کرلو۔" اس نے ایک کرسی باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک بھرپور ناشتا تھا اور آپ چائے بہت اچھی بناتی ہیں۔" سعد نے ناشتے کے دوران چھا جانے والی خاموشی چائے کا آخری گھونٹ پینے کے بعد توڑی۔ "اب اگر آپ دوبارہ میری مرہم پٹی کردیں تو میں ممنون ہوں گا۔ اس کے بعد مجھے کسی سے ملنے جانا ہے۔"

"ضرور۔" اس نے نیپکن سے ہاتھ پونچھے اور برتن سمیٹ کر سنک میں رکھنے کے بعد اس کی مرہم پٹی میں مصروف ہوئی۔ "زخم گہرا ہے' تمہیں کسی ڈاکٹر سے مل لینا چاہیے۔" پٹی کرنے کے بعد اس نے سعد کی طرف دیکھا

"فی الوقت تو مجھے ڈاکٹر سے زیادہ ایک عدد spiritual healer کی ضرورت ہے۔ اچھا اب میں وقتی طور پر رخصت ہوتا ہوں۔" پھر اس نے سر اٹھا کر میزبان کی جانب دیکھا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دن آپ کے ہاں ہی ٹھکانا کرلوں؟"

"پوچھنے کی ضرورت تو نہیں تھی' مگر پوچھ لیا ہے تو میرا جواب ہے کہ شوق سے۔"

"چلیں پھر میں وقتی رخصت لیتا ہوں۔ تھینک یو سوچ فلزا میم۔"

"گاڑی چاہیے تو کی رنگ' ادھر ہولڈر پر لٹکا ہے۔"

"یہ ایک اضافی عنایت ہوگی۔" وہ مسکرایا اور کی رنگ اتار کر باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

"فقیر لباس بدل رہا ہے۔ فقیر کو تھوڑا وقت دو۔" اختر کی جھونپڑی سے باہر وہی لڑکا مٹی کے تیل کے چولہے پر بڑا سا برتن چڑھائے کچھ ابال رہا تھا۔

"تم ابھی تک ادھر ہی ہو بھاگے نہیں؟" وہ گھٹنوں کے بل اس لڑکے کے سامنے بیٹھ گیا۔

"پہلے والا بالکا تو بہت جلدی مایوس ہو گیا تھا۔"

"مجھے روشنی تو نہیں ملی ابھی تک۔ مگر دور کہیں کوئی تارہ ضرور چمکتا دکھائی دیتا ہے۔" لڑکے نے ایک لمبی ڈوئی برتن میں ابلتے پانی میں چلائی اور ڈوئی کی مدد سے ایک ابلتا آلو باہر نکال کر ہاتھ سے اس کی نرمی سختی کا اندازہ لگانے لگا۔

"چاہے وہ تار سائیں کا شعبدہ ہو اور قریب جاؤ تو پتا چلے چائنا کی ایجاد کردہ مصنوعی روشنی کا کوئی اسٹائل ہے؟" اس نے لڑکے کو تنگ کرنے کی غرض سے کہا۔

"جب بندے کا دل ہی چائنا کا کھلونا بن جائے تو تارے کو کچھ کیا کہنا باؤ جی۔" لڑکا فلسفیانہ انداز میں بولا اور سر پر رکھی نائلون کی سبز ٹوپی اتار کر جھاڑنے لگا۔ "سب کچھ مصنوعی ہو گیا ہے باؤ جی! تو امید کے تارے چاہے سستے

کرسٹل سے بنے نکلیں، چاہے پلاسٹک کے ان کی کشش کم سے کم اس وقت تک تو قائم رہتی ہے نا! جب تک ہاتھ نہیں لگتے۔"

"بس پھر کھائے جاؤ آلو ابال ابال کر۔" وہ اٹھا اور کٹیا کے دروازے کی طرف چل دیا۔

"مجھے پتا تھا آج کل میں اِدھر کا چکر لگاؤ گے۔" اختر اسے دیکھ کر مسکرایا اور گڑگڑی میں تانبے کا باریک تار پھیرنے لگا۔

"آپ کے کشف کی کرامات ہیں۔" وہ اختر کے سامنے نیچے چٹائی پر بیٹھ گیا۔

"او باؤ جی کیوں فقیر کو گناہ گار کرتے ہو؟" اختر نے گڑگڑی نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"کشف نیاز کی طرح نہیں بٹتے، جو ہر اس انسان کو ہونے لگیں، جو میری طرح ویرانے میں فقیری کا چولا پہن کر بیٹھ جائے۔"

"اچھا تو پھر آپ کو الہام ہوتا ہے؟ چھٹی حس کا کرشمہ ہے، جو آپ کو قبل از وقت آنے والے واقعات کی خبر دیتی ہے؟"

"میری تو اس جھونپڑی کا تنکا تنکا چھان مارا آپ کے ہم زاد نے... جیسے آپ کوئی ننھا سا مچھر ہو جو ان تنکوں میں چھپا بیٹھا ہے۔" پھر اختر کے لہجے میں شکوہ ابھرا۔

"اوہ!" اس کے ہونٹ نیم دائرے کی شکل میں سمٹے۔ "میری وجہ سے آپ تنگ ہوئے۔"

"بندہ ہی بندے کی وجہ سے پریشان ہوتا ہے باؤ جی!" اختر آنکھیں بند کرکے مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ بتاؤ! کیوں فوجیں پیچھے لگائی ہوئی ہیں؟ کیوں طلسمی چادر اوڑھ رکھی ہے، ماجرا کیا ہے! سنا ہے مواصلاتی رابطے بھی بند ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کی گاڑی تو مل گئی ہے۔ مگر فون نہیں مل رہا۔"

"واہ سائیں جی! آپ کو تو خوب خبریں ہیں۔" وہ مسکرایا۔ اختر نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

"بات وہی ہے سائیں جی۔" اس نے کہنا شروع کیا اور اپنی بات کرتے ہوئے اس کی نظر اچانک جھونپڑی کی دیوار میں گڑی واحد کھونٹی پر ٹنگے ان کپڑوں پر پڑی جس کے متعلق ہی شاید وہ نیا بالکا کہہ رہا تھا۔ "فقیر لباس تبدیل کر رہا ہے۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نئے مزاج کا شہر

عنبرین اعجاز

ملکہ کوہسار (مری) اور شہر بے مثال (اسلام آباد) کے درمیان واقع گلریز ہاؤسنگ اسکیم جدید اور حسین ترین قدرتی مناظر میں گھری ایک جدید کالونی تھی۔ جہاں صبا اور عمران کو شفٹ ہوئے پورے تین ماہ گزر چکے تھے لیکن تاحال پڑوس میں سے کسی نے بھی ملنا گوارا نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ کوئی بھی سلام دعا لینے کا بھی روادار نہ تھا۔ یہاں کے مکین پورچ میں اپنی کار میں بیٹھتے اور یہ جا وہ جا۔ جب لوٹتے تو کار گیراج میں داخل ہوتے ہی ملازم بلند و بالا آہنی گیٹ جن پہ سہ سکندری کا گمان ہوتا تھا۔ فوری طور پر بند کر دیتے۔

گلی میں صرف ملازم، خانساماں، ڈرائیور، گارڈز، میڈ بچیاں اور صفائی والی ماسیاں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ صبا اور عمران کے لیے یہ نیا اور اجنبی شہر تھا۔ ابھی شادی خانہ آبادی کو صرف دو ہفتے گزرے تھے کہ عمران کا ٹرانسفر مع ترقی ہو گیا۔ پراپرٹی ڈیلر نے جس علاقے میں جتنے کرائے پر جتنی مدت کے لیے ایڈوانس کا کہا، وہیں

مکان لے لیا۔ دراصل لوکیشن بے حد خوب صورت تھی۔ ویسٹ اوپن 'ڈیڈ کارنر کے اس سنگل اسٹوری مکان کے اطراف میں سرسبز پہاڑ تھے اور ان پہاڑوں پر برستی بارش 'کھلی فضا 'ٹریفک کے شور شرابے اور آلودگی سے پاک ماحول۔

صبا نے پہلے اپنا پر رونق میکہ چھوڑا تھا۔ پھر بھری پری سسرال۔ یہاں کے پر سکون اور خاموش ماحول میں کچھ دن تو وہ خوش رہی۔ لیکن اب تنہائی کا احساس ستانے لگا تھا صبا ٹھہری "مارننگ برڈ" گھر کا ہر کام صفائی سے لے کر کھانا پکانے تک وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرنے کی عادی تھی اور عمران شام کو چھ بجے آفس سے گھر لوٹتا تھا۔ موبائل پہ بھی کہاں تک گفتگو اور ایس ایم ایس کے تبادلے ہوں۔

گردوپیش کے سرد مہر ماحول میں صبا کا دل ابھی سے تنگ پڑنے لگا تھا۔ اس نے تو ہنسی خوشی اس بستی کو اپنا لیا تھا۔ لیکن اس بستی نے اسے ابھی تک نہیں اپنایا تھا۔ عمران دن بھر کی تھکاوٹ لیے گھر لوٹتا تو اس کے آگے وہ ہرگز کوئی گلہ شکوہ یا باہر گھومنے پھرنے کی فرمائش نہ کرتی۔

☼ ☼ ☼

موبائل کی جگمگ کرتی اسکرین پر عطیہ خالہ کا نام پڑھتے ہی اس کی اداس آنکھوں میں خوشی کے دیے چمک اٹھے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی عطیہ خالہ نے موسم گرما میں قریبی رشتے داروں اور پڑوسیوں کے لیے وسیع پیمانے پر بڑے اہتمام سے اچار بنایا تھا۔ صبا کے لیے انہوں نے الگ سے ایک چھوٹا سا مرتبان رکھ چھوڑا تھا۔ عطیہ خالہ نے اسے یاد رکھا تھا۔ حالانکہ وہ اتنی دور بیٹھی تھی۔ صبا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اچار بنانے کی بھی اپنی لذت تھی 'سارا منظر صبا کی یادداشت میں محفوظ تھا۔

حویلی کی کشادہ چھت پہ چارپائیاں مناسب فاصلے سے بچھائی جاتیں۔ پھر ان پر صاف ستھری سفید چادریں بچھانے کا حکم ملتا۔ چھت پر ہی چولہے کا اہتمام ہوتا۔ بڑے چھوٹے ہر سائز کے مٹی کے مرتبان اور ہانڈیاں دیوار کے ساتھ ایک قطار میں رکھے جاتے اور انہیں خوب اچھی طرح دھونے کے بعد دھوپ لگوائی جاتی۔ بڑی بڑی پراتوں کے اٹھانے' رکھنے کی کھنکھناہٹ اور کڑاہی میں کڑچھا بجانے کی آواز میں عطیہ خالہ کی سخت ہدایات اور ڈانٹ ڈپٹ کی صدائیں بھی شامل ہوتیں۔

چاچا خیرو کا گبھرو جوان بیٹا شیرو کمال مہارت سے ' چٹائی پہ بیٹھا ٹوکا چلاتا جاتا اور کچے آموں کے ایک ہی سائز کے ٹکڑوں سے پراتیں بھر دیتا۔ فضا میں سونف' رائی 'کلونجی 'میتھی دانے اور سرسوں کے تیل کی ملی جلی خوشبو پھیل جاتی اور دور دور تک اچار کی تیاری کا پتا دیتی۔ نمک 'ہلدی' سرخ مرچ' کچے کچے ہرے آم' پیلے پیلے لیموں 'ہری سبز مرچیں 'کریلے کی باریک کٹی پھانکیں اور چھوٹے چھوٹے گول لسوڑھے' آملے' ہڑ اور سفید تازہ مولیاں' رنگوں اور خوشبوؤں کی ایک منفرد سی بہار اور گہما گہمی ہوتی۔ گویا اچار ڈالنے کی بھی یہ ایک باقاعدہ تقریب ہوتی۔ جس پر کسی تہوار کا گمان ہوتا تھا۔ صبا کی سماعتوں میں یہ ساری آوازیں پڑنے لگیں۔ حتیٰ کہ اچار کی خوشبو تک اسے اپنی سانسوں میں گھلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر اداسیوں کے جنگل میں بھٹکنے لگتی۔ ایک آئیڈیا اس کے دماغ میں آیا کہ کیوں نہ صبا خود دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے میں پہل کرلے۔ کوئی اچھی سی سویٹ ڈش تیار کرکے ہمراہ لے جائے۔ آخر بیکنگ کے اتنے کورسز کر رکھے تھے' وہ کب کام آنے تھے۔

اس نے کلاک پہ نظر ڈالی۔ ابھی سارے پڑوسیوں کے لیے تو نہیں۔ البتہ ایک گھر کے لیے ایک پیالا تو تیار کیا جاسکتا تھا۔ چند لمحوں میں ہی اس نے یہ طے کرلیا کہ کون سا خوش شکل ڈیزرٹ بنانا ہے۔ کچن کیبنٹ اور فریج میں سے تمام مطلوبہ سامان برآمد ہوگیا۔

ساتھ والے وہ ہمسائے جن کی دیوار سے دیوار ملتی تھی 'پہلا حق ان ہی کا تھا۔ وہ خوشی خوشی اپنے کام میں جت گئی۔ اسی بہانے ملنے جلنے کی راہ ہموار ہونے کے قوی امکانات تھے۔

☼ ☼ ☼
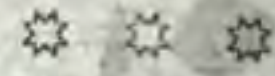
صبا کی توقع کے عین مطابق فرحت بخش ڈیزرٹ تیار ہوگیا تھا۔ کانچ کے شفاف پیالے میں بڑی مہارت سے اطراف میں چاکلیٹ رول کے سلائسز کی تہہ لگائی گئی تھی۔ جن پہ کافی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ خالی جگہ سرخ چیریز سے پر کی۔ پھر اسٹرابری اور کیلے کے کسٹرڈ کی تہہ جمائی گئی۔ ٹاپ پہ آئسنگ گن کی مدد سے کریم سجانے کے بعد گرین جیلی کیوبز' پائن ایپل کے ٹکڑے اور اسٹرابریز سے یہ میٹھا تیار کیا۔ جو گرمی کے شدید حبس زدہ موسم میں بہار کا تروتازہ تاثر دے رہا تھا۔

شاور لینے کے بعد صبا نے گلابی رنگ کی فراک اور چوڑی دار پائجامہ پہنا۔ بڑا سا سفید کاٹن کا کلف زدہ دوپٹا جس کے بارڈر پر گلابی رنگ کی کڑھائی اور ٹسلز تھے 'پھیلا کے اوڑھا۔ ہلکے نم بالوں کو کیچر میں قید کیا۔ ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگائی اور ہم رنگ آویزے کانوں میں پہننے کے بعد پاؤں میں کھسے پھنسانے لگی۔ اس کی اپنی شخصیت بھی تازگی اور خوش مزاجی کا بھرپور عکس پیش کر رہی تھی۔ مرکزی دروازے کو مقفل کرکے جب وہ باہر سڑک پہ آئی تو سورج آگ برسا رہا تھا۔

ساتھ والے گھر کی ڈور بیل بجائی تو پانچ منٹ تک کوئی جوابی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ صبا نے دوبارہ بیل بجائی تو اندر سے کسی عورت کی کرخت آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"کون ہے بھئی؟" عورت کے لہجے میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔ اب اتنی دور سے باآواز بلند جواب دینا خاصا نامناسب معلوم ہوتا تھا۔ لیکن بہرحال یہ ہمت بھی کرنی پڑی۔

صبا نے دائیں بائیں دیکھا۔ کوئی موجود نہ تھا۔ سو وہ بھی بلند آواز میں ہی اپنے بارے میں مختصراً" بتانے لگی

۔۔۔ جواباً" خاموشی کا وقفہ طویل ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک اندر ہڑبونگ سی مچی رہی۔ کھسر پھسر کی آوازیں بھی خاصی بلند تھیں۔ نہ جانے کون سی گول میز کانفرنس جاری تھی اور کیا مشورے طے پا رہے تھے۔ بالآخر بیس منٹ بعد آہنی گیٹ کا وزنی دروازہ برائے نام کھلا اور دو عدد سبزی مائل بھوری آنکھیں اسے گھورنے لگیں۔

"جی! فرمایئے! کون ہیں آپ؟" مردانہ آواز اور بے زار کن لہجہ اور وہی پرانا سوال۔

صبا کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے کہ ابھی مزید کچھ فرمانا باقی ہے کیا؟ لیکن اس شدید گرمی میں بھی وہ اپنا غصہ پی گئی اور خود کو نارمل رکھتے ہوئے از سر نو وضاحتیں دینے لگی۔ ملازم غائب دماغی سے سنتا رہا۔ پھر اس کی نظروں کا زاویہ صبا کے ہاتھ میں تھامے پیالے پر ٹک گیا۔ صبا نے جو اس کی سوالیہ مشکوک نگاہیں دیکھیں تو فوری طور پر پیالا ملازم کے روبرو پیش کردیا۔ جسے لمحہ ضائع کیے بغیر جھپٹ لیا گیا۔

صبا پسینے میں شرابور وہیں کھڑی رہی۔ جبکہ ملازم اندر بھاگ گیا اور پھر غائب ہی ہوگیا۔ دھوپ کی شدت سے صبا کا سر چکرانے لگا تو وہ مایوس ہوکے اپنے گھر کے لیے پلٹی۔ ابھی وہ پلٹی ہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے جھٹ سے گیٹ بند کرکے کنڈی بھی لگالی۔

نڈھال صبا تھکے تھکے قدم سنبھالتی اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ پنکھا چلایا اور کاؤچ پہ بے دم سی گرگئی۔ سانسیں درست کرنے اور پسینہ خشک کرنے کے بعد فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور پھر ڈائننگ چیئر کھینچ کے بیٹھ گئی۔ جیسے جیسے گلاس سے گھونٹ گھونٹ پانی اس کے حلق سے نیچے اتر رہا تھا۔ ویسے ویسے زندگی کا احساس بڑھ رہا تھا۔ وہ واپس کاؤچ پہ بے سدھ سی گر پڑی اور نیند کی گہری وادی میں کھو گئی۔

☼ ☼ ☼
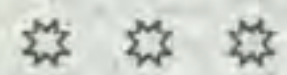
"نعیم! او نعیم! ادھر آ!" پڑوس والی بیگم صاحبہ کی دھاڑ سنتے ہی ملازم اپنے ایپرن سے گیلے ہاتھ پونچھتا ہوا

کچن سے برآمد ہوا۔ اسے قوی امید تھی کہ حسب سابق یہ مسترد شدہ "آئٹم" بھی اسی کا مقدر قرار پائے گا۔ لیکن اس وقت نعیم کی امیدوں پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جب بیگم صاحبہ نے پیالا اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اسے فوری طور پر نتاشا کی ممی کے گھر دے آنے کا حکم دیا۔ اس پیغام کے ساتھ کہ بیگم صاحبہ نے اپنے ہاتھوں سے خاص طور پر آپ کے لیے ہی بنایا ہے۔ نتاشا کی ممی کو بڑا گھمنڈ تھا کہ ان کی بیٹی انگریزی اور دیگر بدیسی پکوان بڑی مہارت سے بناتی ہے۔

"اونہہ! جب وہ انگریزی بلغم یہ خوش شکل اور خوش ذائقہ سویٹ ڈش دیکھے گی تو جل بھن کر کباب ہو جائے گی۔ یہ پیالا ایک طمانچہ ثابت ہوگا میم صاحب کے لیے۔" بیگم صاحبہ کے لپ اسٹک زدہ ہونٹوں پہ مکارانہ اور حاسدانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

پیالا لے جاتے ہوئے نعیم مستقل بیگم صاحبہ اور ان کے اہل خانہ کے متعلق سوچ رہا تھا بیگم صاحبہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کی دائمی مریضہ تھیں۔ بڑے صاحب جی ٹھہرے دل کے مریض۔ بچے بیرون ملک زیر تعلیم تھے۔ چہ چہ! رزق کی اس قدر فراوانی کے باوجود یہ لوگ عمدہ ذائقوں سے محروم تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہائیں! آئی ڈونٹ بلیو دس۔ اس "پینڈو پروڈکشن" نے جمالیاتی ذوق سے بھرپور یہ کلر فل ڈیزرٹ کیسے بنا لیا؟ میں تو سمجھی تھی کہ اسے کاجل کے ڈورے کھینچنے اور دوسری جنگ عظیم کی بکتر بند جیپ میں اکڑ کے سوار ہونے، اترنے اور ٹھائیں ٹھائیں کرکے دروازہ بند کرنے کے کچھ اور نہیں آتا۔" نتاشا کی ممی نے باؤل کے اردگرد کسی جپسی کی طرح ہاتھ لہراتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہائے باجی جی! آپ تو اسے چکھنا بھی ناں۔ کہیں کوئی جادو ٹونا نہ کرایا ہو آپ کے لیے۔"

برتن دھوتے ہوئے کام والی نے بظاہر ازراہ ہمدردی محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ نتاشا کی، ممی ایک لمحے کو تو کانپ گئیں۔ کام والی رجو خوش ہو گئی وہ جانتی تھی کہ مسترد شدہ مال اب اس کا رزق بنے گا۔

"تیری بات میں وزن تو ہے رجو! تو ایک کام کر۔ برتن بعد میں دھو لینا۔ پہلے یہ ڈونگا کرنل صاحب کے ہاں دے آ۔ کہنا کہ نتاشا باجی نے بنایا ہے۔" رجو کی شکل پہ وہیں کھڑے کھڑے بارہ بج گئے۔ حالانکہ حد درجہ مغرور مسز کرنل کے بارے میں نتاشا کی ممی کی رائے تھی کہ پیدائش کے فوراً" بعد انہیں شہد کی نہیں۔ بلکہ نیلے تھوتھے کی گھٹی دی گئی تھی۔ اس لیے وہ اتنی کڑوی، کسیلی اور بد مزاج واقع ہوئی تھیں البتہ ان کا سب سے چھوٹا غیر شادی شدہ بیٹا نتاشا کی ممی کو بہت ہی سویٹ لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آں ہاں! نتاشا بی بی نے بنایا ہے یہ ڈیزرٹ؟ یہ اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اسے تو لیموں کاٹنا نہیں آتا۔ یہ دلکش، دلفریب سویٹ ڈش نہ تو اس لڑکی سے پہلے کسی نے اس کے خاندان میں بنائی ہوگی اور نہ ہی اس کے بعد آنے والی سات نسلیں اسے بنا سکیں گی۔ یہ لڑکی تو بس اپنی گنی چنی زلفیں ہی سنبھال لے تو بڑی بات ہے۔ منہ ٹیڑھا میڑھا کر کے، لہجہ بگاڑ کے انگریزی کے دو چار فقرے بول لینے سے کوئی "ماسٹر شیف آسٹریلیا" نہیں بن جاتا۔" مسز کرنل کے پرشکن ماتھے پر مزید چند شکنوں کا اضافہ ہو گیا۔

"مظہر!" مسز کرنل نے پکارا۔

"جی بیگم صاحبہ!" مظہر مسکین صورت، نظریں اور سر جھکائے، ہاتھ باندھے "باادب باملاحظہ ہوشیار" کی تصویر بنا ہمہ تن گوش حکم ثانی کا منتظر تھا کہ کب اسے دنیا کی اس حسین ترین ڈش سے نوازا جائے گا۔

"مظہر! ایسا کرو کہ جلد از جلد یہ سویٹ ڈش کونے والی کوٹھی میں مسز زریں کے ہاں دے آؤ۔ اس کے شوہر کو حال ہی میں بائیسواں گریڈ ملا ہے۔" یہ حکم سنتے ہی مظہر کا منہ لٹک گیا۔ بلاشبہ بائیسویں گریڈ کے بیوروکریٹ کی زوجہ محترمہ اس میٹھے کی زیادہ حق دار تھیں۔ زریں اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی، جو عرصہ دس سال سے اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہائے ہائے! میٹھا؟ میں تو اسے چکھوں گی بھی نہیں۔ کام والی کو آج چھٹی نہ دیتی تو اس کے سپرد کر دیتی۔ جمعدار کو بھی نہیں دے سکتی، اڑوس پڑوس کے لوگ اس کی ٹرالی کے ہینڈل پہ جھولتے شاپرز کو ایکسریز کی نظر سے گھورتے ہیں۔ اف! اب کہاں بھیجوں اس سوغات کو۔"

زریں سخت ٹینشن کا شکار تھی۔ وہ ابھی ابھی ڈھائی گھنٹے کی مسافت طے کرکے اپنے گھر لوٹی تھی۔ پیر بابا نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ کسی کے گھر سے آئی کوئی کھانے پینے کی چیز نہ کھائے۔ بلکہ چکھے بھی ناں۔ خاص کر میٹھا اور گوشت پر مبنی کھانے۔ پیر بابا نے پندرہ روز بعد آنے کا کہا تھا کہ اس دوران وہ "پڑھائی" کر کے دم شدہ نمک، چینی اور پانی تیار کر دیں گے۔ پھر زریں کو میٹھے اور نمکین کھانے وقتاً" فوقتاً" تیار کرنے ہوں گے۔ جن میں یہ دم شدہ نمک اور چینی کی چٹکی بھر مقدار شامل کرنا ہو گی اور پانی کے چند قطرے بھی چھڑکنا ہوں گے۔ پھر یہ کھانے "مراد" پوری ہونے تک کسی ایسی شادی شدہ عورت کو کھلانا ہوں گے۔ جس کے ابھی اولاد نہ ہوئی ہو یا بالفاظ دیگر جو ابھی ماں کے منصب پر فائز نہ ہوئی ہو۔

"آہا! مل گیا شکار۔" زریں نے خوشی سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے نعرہ لگایا۔ "یہ سامنے والے مکان میں جو سیدھی سادی نئی نویلی دلہن آئی ہے۔ ایک دم گائے لگتی ہے۔ شوہر بھی شکل سے الو سا لگتا ہے۔ ارے واہ یہاں تیر صحیح نشانے پہ لگے گا۔"

زریں نے چٹکی بجائی اور جھومتی ہوئی باہر پورچ کی سمت روانہ ہوئی۔ ساتھ والے گھر میں رشیدہ گیراج دھو رہی تھی۔ زریں نے اشارے سے بلایا تو وہ پائپ جھاڑو چھوڑ کے، چادر سے گیلے ہاتھ رگڑتے ہوئے آن واحد میں حاضر ہو گئی۔ لیکن یہاں اس کے لیے کوئی انعام نہیں تھا۔ وہ بے دلی سے پیالا تھامے، ناک سکوڑے سامنے والے مکان میں دے آئی۔ اس پیغام کے ساتھ کہ بیگم صاحبہ نے بڑی محنت سے آپ کے لیے خود تیار کیا ہے۔ زریں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اس بہانے لینے دینے کی راہ تو ہموار ہوئی۔

☼ ☼ ☼

کوئی زور زور سے مستقل بیل بجائے جا رہا تھا۔ صبا ہڑبڑا کے اٹھی۔ وال کلاک پہ ٹائم دیکھا تو تین بج رہے تھے۔ اس نے جلدی سے کھسے پہنے اور باہر کی جانب لپکی۔ جب وہ واپس اندر داخل ہوئی تو اکیلی نہ تھی بلکہ اس کے ہاتھ میں سویٹ ڈش کا وہ پیالا بھی تھا، جو وہ پڑوس میں دے کر آئی تھی۔ بلاشبہ یہ پیالا بھی اسی کا تھا اور اس میں تیار کردہ میٹھا بھی۔ دنیا سچ گول ہے۔ جو نقطہ آغاز تھا، وہی نقطہ انجام ٹھہرا۔ جہاں کا رزق تھا۔ وہیں آ پہنچا۔

پہلے تو صبا کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ ہوش و حواس ذرا سنبھلے تو کافی حد تک وہ ساری صورت حال کا درست اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کا نازک حساس دل ٹوٹ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے بے دلی سے پیالا فریج میں رکھ دیا۔

"میں آج ہی عمران سے بات کروں گی۔ چھ ماہ کا ایڈوانس کرایہ دیا ہے۔ تین ماہ گزر گئے ہیں۔ باقی تین بھی گزر ہی جائیں گے۔ میں بھی یہاں کے لوگوں کے گھروں سے آئی کسی چیز کو منہ نہیں لگاؤں گی اور نہ ہی عمران کو چکھنے دوں گی۔ پچھلے صحن میں چڑیوں اور کبوتروں کو ڈال دوں گی۔ یہاں تو کوئی فقیر بھی نہیں آتا۔"

صبا نے اپنے آپ کو تسلیاں دیں اور ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑنے لگی۔ اسے بے اختیار وہ شعر یاد آنے لگا۔

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

☼

آسیہ رزاقی

سمجھوتہ
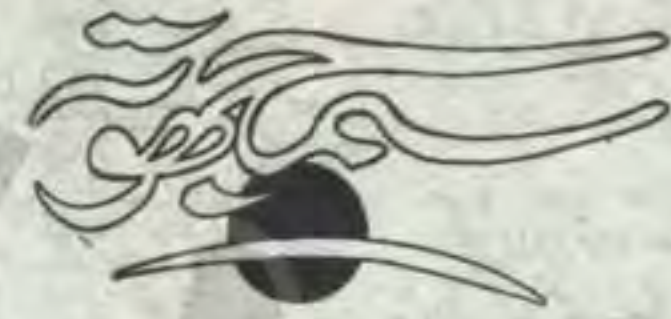
آج پھر احد آکر بیٹھ گیا تھا۔ جب بھی احد آتا' وہ خاصا ڈسٹرب ہوجاتا تھا۔ مگر احد کو اندازہ نہ تھا کہ اپنے دکھڑے رونے کے لیے اس نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ اسے تو بس کسی نہ کسی کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنی ہوتی تھی اور وہ عارف کو اس کا بہترین ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ وہ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ اسکول اور کالج کے ساتھی۔ پہلے بھی احد اپنی ہر پریشانی یا ہر مسئلہ عارف کے سامنے ہی بیان کرتا تھا۔ عارف اسے مشورہ دیتا۔ ہمدردی کرتا تھا۔ مگر اب... احد کی پریشانیاں اور مسائل مختلف تھے۔ عارف کو الجھن ہونے لگی۔ وہ احد کی مدد نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس قسم کے معاملات اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔

احد اپنی ماں کی شکایت کرتا' جو اس کی بیوی سے خوامخواہ الجھتی تھیں۔ احد کو اپنی بیوی میں کوئی نقص نظر نہ آتا۔ اماں کو بہو سے اختلاف رہتا۔ اس مسئلے کو عارف کے سامنے پیش کرتا۔ وہ الجھ کر سوچتا۔

"بھئی مجھے ان کے ذاتی جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔ یہ مجھے کیوں سناتا ہے۔" لیکن ایک اچھے' بے ریا دوست کی طرح وہ سنتا کہ دوستی کا تقاضا تھا۔ ہمدردی سے سنے۔ کوئی مشورہ دے یا نہ دے مگر گردن ضرور

ناولٹ

ہلائے۔ احد کے خیالات سے اتفاق کرے۔ بلکہ افسوس کے اظہار میں "ہاں... یہ تو واقعی بہت بری بات ہے... اچھا میں آنٹی کو سمجھاؤں گا' قسم کے جملے بھی کہے۔ جس سے احد کو تسلی ہو۔

"کل ثنا نے سرسوں کا گھٹا ہوا ساگ پکایا تھا۔"

احد تازہ ترین واردات کی اطلاع دے رہا تھا۔ "مکھن کے ساتھ مکئی کی روٹی۔ دیسی گھی کے بگھار نے خوب لطف دیا۔ میں نے بہت شوق سے کھاکر تعریف کردی۔ بس جی... اماں تن فن ہوگئیں۔ کہنے لگیں۔ "یہ پینڈوانہ ساگ پات ہمارے گھر میں تو پکتے نہیں۔ کوئی پسند بھی نہیں کرتا۔ اب تم بیوی کی خوشامد میں گن گاتے رہو۔ میری بلا سے۔" میں نے کہا۔ "اماں... واقعی بے حد مزے دار ساگ بنا ہے۔ مکئی کی مکھن لگی روٹی کے ساتھ کھا کر دیکھیں۔ اتنا مزا آئے گا

اور ہمارے گھر میں ایسی کوئی چیز کبھی پکائی نہیں جاتی۔۔۔ تو ہم کیسے اور کب کھاتے۔ اتنی لذیذ چیز سے آپ نے ہم کو محروم رکھا۔ ہاہ۔ ہا۔" "بس جناب! یہ کہنا تھا کہ اماں کے سر سے لگی تلوے پہ بجھی۔ جو منہ میں آیا بولتی گئیں۔ مکئی کی مکھن لگی روٹی اٹھا کر ڈبے میں پٹخی۔ ساگ کی پلیٹ کچرے کے ڈبے میں ڈالی۔ ہائے! سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ اب تم ہی بتاؤ! بے چارے ساگ کا کیا قصور تھا؟"

"تمہاری بیگم۔۔۔ بہت برا مانا ہو گا انہوں نے۔" عارف محض دلچسپی ظاہر کرنے کے لیے بولا۔

"اوہ۔۔۔ بڑی تیز چیز ہے وہ۔ اماں مجھ سے لڑ رہی تھیں۔ وہ جھٹ سے کچن میں گئی۔ ساگ کی دیگچی اور مکئی کا آٹا اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ آئی اور معصوم بن کر کھڑی ہو گئی۔ روٹی کا ڈبا اٹھایا۔ وہ بھی کمرے میں پہنچا دیا۔ اماں کا پکایا ہوا کھانا فریج میں رکھ دیا گیا۔ صبح کا ناشتا بھی ساگ اور مکئی کی روٹی سے کیا۔ چائے کے ساتھ روٹی اچھی لگی۔ اب گھر جا کر یا تو اماں کا پکایا فریج والا کھانا یا پھر وہی ساگ روٹی یار۔۔۔! یہ تو خاصی سزا ہے۔ خیر چلو کیا ہو سکتا ہے۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"ایسا کرو کہ اس وقت تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ چھٹی انجوائے کرو، ٹھیک؟" عارف نے مشورہ دیا۔

کھانا کھاتے ہوئے احد نے پوچھ لیا۔ "تمہارے ہاں کھانا پکانے والی ہے کوئی؟"

"ہاں! ایک لڑکی ہے مگر وہ سالن نہیں پکاتی۔ دال، چاول اور روٹی پکا لیتی ہے۔ ہمارا پرانا ملازم جو کسی کے گھر میں چوکیدار ہے۔ وہ صبح آکر سالن پکا کر سو جاتا ہے۔ شام کو چلا جاتا ہے۔"

"اور تمہاری بیگم۔۔۔ وہ کچھ پکانا جانتی ہیں یا۔۔۔ ثنا کی طرح بس ساگ گھوٹ لیتی ہیں۔"

عارف کو ہنسی آگئی۔ "نہیں۔۔۔ وہ تو ابھی یونیورسٹی جاتی ہے۔ چھٹی کے دن کبھی کبھار کوئی خاص ڈش بنا لیتی ہے انٹرنیٹ سے دیکھ کر۔۔۔ آجائے گا اسے سب کچھ۔۔۔"

"تمہاری امی اسے کھانا بنانے کے لیے نہیں کہتیں؟ میری اماں کی طرح۔۔۔ اصل میں یار۔۔۔ میری بہن فارحہ اپنی سسرال میں پورا گھر سنبھالتی ہے۔ پکا کر کھلاتی ہے سب کو۔ اماں کو اس کا دکھ ہے کہ وہ دیار پورے ٹبر کو پکا کر کھلائے۔ ثنا ہم دو آدمیوں کے لیے بھی خالی ساگ گھوٹ دے۔ ثنا کے بھائی سے ہی شادی ہوئی ہے فارحہ کی۔"

عارف گردن ہلانے کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔

احد نے بہت کم کھایا۔ یا تو اسے کھانا پسند نہیں آیا۔ پھر اپنے گھر جا کر ساگ روٹی کھائے گا۔ ورنہ اماں کا باسی کھانا زہر مار کرے گا۔ وہ ماں اور بیوی کے درمیان پنڈولم بنا ہوا تھا۔ کسی ایک سے یقینی طور پر مطمئن نہ تھا۔ ثنا کو ساس سے شکایت۔۔۔ ساس کو بہو کے طور طریقے ناپسند۔ وہ بہو کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتی تھیں۔ بہو اپنی حکومت کی خواہش رکھتی تھی۔ احد ان دونوں کے تعلقات میں نرمی اور مفاہمت دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی ہر کوشش ابھی تک ناکام ہی ہو رہی تھی۔ شادی سے پہلے اس کی پریشانیاں اور قسم کی تھیں۔

"اماں نے میرا عید کے لیے جو کرتا سیا ہے، اس کے گلے پر عجب قسم کی بوٹیاں بنا دی ہیں براؤن کلر کی۔ زنانہ زنانہ سا لگتا ہے۔ میں چاہتا تھا کالر والا گلا ہو۔"

"کالر کا اب فیشن نہیں ہے۔" عارف نے تسلی دی۔ "اور بوٹیوں کا رواج چل پڑا ہے۔"

"مگر وہ لیڈیز لیڈیز سا لگتا ہے۔" اس نے پھر وضاحت کی۔

"اچھا ہے نا زنانہ۔۔۔ لیڈیز کی نظریں میں رہو گے تم۔"

"اچھا؟ پھر ٹھیک ہے۔" عارف کے مشورے سے وہ مطمئن ہو جاتا۔ ورنہ اسی اندیشے کا شکار رہتا کہ لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہوں گے۔

احد کے جانے کے بعد وہ ناعمہ کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی تک یونیورسٹی میں تھی۔ صبح ایک مگ دودھ پی کر گئی تھی۔ صبح اس سے کچھ کھایا نہ جاتا تھا۔ یونیورسٹی جانے کی ٹینشن کچھ کھانے کی اجازت نہ دیتی۔ دوسری

لڑکیوں کی طرح وہ کینٹین سے لے کر بھی کچھ نہ کھاتی تھی۔ ایک بار بیمار ہو گئی تھی۔ تب سے محتاط ہو گئی۔ اسے یوں بھی کچھ کھانے پینے کا شوق نہ تھا۔

کھانا پکانا آتا نہ تھا۔ چھٹی کے دن چائنیز یا اٹالین ڈش بنا لیتی۔ عارف اور ابا بہت شوق سے کھاتے، مگر امی کو بد دلی سے۔ امی کو بدیسی کھانوں سے رغبت نہ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی بہو روایتی کھانوں کی ماہر ہو۔

امی کو باہر جا کر کھانا بھی پسند نہ تھا۔ خصوصاً "بہو کل۔ ہوٹلنگ نرا خسارہ، مزا نہ لذت، جیب خالی ہو جاتی ہے۔ عارف کی شادی میں بھی انہوں نے عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ انہیں لگا کہ عارف تنہائی سے اکتایا ہوا ہے۔ اسے ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔ ایک ساتھی کی۔ رازدار کی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ عارف کے چہرے سے اس کے دل کا حال جان لیتی ہیں۔

یہاں وہ غلطی پر تھیں۔ وہ ابھی اتنی جلدی شادی کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ ناعمہ کے والدین کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے لیے وہ بہت اعلا مستقبل کی تمنا رکھتے تھے اور عارف ابھی جدوجہد کے مرحلے میں تھا۔ اس نے تو کبھی امی سے شادی کی خواہش ظاہر نہ کی تھی۔ نہ ہی اپنی پسند کا اظہار۔ مگر وہ ناعمہ کو دل سے پسند کرتا تھا۔ وہ لوگ بہت رکھ رکھاؤ والے اور اعلا پوزیشن والے تھے۔ پہلے پہل وہ اپنی پسند پر شرمایا تھا کہ نہ جانے ان لوگوں نے لاڈلی بیٹی کے لیے کیسے شان دار داماد کا خواب دیکھا ہو گا۔ مگر وہ سادہ دل اور شرافت کو اول سمجھتے تھے۔ شادی کے چھ ماہ کے اندر بہانے بہانے عارف اور اس کے والدین کو کتنے ہی تحائف دے چکے تھے، جو ان کی موجودگی میں تو خوش دلی سے قبول کیے جاتے۔ ان کے جانے کے بعد امی اعتراض اور نکتہ چینی کرتیں۔

"کون سا موقع تھا تحفے دینے کا۔ نہ کسی کی سالگرہ۔۔۔ نہ عید بقر عید۔ ہم کیا ننگے پھر رہے تھے کہ سوٹ دے گئے۔" یا پھر۔

"ارے بابا ہم کیا فقیر ہیں۔ ان کی بیٹی کو کھلاتے نہیں کہ وہ کیک پیسٹری اور پیٹیز دے گئے۔ واقعی یہ تو سمدھیانے کا احسان ہے کہ ہمیں کیک پیٹیز سے متعارف کرایا۔ ورنہ ہم نے کہاں کھائے تھے کیک پیٹیز۔"

امی کی یہ رائے زنی عارف کو سخت ناگوار گزرتی۔ مگر وہ اظہار ناپسندیدگی کر کے ناعمہ کے لیے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ناعمہ کو امی کی باتیں عجوبہ لگتی تھیں۔ وہ ان کے طنز کو سمجھتی نہیں تھی۔ بعد میں ہنس کر کہتی۔

"آپ کی امی کی باتیں بہت مزے دار ہوتی ہیں۔ کیسے بات سے بات نکالتی ہیں۔"

وہ چپ رہتا۔ وہ اتنی سیدھی اور معصوم تھی کہ وضاحت بھی اس کے سر سے گزر جاتی۔ عارف کو خاموش رہنے کی عادت تھی۔ خصوصاً" امی کی باتوں پر اعتراض یا انکار کی اس کے لیے ممانعت تھی۔ وہ کہتی تھیں۔

"جو جب کہوں گی۔ وہ تمہیں ماننا ہے۔ انکار نہیں کرنا۔ میں ماں ہوں۔ تمہاری خیر خواہ، میرے قدموں تلے بشارت جنت کی دی گئی ہے۔ باپ کے لیے ایسا کوئی انعام نہیں۔ میں ہمیشہ تمہارے لیے بہتری چاہوں گی۔ یاد رکھنا، کبھی شک نہ کرنا۔"

اس نے ان کی نصیحت گرہ میں باندھ لی تھی۔ اگر غلطی سے کبھی اس کے منہ سے کوئی بات ان کے خلاف نکل جاتی۔ امی کے دھوکے پیٹھ پر برستے۔

"چوں چاں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں کہوں، وہ تمہیں کرنا ہے۔ میں تمہاری خیر خواہ ہوں سمجھے! اس رشتے سے زیادہ کوئی چاہنے والا نہیں۔"

اس کی سماعت میں اس قسم کے جملے اتارے جاتے رہے۔ وہ عادی ہو گیا۔ کبھی سوچتا۔ میرا جس کام میں دل نہیں لگتا۔ امی وہی کرنے کو کہتی ہیں۔ مجھے فٹ بال پسند ہے۔ وہ کرکٹ کھیلنے پر مجبور کرتی ہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں۔ میری مرضی کیا ہے۔ وہ پہلے ہی

سرہلا کر کہنے لگتی ہیں۔
"فٹ بال میں کیا رکھا ہے۔ کرکٹ میں کمائی ہے۔ شہرت ہے بیٹا! یہ دور پیسے کا ہے۔ یاد رکھو، جس نے پیسہ کمایا اسے عزت بھی مل گئی۔ عقل سے کام لو۔ دولت مند باعزت کہلاتا ہے۔ پیسہ ہر چیز پر حاوی ہوتا ہے' ادب کرتے ہیں' ڈرتے ہیں لوگ' کرکٹ کھیلو' آج کل کرکٹ کے کھلاڑیوں کو خوب نوازا جاتا ہے۔ فائدہ دیکھنا چاہیے فائدہ۔"

وہ پوچھنا چاہتا تھا ایسے فائدے کا کیا فائدہ۔ پیسہ کیوں ہر چیز پر حاوی ہے' مگر وہ چپ رہا۔ امی کو سوالوں سے چڑ تھی۔ بحث بالکل پسند نہ تھی۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر حرف پتھر کی لکیر ہوتا' وہ اپنے اصولوں پر اٹل تھیں۔ نہ جانے وہ ان سے ڈرتا کیوں تھا۔ ان کے سخت لہجے سے' بڑے بڑے دانتوں سے' سرخ آنکھوں سے ابا سے کبھی ڈر نہیں لگا۔ بہت نرم مزاج شیریں زبان تھے۔ امی کی مرضی سے اس نے ایم بی اے کیا۔ وہ انجینئر بننا چاہتا تھا۔ امی نے کہا "انجینئر جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں' تم ایم بی اے کرلو۔"

پھر اسے جاب مل گئی۔ ثمو کی منگنی ہوئی اور ٹوٹ گئی۔ پتا نہیں کیوں امی نے منگنی پر خوب خرچا کیا۔ ٹوٹنے کے بعد بہت غصہ کرتی رہیں' مگر۔۔۔

پھر اسے ناعمہ پسند آگئی۔ اس کی سادگی اور معصومیت ان کے گھر کے طور طریقے' مگر وہ یہ بات گھر میں کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ خاموش محبت کے انجام سے بے خبر وہ سوچتا۔

گھر میں تبدیلی آنی چاہیے کچھ نہ کچھ' شاید ناعمہ کی بدولت ایسا ممکن ہو۔ ڈرائنگ روم کے پرانے صوفے برسوں سے ایک جگہ ہی رکھے ہیں' وہ اگر کھڑکی کے سامنے آجائیں۔ کھڑکی کے پردے بدل دیے جائیں۔ کچن کا بکھرا ہوا سامان سمٹ جائے۔ لاؤنج کے تخت پر سیاہ رنگ کی چادر بدل کر اگر سفید ڈال دی جائے۔ روشنی ہوجائے۔ ڈرائنگ روم میں ابا کے جوتے' اماں کی شال' بہنوں کے سویٹر نہ ہوں۔

اس نے گھر کی بے ترتیبی سے تنگ آکر دوستوں کو گھر بلانا چھوڑ دیا۔ وہ بہنوں کو ناعمہ کے گھر کی مثال دیتا وہ خفا ہوجاتیں' پھر امی کو اس کی شادی کا خیال آیا۔

"شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" انہوں نے بیٹے سے پوچھ لیا۔ وہ سٹپٹا گیا۔

"شادی۔۔۔ ابھی کیا جلدی ہے امی! ثمو کی تو ہوجائے۔"

"ہوجائے گی۔ ہم زاہدہ اور انور بھائی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ان کی بیٹی خوش شکل ہے۔ اکلوتی ہے۔ ان لوگوں کا اخلاق بہت اچھا ہے۔ پھر یہ کہ اپنا خاندان ہے۔ سوچ لو۔ تمہاری مرضی ہو تو ہم ذکر کریں۔"

عارف کے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ بمشکل اپنی خوشی چھپائی اور سوکھے منہ سے خشک لہجے میں بولا۔

"آپ کی مرضی۔" (کیا میرے دل کی خواہش چہرے سے پڑھ لی امی نے؟) وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ اگر امی کو میری اس خواہش کا علم ہوگیا تب کہیں وہ اپنے ارادے سے منحرف نہ ہوجائیں۔

ایسا بھی کئی بار ہوچکا تھا۔ جب بھی اس کا کسی چیز کے لیے یا کوئی کام کرنے کو دل چاہا۔ امی نے اس کو مختلف راستے کے لیے ہموار کرلیا۔ انہوں نے شاید طے کرلیا تھا کہ عارف کی مرضی کے خلاف ہی آرڈر دیں گی اور وہ اس آرڈر پر عمل کرنے کے لیے مجبور بھی ہوگا' مگر آج تو کمال ہوگیا تھا۔

امی اس کی زندگی کی اولین آرزو از خود ہی پورا کرنے والی تھیں۔ وہ اپنی خوشی چھپاتا ہوا باہر آیا۔ اب گھر میں ٹھہرنا مشکل تھا' بیٹ بال لے کر نکلا' مگر آج کرکٹ کھیلنے کا دن نہیں تھا کسی سے اس خوشی کا اظہار کرنے' جشن منانے کا دن تھا۔ ماں۔ پیاری ماں۔ دل خوش کردیا۔

طاہر کا گھر قریب تھا۔ سیدھا سادہ مخلص دوست۔ وہ کچھ مصروف تھا۔ اس کے گھر کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ بار بار اندر سے پکارا جاتا۔ "طاہر! ادھر آؤ۔" وہ اندر لپک جاتا۔ پھر آتا پھر بلا لیا جاتا۔

عارف نے کہا "اچھا یار! میں چلتا ہوں میری وجہ سے تم بھی بندھ گئے ہو۔ آوازیں پڑتی ہیں۔"

"بندہ خدا! میں کوئی ملزم یا مجرم نہیں کہ عدالت میں آوازیں پڑ رہی ہوں۔ فلاں حاضر ہو۔ اصل میں نانی اماں آئی ہیں فیصل آباد سے۔ ان سے ملنے شیخوپورہ والی خالہ بھی آگئیں۔ ان دونوں کی بحث چل رہی ہے بس۔ یہ ہے۔ مجھے بھی بلا کر گواہی طلب کی جاتی ہے۔" طاہر نے تفصیلی بیان دیا۔ عارف کو ہنسی آگئی۔

"دیکھا ثابت ہوا کہ اس وقت مقدمہ درپیش ہے۔ تب ہی گواہوں کی طلبی ہو رہی ہے۔"

"نہیں۔ یہ شرارت چھوٹی خالہ کی ہے۔ وہ مجھے ان کے معاملات سے باخبر رکھنے کے لیے آوازیں دیتی ہیں۔ مزے دار بحث ہوتی ہے خالہ اور نانی اماں کی۔ آؤ تم بھی چلو۔"

وہ اسے زبردستی اندر لے گیا۔ حالانکہ اس کی خالہ نانی کی بحث میں وہ کیا دلچسپی لیتا۔ لاؤنج میں تو محفل جمی ہوئی تھی۔ نانی اماں تخت پر بڑے شاہانہ انداز سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ طاہر کی امی سامنے کرسی پر' ان کے قریب شیخوپورہ والی خالہ' کونے میں ایک کرسی پر چھوٹی خالہ بیٹھی کھلکھلا رہی تھیں۔ طاہر نے نانی سے تعارف کرایا۔ انہوں نے گول عینک کے شیشے سے اسے گھورا۔ اس نے بہت ادب سے سلام کیا۔ خوش ہوگئیں۔

"جیتے رہو ہزار سال۔ نیک سرشت ہو۔ اللہ تمہاری مراد پوری کرے۔"

اس نے دل میں آمین کہا۔

"ارے رفو! بچے کو چائے وائے پلاؤ۔" نانی نے طاہر کی امی کو پکارا۔ "اور میں جو گڑ کے مرنڈے اور اندر سے لائی ہوں۔ وہ بھی کھلاؤ۔"

طاہر کی امی فوراً چلی گئیں۔ پھر چائے آگئی۔ اندرسے بہت لذیذ تھے۔ نانی اماں کی باتوں پر چھوٹی خالہ منہ دبا کر ہنستی تھیں۔ نانی اماں مسلسل خاندان والوں کے قصے سنا رہی تھیں۔

"ارے اس حامد کا کیا پوچھتی ہو جورو کا غلام۔ ماں کی پروا کرتا نہیں۔ بیوی کے اشارے پر چلتا ہے۔ ایسی اولاد کا نہ ہونا بہتر ہے۔ بھلا بتاؤ۔ ماں پیدا کرے' پالے پوسے اپنا پیٹ کاٹ کر اولاد کی پرورش کرے۔ بیماری میں رات رات بھر جاگ کر بچے کی دیکھ بھال کرے جوان ہونے پر شادی کے چونچلے پورے کرے اور وہ بیوی کے کہنے پہ ماں کو کونے میں ڈال دے۔ ہیں؟ لعنت ایسی اولاد پر۔ اس بیٹے سے بہتر تو بیٹیاں ہیں۔۔۔"

"اماں! میری بھی تو سنیں۔" شیخوپورہ والی خالہ دبی زبان سے بولیں۔ "میری ساس نے تو مجھے کونے میں ڈال دیا ہے۔ میرے میاں کو میرے خلاف بھڑکاتی ہیں۔ وہ بھی ماں کے کہنے میں آکر مجھے دس باتیں سنا دیتے ہیں کہ تم میری ماں کی عزت نہیں کرتیں۔ ان کی بات نہیں مانتیں۔" خالہ کی آواز بھاری ہوگئی۔

"تو غلط تو نہیں کہتے وہ۔" نانی اماں فوراً بول پڑیں۔ "تم نے کبھی میرا کہنا نہیں مانا۔ ساس کا بھلا کیا مانوگی۔ اگر اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر کاموں میں حصہ لو تو کاہے کو اعتراض ہو۔"

"اماں! مجھے کوئی کچھ کرنے دے تو کروں۔ وہاں تو میری ہر جنبش کو گرفت میں لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نوکر چاکر ہیں۔ مجھے کچھ کرنے کی کیا ضرورت۔ کبھی میاں کی فرمائش پر کوئی خاص ڈش بنالوں تو کوئی چکھنے کا روادار نہیں۔"

خالہ خاصی افسردہ ہوگئیں۔

"اور تو اور۔۔۔ دو ایک بار لاؤنج اور ڈرائنگ روم کی سیٹنگ بدلی تو وہ پھر پہلے جیسی کردی گئی۔ میری وہاں کسی کو ضرورت ہے نہ قدر' جس کا جو جی میں آئے سنا دیتا ہے۔ میں اف بھی کروں تو سب پیچھے پڑجاتے ہیں کہ میں ناشکری ہوں۔ بے صبری ہوں۔" آواز میں بھاری پن پیدا ہوگیا۔

"تو سچ کہتے ہیں۔ میں بھی تو یہی کہتی تھی۔" نانی اماں تیز لہجے میں بولیں۔ "کہ بیٹا صبر کرو' شکر کرنا سیکھو تم نے کب میری نصیحت پر عمل کیا' دیکھ لو پھر۔" لگتا تھا نانی اماں خالہ کی سسرال والی ہیں۔ "جب میری نہیں مانی تو سسرال والوں کی کیا مانو گی۔"

"آپ سے تو بات کرنی فضول ہے۔" خالہ بھڑک گئیں۔ پھر طاہر کی امی کی طرف مڑ کر بولیں۔
"آپا! تم سنو۔ آخر تم میری بہن ہو۔"
"کوئی ضرورت نہیں۔" نانی کو غصہ آگیا۔ "خبردار! جو ادھر کی ادھر لگائی تو۔ اپنے گھر کے مسئلے اپنے گھر میں سلجھایا کرو۔ ماں بہن کو دکھڑے نہ سنایا کرو اچھا اس طرح گھر اجڑ جاتے ہیں۔"
"اچھا۔" خالہ بگڑ گئیں۔ "پھر میری ساس سے بھی جاکر کہیں کہ ہر آئے گئے کے سامنے میری تعریفیں کرنا بند کردیں کہ میں پھوہڑ ہوں۔ بدتمیز ہوں۔ کچن میں غلطی سے بھی چلی جاؤں تو ہر چیز کا بیڑا غرق کردیتی ہوں۔ ڈرائنگ روم کی صفائی کرتے ہوئے کشن بھی ٹیڑھے رکھتی ہوں۔ کبھی کچھ دیکھا جو نہیں۔ یہ ہے میری قدر۔" کھڑی ہوگئیں نم دیدہ۔
"تو بھئی۔ وہ ہیں ہی بہت سگھڑ۔ انہیں تم میں کمی نظر آتی ہوگی۔ تم کوشش کرو کہ ان جیسا سلیقہ آجائے۔" نانی برابر کی جنگ کی قائل تھیں۔
"بس اماں! اصل بات تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے کچھ سکھایا ہی نہیں۔" خالہ چڑ کر بولیں۔ "یہی طعنہ سننے کو ملتا ہے سب سے۔ اب تو میں بھی مان گئی ہوں کہ یہی سچ ہے۔
واقعی آپ نے مجھے کچھ سکھایا ہوتا تو میری بھی قدر ہوتی۔" چھوٹی خالہ کھلکھلائیں۔ "اور آپا! وہ قصہ بھی تو سناؤ جب آپ کی ساس نے کہا کہ ایسی بہو لانے سے تو بہتر تھا کہ میں بیٹے کی شادی ہی نہ کرتی۔ مزے سے گھر میں راج کرتی۔ نہ بہو آتی نہ میں دل جلاتی۔"
"رہنے دو۔ اماں نے کبھی میری سنی ہی نہیں۔ وہ تو مجھے ہی موردالزام ٹھہراتی ہیں۔"
"بھئی ہم تو انصاف پسند ہیں۔ بیٹی ہو یا بہو۔" نانی لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔
"ہاں۔ ایک ہی لاٹھی سے ہانکتی ہیں سب کو۔" خالہ آزردگی سے طاہر کی امی کو دیکھنے لگیں۔
"آپا! وہ بہو صاحبہ۔ ان کو جھٹلاتی ہیں یہ چپ۔ آپ کے کپڑے وہ نہیں دھوتیں، الگ کردیتی ہیں، آپ چپ۔ رومال تک نہیں دھوتیں۔ وہ آپ کے لیے چائے نہیں بناتیں، آپ چپ۔ آپ کا مگ اور پلیٹ الگ کردیتی ہیں، آپ چپ۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ بہو کا ہر عمل سر آنکھوں پر۔ بیٹی قابل گردن زدنی۔"
"ہاں تو۔ جس بہو کو بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائی اس کے عیب کیوں ظاہر کروں۔ بھئی سب کا مزاج الگ ہوتا ہے۔ مجھے گھر میں انتشار پھیلانا پسند نہیں۔" مطمئن لہجہ تھا۔
"آپ کی پالیسی بھی سب سے الگ ہے۔ ہماری حکومت کی طرح کسی پر مہربان، کسی پر قہربان۔"
خفگی سے منہ موڑا تو چھوٹی خالہ کو ہنستے دیکھ کر بگڑ گئیں۔ "یہ تمہارے دانت کس خوشی میں نکلے پڑ رہے ہیں۔ زہر لگ رہی ہو۔" چھوٹی خالہ مزید ہنسیں۔
"تو مجھے کوئی فکر نہ غم۔ شکوہ نہ شکایت۔" چھوٹی خالہ نے داد طلب نظروں سے اماں کو دیکھا۔ وہ فخر سے چھوٹی کو دیکھنے لگیں۔
"ہاں آخر یہ بھی میری بیٹی ہے۔ اس کی سسرال سے تو مجھے کوئی شکایت نہیں ملی۔ آخر ہے میری تربیت۔" نانی اماں نے نظروں ہی نظروں میں بیٹی کی بلائیں لیں۔
شیخوپورہ والی خالہ چڑ گئیں۔ "ہاں جی۔ یہ بھی اماں کی انصاف پسندی کی حد ہے۔ ان صاحبہ کی ساس نہ سسر۔ جیٹھ نہ دیور۔ نند نہ نندوئی۔ اکیلا لڑکا ہے اور پھر فخر کہ کوئی شکایت نہیں ملی۔ کون کرے گا شکایت۔ یہ وہ داماد جو آپ کی زیر سرپرستی ہے؟"
"آپا! آپ کے تو میاں بھی آپ سے خوش نہیں۔ وہ بھی آپ کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔"
"ہاں بہن! میں تم جیسی خوش نصیب نہیں ہوں۔" خالہ آزردہ ہوگئیں۔ "مگر۔ میں پوری کوشش کروں گی خود کو اس ماحول اور اس فیملی کے لائق بنانے کی۔ خواہ میری جان ہی چلی جائے۔ میں جانتی ہوں سسرال ہو یا میکہ۔ کہیں بھی میرا کوئی ہمدرد نہیں۔ اچھا آپا! میں چلتی ہوں۔"

وہ کھڑی ہوگئیں اداس غم زدہ، عارف کو ترس آرہا تھا۔
"ارے۔ ابھی کیسے۔ تھوڑی دیر بعد چلی جانا۔ کچھ تو ٹھہرو۔" طاہر کی امی نے محبت سے کہا۔
"نہیں آپا! دیر ہوگئی تو میرے لیے مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔ وہ بڑی بی میری تلاش میں ہر طرف گھوڑے دوڑا دیں گی تاکہ ایک نئے الزام کے ساتھ مجھ سے چھٹکارا پانے کا موقع ملے۔ ایسا وقت میں آنے نہیں دیتی۔" کہتے ہوئے وہ اپنی اماں کے سامنے جھکیں۔ نانی نے ان کا ماتھا چوما اور کہا۔ "ہاں بیٹا! یہی سمجھ داری تمہارے کام آئے گی۔ جاؤ اللہ کی حفاظت میں۔" خالہ سیدھی ہوئیں تو ان کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔
"اچھا ہوا تم آگئیں۔ تم سے مل لی ورنہ قلق رہ جاتا۔" نانی ان کی پیٹھ چھو کر بولیں۔
"ہاں میرے گھر آنے کی تو آپ نے قسم کھائی ہوئی ہے۔ پیروں کی مہندی چھوٹ جاتی۔"
"تو یہ گھر میرے بھتیجے کا ہے۔ اس لیے آجاتی ہوں۔"
"بھتیجا۔ جس کے گھر میں آپ کی بیٹی رہتی ہے۔ خیر مجھے تو آپ نے اپنی اولاد کے زمرے سے نکال ہی دیا ہے۔ اس لیے شکوہ کیا کروں۔ مرگئی تو شاید شکل دیکھنے کی فرصت مل جائے۔"
بھاری گلے کے ساتھ وہ آگے بڑھ گئیں۔ طاہر کی امی ان کے پیچھے جانے لگیں تو نانی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔
طاہر خالہ کے پیچھے نکل گیا۔ عارف حیران حیران بیٹھا رہ گیا، پھر اسے یہاں رکنا نامناسب لگا تو سلام کرکے وہ بھی باہر آگیا۔ خالہ بھانجے میں کوئی بحث ہو رہی تھی۔ طاہر کہہ رہا تھا۔
"خالہ! میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔" وہ روئی روئی آنکھوں سے گردن انکار میں ہلا رہی تھیں۔
"نہیں طاہر! ٹیکسی لادو۔ ٹیکسی سے بس اسٹاپ۔ بس سے شیخوپورہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"
"پھر آپ اندر بیٹھیں۔ میں لے آتا ہوں ٹیکسی۔" طاہر مجبور لہجے میں بولا۔
عارف نے آگے بڑھ کر کہا۔ "چلو طاہر! ہم خالہ کو چھوڑ آتے ہیں۔"
"یار! تمہیں زحمت ہوگی۔" وہ تکلفاً جھجکا۔
"میرے پاس وقت کی کمی نہیں ہے، تکلف نہ کرو۔"
طاہر خالہ کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے کچھ رک کر کہا۔ "تمہارے ساتھ تو ٹھیک ہے۔ مگر۔"
"ایسا کرو طاہر! بھابھی کو ساتھ لے لو۔" عارف خالہ کی ہچکچاہٹ سمجھ گیا۔
طاہر اندر دوڑ گیا۔ خالہ کچھ شرمندہ سی تھیں۔ "وہ اصل میں چھوٹی جگہ کے رہائشی ہیں۔ شہروں کے طور طریقے پسند نہیں۔ میری سسرال والے ذرا پرانے خیالات کے ہیں۔ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔"
"بہت اچھا کرتی ہیں آپ۔" عارف نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ طاہر کی بیوی تیز قدموں سے آئی۔ "خالہ! میں نہانے چلی گئی تھی، آپ باہر آگئیں عارف بھائی! السلام علیکم! یہ خالہ بہت جلد باز ہیں۔" طاہر کی بیوی ہنس مکھ تھی۔
شیخوپورہ میں خالہ کے گھر پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ خالو خود باہر آگئے بصد اصرار سب کو اندر لے گئے طاہر نے انہیں بتایا کہ ایک دوست نے چائے پر مدعو کیا ہے سب دوستوں کو۔ عارف کے ساتھ آنا تھا تو خالہ کو بھی لے آئے حالانکہ نانی انہیں روک رہی تھیں۔ مگر یہ رکنے پر تیار نہ ہوئیں۔ ڈرائنگ روم میں جاکر بیٹھے تو سب گھر والے وہیں آگئے کرید کرید کر سوالات کرنے لگے۔ عارف اور طاہر تو خالو اور ان کے بھائی سے محو گفتگو تھے۔ خالہ کی ساس طاہر کی بیوی سے پوچھنے لگیں۔
"دوست کا کیا نام ہے۔ کہاں رہتا ہے؟"
"میں ادھر کبھی نہیں آئی اس لیے مجھے کچھ پتا نہیں۔" اس نے بہانہ بنایا۔
طاہر کھڑا ہوگیا۔ "سوری خالو! دوست انتظار

کر رہے ہوں گے، چلتے ہیں۔

"تم لوگ تو دوست کے ساتھ باتیں کرو گے۔ یہ بے چاری کس سے مغز ماری کرے گی۔" خالہ کی ساس نے طاہر کی بیوی کو دیکھ کر کہا۔

"سب دوست بیگمات کے ساتھ آرہے ہیں۔ عارف بے چارہ ابھی اکیلا ہے۔ اس کی فکر ہے۔ کیسا لگے گا اکیلا، اداس بلبل۔" طاہر مذاق کرنے لگا۔ خالو نے ہمدردانہ انداز میں اسے دیکھا۔

"چلو۔ کروا دیتے ہیں ان کی شادی۔ لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔"

"میں ایک فیملی کو جانتی ہوں۔ چھ بیٹیاں ہیں جس کو پسند کرلے۔ اسی سے کروا دوں گی۔ آج بھی دکھا سکتی ہوں۔" خالہ کی ساس پرجوش انداز میں آگے آئیں۔ خالہ تو اندر آکر غائب ہوگئی تھیں۔ وہ لوگ باہر نکلے۔ محلے سے باہر نکل کر طاہر نے ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کیا۔

"اف! خالہ کی ساس کی ٹٹولتی نظریں۔"

"اور چبھتے ہوئے سوال۔ مجھ سے یوں مخاطب تھیں جیسے تفتیشی افسر ہوں۔"

"اور مغز ماری کا لفظ تو میرے ذہن میں تیر کی طرح چبھا۔" طاہر کی بیوی بولی۔

"اسی گھٹی ماحول میں خالہ چھ سال سے گزر کر رہی ہیں۔ توبہ ہے حوصلہ ہے خالہ کا بھئی۔"

"ان کی ساس باہر تک اسی لیے آئی تھیں کہ عارف بھائی کے متعلق معلومات حاصل کریں اور خالہ کو تنگ کرنے کا موقع ملے۔"

عارف بھونچکا ہوگیا۔ "ہائیں۔ کیا مطلب؟ میری طرف سے مشکوک تھیں کیا؟"

"بس۔ ایسی ہی بات ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں انسان کا پوسٹ مارٹم کرلیتی ہیں۔ اپنی مرضی کی رائے قائم کرکے کچوکے لگاتی ہیں۔"

عارف کو افسوس ہوا۔ "یار! مجھے تو علم نہ تھا۔ تم نے ہی بتا دیا ہوتا۔ اب پتا نہیں خالہ سے کیا کہہ دیں۔ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہوجائے۔"

"خالہ بھی اب مضبوط ہوچکی ہیں۔ خالو ہیں ان کی پشت پر، چلو کہیں چائے پی لیں سامنے ہوٹل ہے۔" طاہر صاف ٹال گیا۔

"اچھا۔ تو بے چارہ خود ساختہ دوست انتظار ہی کرتا رہے۔ یہ تو زیادتی ہے۔"

ہنستے بولتے راستہ کٹا۔ عارف کو خالہ کی فکر تھی نانی کا رویہ بھی عجیب تھا۔ مگر وہ طاہر سے کچھ نہ کہہ سکا۔ کیا کوئی ماں اتنی سنگدل ہوسکتی ہے، وہ بھی ایک دکھی اولاد کے لیے۔ خالہ کا صبر اور تحمل بھی کمال کا ہے بے چاری۔ طاہر کی بیوی کا خیال تھا کہ خالہ کی ساس باہر تک آکر عارف بھائی کے بارے میں مزید معلومات کو آخری بیچ دینے کے مرحلے سے گزرنا چاہتی تھیں، مگر ہماری جلد روانگی کی وجہ سے ان کو موقع نہ ملا۔ آخر وہ عارف کو کیوں ٹٹول رہی تھیں۔ اس کا جواب تھا۔

"تاکہ وہ خالہ کو ایک نئے الزام میں پھنسا سکیں۔"

وہ گھر سے نکلا تھا دوست کے ساتھ اپنی خوشی بانٹنے۔ الٹا بوجھ لے کر آگیا۔

☼ ☼ ☼

کئی دن بعد اسے بہن نے بتایا۔ "بھائی! آپ کا رشتہ ناعمہ سے طے ہوگیا ہے۔"

اب وہ اس بے پایاں خوشی کا اظہار کیسے کرے۔ بمشکل تاثرات چھپا کر نماز کے لیے مسجد چلا گیا۔ سجدہ شکر ادا کیا اور کافی وقت وہاں گزار کر گھر آیا۔

ناعمہ کے گھر والے شادی کے لیے مہلت مانگ رہے تھے۔ لڑکی زیر تعلیم تھی۔ دو سال میں تعلیم مکمل ہوجائے گی۔ مگر عارف کی امی تو کمال کررہی تھیں۔ عارف کی دلی خواہش کے مطابق انہوں نے کہا۔

"ہم پڑھائیں گے۔ میں نے بھی شادی کے بعد تعلیم مکمل کی تھی۔"

اس وقت ماں کی بلائیں لینے کو دل چاہا۔ گفتگو، بحث مباحثہ، شادی طے ہوگئی۔ اس وعدے کے ساتھ کہ پڑھائی جاری رہے گی۔ شادی کے دن سب رشتے داروں کی رائے تھی کہ اتنی حسین، پری چہرہ بہو آج

تک خاندان میں نہیں آئی۔ عارف بے حد خوش تھا۔ ممانی نے اس کی خوش قسمتی پر مبارک باد دی تھی۔

ناعمہ سیدھی سادی کم عمر لڑکی تھی۔ بہت جلد گھل مل گئی۔ ثمو ثمرا سے دوستی ہوگئی اور اس دوستی کا فائدہ ثمو ثمرا نے وصول کیا۔ ناعمہ کے سینڈل چپلیں، چوڑیاں، ٹاپس، میک اپ کا سامان، سب پر قبضہ جماتی گئیں۔ کبھی کسی پارٹی، فنکشن کے لیے ناعمہ کے سوٹ بھی مانگ لیتیں۔ واپسی کا کوئی ذکر نہ تھا۔

ناعمہ کو پروا نہ تھی۔ وہ بہت فراخ دل اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ نیک نیتی اسے ماں، باپ سے ملی تھی۔ وہ کسی کے بارے میں غلط انداز میں سوچتی بھی کیسے۔ اس کا ذہن بالکل صاف تھا۔

ایک دن اس کی ساس نے ناعمہ کا نیلے نگوں کا زیور کا سیٹ مانگا۔ انہیں کسی شادی میں جانا تھا۔ ناعمہ نے لاکر سے نکال کر انہیں دے دیا۔ وہ واپس کرنا بھول گئیں۔

کچھ عرصے بعد ناعمہ کو ضرورت پڑی۔ ان سے کہا تو وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"لے گئے۔ وہ تو میں نے اپنے لاکر میں رکھ دیا۔ اب تو بینک بند ہوگیا ہے۔ تم اور کچھ پہن لو۔"

"اور کچھ؟" وہ سمجھی نہیں۔ نیلے سوٹ کے ساتھ اور کچھ کیا پہنے۔ گھر میں تو چھوٹے موٹے ٹاپس بالیاں تھیں۔ روز مرہ پہننے کی۔ یونیورسٹی کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہیں پہنتی تھی۔ عارف کو اس نے بتایا۔ اس نے بھی امی سے کہا۔

"امی! آپ کو پتا تو ہے گھر میں کوئی زیور نہیں ہوتا۔ اگر آپ پہلے ہی سیٹ واپس کردیتیں تو۔ ناعمہ کو یاد رہتا۔ وہ لاکر سے نکال لیتی۔"

"بھئی۔ احتیاط کی وجہ سے رکھ آئی۔ تمہاری بیگم ادھر ادھر رکھ کر بھول جاتیں۔ چوری ہوجاتا۔"

امی کو بیٹے کی بات پسند نہیں آئی۔ عارف محسوس کررہا تھا۔ چپ ہوگیا۔ اس دن اپنی امی سے میچنگ سیٹ لے کر پہنا مگر واپس کرنے میں دیر نہ لگائی۔ فنکشن سے واپسی میں امی کو جگا کر ان کا زیور دے کر

پھر گھر آئی۔ صبح ساس نے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔

"کل بغیر کچھ پہنے چلی گئی تھیں کیا؟"

"امی سے لے آئی تھی۔ وہ بھی کل ہی بینک سے نکال کر لائی تھیں۔ انہیں آج کے فنکشن میں پہننا ہے۔ اس لیے رات کو واپس دے آئی۔"

سنتے ہی وہ بھنا گئیں۔ "اچھا۔۔۔ رات دو بجے انہیں واپس کرنے چلی گئیں۔ یہاں ڈاکو بیٹھے تھے۔ جو تمہاری ماں کا زیور کھا جاتے۔ اف! میں تو زیور لے کر پچھتائی۔ نہ میں لاکر میں رکھتی۔ نہ مجھ سے چھپا کر یہ کام ہوتا۔ اف اللہ اتنی چالاکی۔ میرا بھروسا نہیں۔ ہم چور ہیں جیسے۔"

عارف چپ رہا۔ وہ حیران ضرور ہوا۔ امی اس بات کو کس پیرائے میں لے گئیں۔

☼ ☼ ☼

پھر رفتہ رفتہ امی کا رویہ بدل گیا۔ ان کے مزاج میں سختی آگئی۔ انہیں ناعمہ کی ہر بات میں اعتراض ہونے لگا اور انہوں نے عارف سے کہہ دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے فیس دینے کی۔ اس کی ماں دے گی۔ پڑھالے، ہمیں کیا۔"

"امی! پڑھ کر جاب کرلے گی۔ فائدہ تو ہمارا ہی ہوگا۔" دبی زبان سے اس نے کہا۔

"اچھا۔ اب تم کو جواب دینا بھی آگیا۔ خوب۔۔۔ بہت جلد میری توقع کے خلاف بیوی سے سبق سیکھا ہے۔"

"میں۔۔۔ تو۔۔۔ فائدے کی بات کررہا ہوں۔" وہ سٹپٹا گیا۔ "آپ ہی کہتی ہیں کہ۔۔۔ کمائی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر فیس دے کر نہیں۔ اس سے کہو۔ جتنا پڑھ لیا۔ کافی ہے۔ گھر بیٹھے اور گھر داری کرے۔ شام کو ثمو ثمرا کی طرح ٹیوشن پڑھائے۔ اس سے بھی کچھ نہ کچھ حاصل ہوجائے گا۔"

تابعدار فرزند نے یہ تجویز ناعمہ کے سامنے پیش کردی۔ وہ ہکا بکا ہوگئی۔

اگلے دن شوہر نامدار نے ماں کے آرڈر کے مطابق

پوچھ لیا۔ "کون سے سبجیکٹ پڑھاؤ گی؟"

وہ غلط فہمی سے اپنے معصوم شوہر کو دیکھنے لگی۔ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"میرا مطلب ہے۔ نمو' حمرا کو بتادو ناکہ وہ مزید اسٹوڈنٹ....."

وہ کچھ سنے بغیر باہر آئی تو ساس صاحبہ موجود۔

"تمہیں عارف نے بتایا نہیں۔ اب ہم تمہاری فیس نہیں دے سکیں گے۔ کافی پڑھ لیا اب گھر میں ٹیوشن....."

"آ.... آپ نے تو کہا تھا.... کہ....."

"بہت کچھ کہہ دیتا ہے بندہ.... ضروری نہیں اس پر عمل بھی کرے۔ تمہاری فیس دینے کی سکت نہیں ہے اب۔ شادی کا خرچا.... ولیمہ کا خرچا' پھر تمہارا.... وصول بھی تو ہونا چاہیے۔"

وہ ششدر رہ گئی۔ پھر انہیں جواب دیے بغیر باہر آئی۔ رکشا مل گیا۔ یونیورسٹی پہنچی۔ شام کو رکشا پر ہی اپنے ابا کے گھر جاکر اس نے اس سمسٹر کی فیس کا مطالبہ کردیا۔ ابا حیران ہوگئے۔

"مگر بیٹا! شادی کے بعد یہ ذمے داری عارف کی ہے۔"

"ابا! آپ سمجھ لیں۔ میری شادی نہیں ہوئی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ماں' باپ ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر رہ گئے۔ عارف کا فون آیا۔ اس نے بھرے گلے سے کہہ دیا۔

"آج رات یہیں رکوں گی۔ کل یونیورسٹی سے گھر آجاؤں گی۔"

فون بند کردیا۔ اگلے دن امی کے ساتھ یونیورسٹی جاکر فیس جمع کرادی۔ شام کو گھر گئی تو ساس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

"بغیر بتائے اماں کے گھر پہنچ گئیں۔ کوئی تمیز ہے تمہیں۔ پوچھنا تو چاہیے تھا۔"

"کئی دفعہ یونیورسٹی سے امی کے گھر گئی ہوں اور عارف کو میں نے بتادیا تھا۔" وہ اب بے فکر تھی۔

ساس کا منہ تانبا بن گیا غصے' اشتعال سے۔

"اچھا.... میری کوئی حیثیت نہیں تمہارے نزدیک۔ یادرکھو! میں اس گھر کی سربراہ ہوں۔ تمہیں مجھ سے اجازت لینی چاہیے تھی۔ آئندہ خیال رکھنا اور میں نے کل تم سے جو بات کی تھی۔ تم نے اپنی ماں سے صلاح مشورہ بھی کیا ہوگا۔ برا تو مانا ہوگا مگر ہماری بھی مجبوری ہے۔ پھر انہوں نے کیا کہا؟"

"فیس جمع کرادی انہوں نے۔" کہہ کر وہ کمرے میں چلی گئی۔

عارف کے آتے ہی اسے پکڑ کر ناعمہ کی خودسری اور نافرمانی پر لیکچر دیا۔ وہ پریشان ہوگیا۔ فیس کے معاملے میں ندامت بھی ہوتی۔ شادی سے پہلے امی' ابا کی یقین دہانی کے باوجود خود اس نے بھی ناعمہ کے ابا کو تسلی دی تھی کہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ ناعمہ کی فیس دے سکے۔ بہنوں کو بھی اسی نے پڑھایا تھا۔ مگر اپنی امی سے وہ ایسا کہہ کر ایک نئی بحث کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ آخر انہوں نے بھی تو اسی وعدے پر شادی میں جلدی کی تھی۔

یہ راز بھی جلد ہی ظاہر ہوگیا کہ انہیں جلدی کیوں تھی۔

ایک دن حمرا کسی کو فون پر بتارہی تھی کہ خالہ اپنی بیٹی سے بھائی کی شادی چاہتی تھیں۔ ان کی تنک مزاج موٹی بھفسلو کلوپری بھلا بھائی کے ساتھ کیا اچھی لگتی۔ بھائی تو حسن پرست ہیں۔ اسی لیے اماں نے جلدی جلدی بھائی کی شادی کردی۔ اس سے پہلے کہ خالہ کچھ زور دیتیں۔ خالہ کو شادی کارڈ پہنچ گیا۔ بے چاری اپنا سامنہ لے کر رہ گئیں۔ دکھ تو بہت ہوا۔"

اب ناعمہ کی ساس نے پینترا بدلا۔

"عارف! مہارانی سے کہو' یونیورسٹی سے آکر منہ چھپا کر کمرے میں نہ بیٹھ جایا کرے۔ گھر کے کاموں میں حصہ لیا کرے۔ میری بیٹیاں اس کی نوکر نہیں ہیں کہ میز لگائیں اور وہ کھاپی کر ہاتھ جھلاتی کمرے میں گھس جائے۔"

وہ جانتا تھا۔ ناعمہ اکثر میز بھی لگاتی۔ برتن بھی سمیٹتی تھی۔ رات گئے تک پڑھتی۔ کمپیوٹر کے سامنے

بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ جاتی۔ پھر اکثر صبح بغیر ناشتا کیے یونیورسٹی چلی جاتی۔ وہاں سے تھکی ہوئی آتی ہے۔ نیند سے بدحال بستر پر گر کر سو جاتی۔

مگر عارف امی کے سامنے صفائی نہیں دے سکتا تھا۔ نہ جانے وہ کیا نتیجہ اخذ کرتیں۔ بات کو دوسرا رنگ دینے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ کبھی اس نے کوئی حمایت میں بات کی، وہ بگڑ جاتیں۔

"بیوی نے بولنا سکھا دیا۔ اللہ کی شان ہے۔ یاد رکھو! تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ بڑی منتوں، مرادوں کے۔ خون جگر پلا کر پالا ہے میں نے تمہیں۔ اس چھٹنکی نے ماں کے خلاف بھڑکا دیا ہے تمہیں۔ اس کے اشارے پر چلے تو دودھ نہیں بخشوں گی۔ وہ ایک محنتی ماں کا بھلا کیا مقابلہ کرے گی۔ جو کہے، اس کان سنو، دوسرے سے اڑا دو۔"

وہ گردن ہلاتا رہتا۔ بہت فرماں بردار تھا۔ بولنے پر پابندی تھی۔ ورنہ صفائی تو دیتا۔ ہر موقع پر ان کی دھمکی۔ "دودھ نہیں بخشوں گی۔" اس نے کبھی زبان نہیں کھولی، ورنہ کہتا۔ "آپ نے دودھ پلایا ہی کب۔"

دادی کو یہی شکوہ رہتا کہ دلہن نے کسی بچے کو دودھ نہیں پلایا۔ بے چارے بچے اوپری دودھ پر نوکروں کے ہاتھوں پلے۔ منتوں، مرادوں کی بھی نوبت کب آئی۔ شادی کے سوا سال بعد ہی تو وہ ٹپک پڑا تھا۔ امی کو یہی قلق تھا۔ کہتی تھیں۔

ان کی کوئی خوشی پوری ہوئی، نہ خواہش، نہ سیر و تفریح ہو سکی، نہ پکنک، پارٹیاں، ہوٹلوں کا شوق بھی ادھورا رہا۔ سارے ارمان دل کے دل میں رہ گئے۔

طبیعت اتنی خراب رہی۔ الٹیوں نے مہینوں بے حال رکھا۔ کیا پورے ہوتے شوق۔

بچے پسند نہ تھے۔ جاب میں رخنے ڈالنے ہر دو سال بعد آ جاتے ہیں۔ اسی غصے میں ڈبے کے دودھ پر پالا۔ جاب نہیں چھوڑی جا سکتی تھی۔

"پاگل نہیں تھی کہ لگی لگائی آمدنی کو لات مارتی۔" یہ خود ان ہی کے الفاظ تھے۔

دادی نے بتایا تھا کہ تمہاری امی سب بچوں سے نالاں تھیں۔ مار پیٹ کر کے غصہ گرمی کا اظہار کرتی تھیں۔ زیادہ وقت دادی ہی بچوں کو سنبھالتی تھیں۔

جب وہ دس سال کا ہوا۔ دادی فوت ہو گئیں۔ بچوں نے بہت غم کیا۔ عارف بڑا تھا۔ اس نے بہنوں کو سنبھالا۔ پھر وہ خود تینوں اپنا خیال رکھنے لگے۔ کوئی مسئلہ ہوتا تو ابا زندہ باد۔

ابا نے زندگی بہت محتاط گزاری۔ بے حد محنت کر کے پوزیشن بنائی تھی۔ تینوں بچے ابا کے اشاروں پر عمل کرتے تھے کہ وہ بھی تو ان کی ہر فرمائش پوری کرتے۔ وہ سولہ سال کا تھا۔ تب امی کو بچے یاد آئے۔ اس دوران وہ اپنی تمام خواہشات پوری کر چکی تھیں۔ سیر و تفریح، پارٹیز، ہلا گلا، ملنا ملانا، ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا پھر انہیں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اکلوتا بیٹا ہے ہاتھ سے نکل گیا تو انہیں بہت نقصان ہو گا۔ بس انہوں نے اس کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔

شروع شروع میں وہ بہت حیران ہوا۔ پھر وہ ان کی جا بے جا ناز برداری سے الجھنے لگا۔ اس نے انہیں جواب دینا شروع کیا تو وہ چونکیں اور خوب پٹائی کر کے دباؤ ڈالا۔ باتھ روم میں بند کر دیتیں۔ چھپکلیوں سے ڈراتیں۔ بہنیں بھی خوف زدہ ہو جاتیں۔ دراصل امی اس پر حاوی ہونا چاہتی تھیں اور وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گئیں۔ عارف ان کا غلام بن گیا۔ اسے جواب دینے کی اجازت تھی، نہ احتجاج کی۔ امی کا ہر اشارہ اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ خاموش بے زبان بلکہ بے جان مجسمہ تھا۔ صرف امی کے لیے۔ اس کی شادی بھی مجبوراً" یہاں کی گئی۔ خالہ کی موٹی، کالی، بدزبان، بدمزاج بیٹی سے اسے بچانے کے لیے۔

دراصل امی، بہت خوب صورت، بہو کی خواہش مند تھیں۔ بہن سے بگاڑ سے بچنے کا یہ طریقہ سب سے بہتر تھا۔ گو کہ ناعمہ ابھی کم عمر بھی تھی اور زیر تعلیم بھی مگر امی کی کوشش رنگ لائی اور وہ تقریباً" بے خبری میں اس کی دلہن بنا دی گئی۔ بے خبری اس لحاظ سے کہ امی کو علم نہ تھا کہ وہ عارف کی اولین آرزو ہے۔ دراصل ان کی خواہش ایک کم عمر، کمزور اور معصوم سی لڑکی کی تلاش تھی۔ جو ان کی فرماں بردار بن کر رہے۔ سر نہ اٹھا سکے۔ وہ شمو، حمرا سے بھی چھوٹی تھی اور کچھ بزدل بھی۔

پسندیدہ بہو میں امی کو یک لخت خرابیاں اور عیب نظر آنے لگے۔ اب وہ اکثر ناعمہ کو سامنے بٹھا کر لیکچر دیتی نظر آتیں۔ اس کو بھی بلا کر ناعمہ پر سختی کرنے کی تاکید کرتیں۔

"اس سے کہو ایک وقت کا کھانا پکایا کرے۔ دن میں تو دلدار پکا دیتا ہے۔ مگر کب تک۔ بہو کی بھی کچھ ذمہ داری ہوتی ہے۔ حمرا، شمو کہتی ہیں۔ اب ناعمہ کافی بدل گئی ہے۔ پہلے کی طرح اپنی چیزیں نہیں دیتی۔ آنا کانی اور بہانے کرتی ہے۔ ماں سے ہدایت لیتی ہو گی۔"

عارف نے امی کی حسب ہدایت ناعمہ سے بات کی۔ اس نے کھانا پکانے سے معذرت کر لی۔

"مجھے آتا نہیں۔ جو پکاؤں گی، کوئی کھا نہیں سکے گا۔ کیا فائدہ گوشت، سبزی ضائع کرنے کا۔ انٹرنیٹ سے چائنیز اور اٹالین ڈش بنا سکتی ہوں۔"

مگر امی کو غیر ملکی کھانے ناپسند تھے۔ "مہنگے اور بے مزا، پھیکے سیٹھے توبہ!"

اس معاملے میں بھی چپقلش رہنے لگی۔ شامت آئی عارف کی۔ دونوں طرف سے شرمندگی۔

پھر ناعمہ کی امی نے سمجھایا کہ اسے ساس کی خواہش کے احترام میں کچن میں دلچسپی لینی چاہیے۔ وہ کچن میں جانے لگی۔ اپنی امی سے پوچھ پوچھ کر کچھ پکا لیتی۔ عارف شرمندہ ہوتا۔ کیونکہ ناعمہ کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔

وہ اس کی مدد کے لیے خود بھی موجود ہوتا تو حمرا، شمو اسے بلا لیتیں بہانوں سے۔ انہیں بھائی کا کچن میں جانا پسند نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن ناعمہ نے عارف کو تاکید کی تھی کہ صبح اس کو جلد اٹھا دے۔

"کل میرا بہت اہم ٹیسٹ ہے۔ سویرے اٹھ کر کچھ تیاری کر لوں گی۔"

عارف نے اطمینان دلا دیا۔ صبح وہ اٹھا تو ناعمہ بھی جاگ گئی تھی۔ کچن میں کچھ کر رہی تھی۔

"تم تیار ہو جاتیں۔ مجھے جگا دیتیں۔ چلو۔۔۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ ناشتا آ کر کر لوں گا۔"

ناعمہ نے گردن انکار میں ہلائی۔ گویا نہیں جانا۔

"امی نے کہا ہے۔ آج رات کو ماموں، ممانی اور ان کے بیٹے، بہو کھانے پر آ رہے ہیں۔" اس نے افسردگی سے نہ جانے کی وجہ بتائی۔

"تو۔۔۔ تمہیں تو کھانا نہیں بنانا۔ دلدار بنائے گا۔ کچھ امی کر لیں گی۔ اپنا نقصان کیوں کرتی ہو۔ چلو، تیار ہو جاؤ۔"

"مگر وہ امی۔۔۔ انہوں نے ہی مجھ سے چھٹی کرنے کا کہا ہے۔" وہ کشمکش کے عالم میں بولی۔ گویا جانا بھی چاہتی ہے۔ مگر ساس کی نافرمانی بھی نہیں کرنا چاہتی۔

"انہیں معلوم نہیں ہو گا کہ تمہارا ٹیسٹ ہے۔ خیر چلو، میں ان کو بتا دوں گا۔" بہت بہادر بن رہا تھا۔ نتیجے سے بے خبر نہ تھا مگر۔۔۔

"دراصل۔۔۔ انہوں نے مجھ سے کھیر بنانے کا کہا ہے۔" بے چارگی لہجے میں تھی۔

"ہو جائے گا سب۔ تم آ کر کر لینا۔ فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔"

وہ تیار ہو گئی۔ امی ابھی واش روم میں تھیں۔ شمو کو بتا کر وہ اسے یونیورسٹی لے گیا۔ واپس آیا تو امی کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ جلدی میں تھیں۔ شکر ادا کیا۔ جواب طلبی سے بچ گیا۔ دفتر سے آ کر دیکھا۔ گھر میں دعوت کی تیاری مکمل تھی۔ ناعمہ میز سجا رہی تھی۔ شمو، حمرا بھی مدد کر رہی تھیں۔ شام کو وہ ناعمہ پر برس پڑیں۔

"تم سے ایک کام کہا تھا۔ وہ بھی ٹال گئیں۔ یونیورسٹی جانے سے اسی لیے منع کیا تھا۔ آج چھٹی کر لیتیں تو کون سی قیامت آ جاتی۔ مگر تمہیں تو نافرمانی

کی عادت ہوگئی ہے۔ اب بتاؤ، کھیر پکنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ کب پکے گی ہم۔ کب ٹھنڈی ہوگی۔ کیا گرم گرم کھیر کھلا کر سزا دینی ہے مہمانوں کو۔"

"امی۔۔۔ اس کا بہت ضروری ٹیسٹ تھا۔ یہ تو رک گئی تھی۔ میں نے کہا کہ چلی جاؤ۔ پڑھائی کا نقصان نہ کرو۔ میں نے کبھی ثمو، حمرا کو ناغہ نہیں کرنے دیا اور کھیر میں لے آیا ہوں فضل سویٹ سے۔ آپ کی پسندیدہ۔" عارف فوراً "مدد کو پہنچا۔ "فریج میں رکھ دی ہے میں نے ٹھنڈا ہونے کے لیے۔"

امی نے آنکھیں پھاڑ کر بیٹے کو دیکھا۔ یہ جرأت، یہ مجال، بیوی کی صفائی میں اتنی وضاحت، ناقابل یقین۔

رات کو مہمان آگئے۔ سب نے ہنسی خوشی کھانا کھایا۔ فضل سویٹ والوں کی کھیر کی خوب تعریف ہوئی۔ جو امی کے اعلان کے مطابق ناعمہ نے بنائی تھی۔ ناعمہ کا حیرت سے منہ کھل گیا تھا۔ ماموں کے بیٹے نے معصومیت سے کہا۔

"واقعی بھابھی کمال کی ہیں۔ اتنی لذیذ کھیر بنا کر فضل کے ڈبے میں رکھ دی۔ چمچہ لینے گیا تو دیکھا۔ فضل سویٹ کا کھیر کا ڈبا پڑا تھا۔" ناعمہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا مگر سب ہنسنے لگے۔ عارف کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

"دراصل میں امی، بہو کے انتخاب کی داد چاہتی ہیں۔" عارف نے مزید گل افشانی کی۔

ممانی نے کہا۔ "واقعی لوگ تو بیٹیوں کی تعریف کرنا اور کروانا پسند کرتے ہیں۔ ہماری رخشی اپنی بہو کی خوبیوں کو دکھانا چاہتی ہیں۔ واقعی رخشی! تمہاری بہو لاکھوں میں ایک ہے۔"

ممانی کی بہن بھی اس کی تعریف کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ ماموں کی بہو نے بھی اس کے اخلاق اور سلیقے کی، حسن و نزاکت کی اتنی تعریف کی کہ وہ واقعی شرما گئی مگر اسے اچانک احساس ہوا۔ عارف کی امی کو ان لوگوں کی تعریف اچھی لگ رہی ہے نہ عارف کا مسکراتا چہرہ۔ کھانے کے بعد سب بیٹھے باتیں کرنے لگے۔

ناعمہ گرین ٹی بنانے اٹھی تو ارشد بھائی کہہ رہے تھے۔

"ویسے تم جیسا خوش نصیب بھی کوئی نہیں عارف! ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آیا۔ نہ بیچ میں سماج کی دیوار تھی نہ کوئی ولن آیا۔ اور دل پسند زندگی میں آگئی۔"

"ہاں۔ تو یہ سب امی، ابا کی کوشش سے ممکن ہوا۔ ورنہ میں نے تو سوچ لیا تھا۔ جو میرے رب کی مرضی۔۔۔"

عارف بہت خوش تھا۔ سب ناعمہ کی تعریف کر رہے تھے۔ ناعمہ مسکراتی ہوئی کچن میں آگئی مگر جب وہ گرین ٹی لے کر آئی تو خاموش تھی۔

☼ ☼ ☼
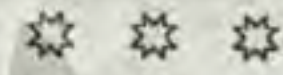
پھر تو روز ہی کوئی ناگوار بات ہو جاتی۔ امی کی تیوری چڑھ جاتی۔ عارف کو جھاڑ پڑتی۔ عارف اب سمجھ گیا تھا کہ امی کو علم ہوگیا ہے۔ اور وہ پچھتا رہی ہیں کہ عارف کی پسند کے بجائے اپنی پسند کی بہو کیوں نہ لے آئیں۔ مل ہی جاتی کہیں نہ کہیں۔ کسی ہلکے پھلکے گھرانے کی دبی دبائی ڈرپوک، کم تعلیم یافتہ۔ یہ انہوں نے فون پر اپنی دوست کو بتایا جو عارف نے سن لیا۔

"مجھے علم نہ تھا۔ عارف اسے پسند کرتا ہے۔ میں نے تو سوچا تھا۔ سیدھی سی لڑکی ہے۔ جدھر موڑوں گی مڑ جائے گی۔ اگر عارف اسے بانس پر نہ چڑھائے مگر عارف تو اس کا دیوانہ ہوگیا ہے۔ اب میں نے محسوس کیا۔ بیوی پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ ہائے! میں نے یہ کیا کیا۔ اتنی جلدی نہ کی ہوتی تو کوئی مل ہی جاتی۔ کسی کمتر خاندان کی دبی دبائی جاہل لڑکی۔ میرے قابو میں تو ہوتی۔ اب کیا کروں؟"

ابا سے انہوں نے کہا۔ "ہمارا منصوبہ ناکام ہوگیا میاں! لڑکا گیا ہاتھ سے۔"

نہ جانے وہ کیوں مایوس تھیں۔ عارف تو اب بھی ان کا فرماں بردار تھا۔ مطیع۔ حکم کا غلام۔

☼ ☼ ☼
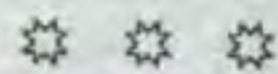
احد کے لیے ایک نئی پریشانی کھڑی ہوگئی۔ اس کی بہن جو اس کے سالے کی بیوی تھی۔ اچانک گھر آگئی۔ وہ بہن سے پوچھتا رہا۔ ہوا کیا ہے مگر وہ روئے جا رہی تھی۔ احد کی بیوی اس کے پاس بیٹھی اسے سمجھا رہی تھی۔ معلوم کرنا چاہتی تھی مگر وہ۔۔۔ آنسوؤں کے سوا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اماں شور مچا رہی تھیں۔ وہ برقعہ اوڑھے ٹیکسی کے انتظار میں دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ بہو نے دبی زبان سے پوچھ لیا۔

"اماں! کہاں جا رہی ہیں۔"

اماں آتش بپا ہو کر چیخیں۔ "نہ جاؤں؟ نہ پوچھوں؟ تمہاری اماں۔ تمہارے بھائی سے کہ میری بچی کا قصور کیا ہے؟ اس نے کس کو قتل کر دیا؟ کس پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے کہ اسے گھر سے نکال دیا۔ آخر گھر کی عزت کو چوکھٹ کے باہر کرنے کی کوئی وجہ تو بتائیں گے وہ۔ اندھیر نگری ہے؟"

احد اماں کو سمجھانے لگا۔

"اماں! ابھی رک جائیں۔ فارحہ سے پوچھنے دیں۔ وہ بتائے گی تب کچھ کریں گے۔"

"تم تو یہی کہو گے۔ یہی چاہو گے کہ فارحہ خطاوار نکلے۔ تمہاری ساس اور سالا دودھ دہی کے بنے ہوئے پاکیزہ معصوم لوگ ہیں شفاف۔ گندگی کی پوٹ تو تمہاری بہن ہے۔"

یہ بحث جاری تھی کہ عارف اور ناعمہ پہنچ گئے۔ عارف کو احد نے واقعہ بتایا۔ وہ جھینپا ہوا تھا۔ عارف بھی نا وقت آنے پر شرمندہ ہوا۔ یہ احد کا نہیں، اس کے گھر کا مسئلہ تھا۔ عارف کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ ناعمہ نے اماں کو تسلی دی اور فارحہ کے پاس آکر بیٹھی۔ اس کی بھابھی کو اشارے سے باہر جانے کا کہا۔ فارحہ، ناعمہ نے ایک ہی اسکول میں پڑھا تھا۔

سارا فساد اس کی ساس کا تھا۔ الزامات بھی عجب طرح کے تھے۔ جہیز کم ہونا۔ فارحہ کی کم آمیزی، ساس کی ہدایات پر عمل نہ ہونا۔ بے عقل۔ نندوئیوں سے الگ الگ رہنا، ان کی خاطر مدارت نہ کرنا۔ نندوں پر توجہ نہ دینا۔ غرضیکہ لمبی فہرست تھی اور غیر اہم، فضول۔ ناقابل برداشت مگر۔۔۔ لگتا تھا برداشت ساس میں نہ تھی اور بہو سے جان چھڑانا ہی ان کا مقصد تھا۔

ناعمہ نے احد اور اس کی بیوی سے بھی بات کی۔ انہوں نے بھی مان لیا کہ فارحہ کی ساس ضدی عورت ہیں۔ مگر احد کی اماں کو بھی سمجھایا کہ "ابھی صبر اور برداشت سے کام لیں۔ فارحہ کے میاں سے بات کریں۔ اسے کیا شکایات ہے۔ بڑوں کو بات چیت کر کے بچوں کو سمجھانا چاہیے۔ نہ کہ ضد میں آکر بیٹے کا گھر ہی اجاڑ دیں۔"

عارف اور ناعمہ بھاری دل کے ساتھ واپس گئے۔ کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ پتا چلا فارحہ کے شوہر نے طلاق بھیج دی۔ اس نے ماں کا حکم مان کر جنت حاصل کر لی اپنی محبت کی قربانی دے کر۔

عارف پریشان ہوگیا۔ "تم تو کہہ رہی تھیں معمولی شکایتیں ہیں؟" اس نے ناعمہ سے پوچھا۔ "مگر پھر اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا لیا۔ احد بہت پریشان ہوگا۔"

"میرا تو یہی خیال تھا کہ بات چیت کے ذریعے شکایتیں رفع ہو سکتی ہیں۔ مگر یہاں تو ضد کا مقابلہ تھا۔ پتا نہیں فارحہ کا کیا حال ہوگا۔ چل کر دیکھیں گے۔"

واقعی احد پریشان تھا۔ فارحہ کے مستقبل سے ہراساں۔ اس کی بیوی اس کے گھر میں تھی جبکہ بہن اجڑ چکی تھی۔ نہ ساس کو جھٹلا سکتا تھا، نہ بہن کے دکھوں کی تلافی کر سکتا تھا۔ سوگواری کی فضا تھی۔

احد کی بیوی بھی غم زدہ اور پریشان تھی۔ فارحہ کمرے میں بند۔ اماں مسلسل رنج و غم اور غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ انہیں فارحہ کے شوہر پر شدید غصہ تھا اور احد اور اس کی بیوی سے بھی شکایت تھی۔ اگر احد کی بیوی چاہتی تو اس کے بھائی کی ہمت نہ ہوتی گو کہ احد کی بیوی ماں اور بھائی کو سمجھانے کئی بار گئی۔ مگر۔۔۔ انسان ایک بار فیصلہ کر لے اور انسان جو ضدی بھی ہو پھر کب کسی کی سنتا ہے۔ ساس نے جو سوچا تھا کر کے دکھایا۔ بیٹے کا گھر اجاڑ دیا صرف اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب۔ احد کی بیوی رنجیدہ تھی اور

شرمندہ بھی۔ ساس کے ردعمل سے خوف زدہ۔ ایسے آمنے سامنے کے رشتے میں خطرے تو ہوتے ہیں۔

بظاہر فارحہ وہاں خوش تھی اور بھائی نے بھی کبھی فارحہ کی شکایت نہیں کی تھی۔ ہاں امی تھیں ناراض، وہ بس ذرا سی بات پر خفا ہو جاتی تھیں، لیکن نوبت علیحدگی تک پہنچے گی یہ امکان تھا نہ امید، لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ احد کی اماں کی ناراضی بجا تھی۔ انہیں بیٹے سے شکایت تھی۔ وہ بھی اپنی جگہ حق پر تھیں۔ بیٹی کا بسا بسایا گھر اجڑ گیا، صدمہ کم نہ تھا۔ وہ احد پر غصہ کر رہی تھیں جس نے معاملے کو معمولی سمجھا۔

"بھلا بتاؤ۔" وہ عارف کے سامنے ہی بولنے لگیں۔ "یہ نہ سوچا کہ بیٹی پر کیا اثر ہو گا۔ ارے جس گھر میں طلاق دے کر بیوی کو پہنچا دیا۔ وہاں ان کی بھی بیٹی رہتی ہے۔ داماد کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔" احد مسلسل اماں کی ہائے ہائے سن رہا تھا۔ چڑ گیا۔ پریشان خود بھی تھا۔ بول پڑا۔

"اماں! آپ چاہتی ہیں میں بھی ثنا کو طلاق دے کر ان کے گھر پہنچا دوں؟ آپ کہہ کر دیکھیں۔ میں بھی آپ کا فرماں بردار بیٹا ہونے کا ثبوت دے سکتا ہوں۔ مگر آپ ہر ایک کے سامنے رونا نہ روئیں۔"

اماں اچھل پڑیں۔ رنگ فق ہو گیا۔ ہول کر بولیں۔

"توبہ کر توبہ۔ احد ہوش میں ہے۔ میں کیا پاگل ہوں؟ جاہل عاقبت نا اندیش ہوں؟ جو یہ چاہوں گی میرے بیٹے کا ہنستا بستا گھر۔۔۔ میری بہو بیٹا خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔ بدلہ لینے کی میں قائل نہیں اور میں کیا تمہاری ساس کا مقابلہ کر سکتی ہوں؟ وہ تو ڈائن ہے، خون پینے والی ڈائن۔ لمبے دانتوں والی، بیٹے کی خوشیاں نگل گئی۔ بے قصور بہو کے ارمان چبا گئی اور اس زمان کو کیا کہوں۔ عقل کا اندھا۔ کان کا کچا۔ اپنا دشمن۔۔۔ اب روئے گا عمر بھر دیکھنا تم۔۔۔"

عارف بہت دل گرفتہ ان کے گھر سے آیا۔ احد پر بہت اثر تھا۔ فارحہ کا غم، فکر اور گھر پر اس حادثے کے اثرات۔

☼ ☼ ☼

عارف کو امی کا رویہ بھی اکھڑا اکھڑا لگنے لگا تھا۔ روز بروز وہ ناعمہ سے بے زار ہو رہی تھیں۔

جب کوئی آ کر ناعمہ کی تعریف کرتا ان کا مزاج برہم ہو جاتا۔ انہیں ناعمہ سے شکوے بڑھتے جا رہے تھے۔ عارف کی خوشامد بھی انہیں خوش کرنے میں ناکام تھی۔ اس کی ہر کوشش پر امی کا اشتعال بڑھ جاتا۔ وہ کس کو اپنا ہمراز بنائے۔ کس کو اندیشوں سے آگاہ کرے۔

"پہلی مثال دیکھی ہے کہ بیٹا سعادت مندی، فرماں برداری میں اتنا بڑھ جائے کہ اپنی زندگی خود تباہ کر لے۔ سنا ہے۔ زمان صاحب اب روتے ہیں، پچھتاتے ہیں۔" ایک دن ناعمہ نے بتایا تو وہ چونک گیا۔

"تمہیں۔۔۔ کس نے کہا۔ کس سے سنا تم نے۔" وہ بوکھلا گیا۔

"طاہر بھائی کی بیگم کے میکے والوں کے زمان کے گھرانے سے تعلقات ہیں، وہی بتا رہی تھیں۔"

عارف ہونق بنا کھڑا تھا۔ "تم کب ملیں طاہر کی بیوی سے۔"

"کلب میں میلاد شریف تھا۔ وہاں کئی خواتین ان ہی کا ذکر کر رہی تھیں۔ زمان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ان کی اماں شدید بیمار ہیں۔ ظاہر ہے احد بھائی ناراض ہیں تو ثنا بھابھی بھی میکے نہیں جاتیں۔ طاہر بھائی کی خالہ کو بھی ایسے مسائل کا سامنا ہے، مگر خالو ان کی حمایت کرتے ہیں تو حالات اتنے سنگین نہیں ثنا بھابھی خود روتی ہیں کہ ان کی ماں کی بلا جواز نفرت نے سب کچھ تتر بتر کر دیا۔ اب گھر کے دو افراد، دونوں کو ایک تیمار دار کی ضرورت۔ مگر۔۔۔ کون۔۔۔ ثنا بھابھی خواہ کتنا بھی چاہیں، احد بھائی انہیں جانے نہیں دیں گے۔ اتنا تو حق ہے ان کو اپنا غم غصہ کیسے ظاہر کریں؟"

عارف کی فکر بڑھ رہی تھی، کیسے امی کو سمجھائے۔ کیسے ناعمہ کو ہر حادثے سے بچا لے۔ ابھی تک تو وہ آہنی دیوار کی طرح ناعمہ کی حفاظت کر رہا تھا۔ مگر۔ امی کی بارودی سرنگیں۔۔۔ کہیں سب کچھ تہس نہس نہ کر دیں۔ وہ ناعمہ کو آنے والے طوفان سے خبردار

کرنا چاہتا تھا مگر کیسے؟ ناعمہ ساس کے غصے کا مسلسل شکار تھی۔ مگر اسے خطرہ نہ تھا۔ کوئی بھی ماں اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہے۔ جاہل تو تھیں نہیں۔ جب احد کی جاہل ماں ممتا سے لبریز ہے۔ بیٹے بہو کے لیے دعا گو۔ تو پڑھی لکھی ماں تو پھر عقل و فہم سے کام لیتی ہی ہے۔

پھر ناعمہ کے امتحان قریب آ گئے۔ وہ دل و جان سے پڑھائی میں منہمک ہو گئی۔ پوری پوری رات پڑھتی۔

ان ہی دنوں پھر امی نے ایک بڑی دعوت کا اہتمام کر ڈالا۔ گھر کی ملازمہ چھٹی پر چلی گئی۔ کام کا بوجھ ناعمہ پر آ گیا۔ وہ چپ رہی۔ مگر آدھی رات تک کچن سمیٹتے، برتن دھوتے کمر تختہ ٹانگیں شل ہاتھ دکھ جاتے۔ پڑھائی کا نقصان الگ۔ مگر وہ چپ رہی، کس سے شکوہ کرتی۔

عارف بھی سب کچھ دیکھ کر خاموش تھا۔ حمرا کے رشتے کے لیے لوگ آتے۔ ناعمہ کو ٹرالی سجا کر لانے کا آرڈر ملتا۔ حمرا مہمانوں کے سامنے بیٹھی کھلکھلایا کرتی۔

پھر ایک رشتے پر امی ابا کا اتفاق ہوا۔ اس دن لڑکے کو بھی بلایا گیا۔ حمرا کمرے میں مہمانوں کے پاس تھی۔ ناعمہ ٹرالی سمیت کچن سے نکلی۔ کمرے میں گئی۔ سب کو پلیٹیں دیں۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا کہ۔۔۔ بردکھوے کے لیے آنے والے رشتے کے امیدوار نے ماں کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کی بات پر ماں نے گردن ہلائی اور ببانگ دہل فرمایا۔

"ہمیں تو جی یہ والی لڑکی پسند ہے۔ یہی ہر دفعہ ٹرالی لاتی ہے۔ ہم کو اسی کا رشتہ چاہیے۔"

سکتہ طاری ہو گیا۔ امی نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا۔

"بہن! یہ میری بہو ہے۔ رشتہ تو میری بیٹی کے لیے دیا تھا آپ نے۔"

"بہن! بہانے نہ کریں۔ اتنی کم سن لڑکی بھلا آپ کی بہو کیسے ہو سکتی ہے۔ اس نے اس دن بتایا تھا یہ پڑھ رہی ہے۔ میرے بیٹے کے لیے یہی مناسب ہے۔ آپ کی وہ بیٹی تو عمر میں بڑی ہو گی۔ چلیں اگر یہ آپ کے کسی رشتے دار کی بیٹی ہے تب بھی ہمیں یہی چاہیے۔"

"ارے۔۔۔ میں آپ سے غلط بیانی کیوں کروں گی، بہو ہے میری۔ پوچھ لیں اس سے۔"

"قاعدہ تو یہی ہے کہ لڑکی خود ٹرالی لاتی ہے۔ ہم تو یہی سمجھے کہ اور عمر بھی اس کی کم ہے۔"

ناعمہ بحث سے جان بچا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے ہنسی آ رہی تھی۔ لڑکا کس قدر اپنائیت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عارف کو بھی اس نے قصہ سنایا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اب آئی شامت۔ امی نے اسی رات عارف کو بلا کر کہا۔

"ناعمہ کا اس لڑکے سے چکر ہے کوئی۔ یقیناً" یہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے ورنہ کون اس طرح کر سکتا ہے کہ حمرا کے لیے آئیں اور رشتہ ناعمہ کا دے جائیں۔ تم پتا کرو۔ مجھے تو تمہاری بیوی کے کردار پر شک ہے۔"

عارف دنگ رہ گیا۔ وہ توقع کر تو رہا تھا مگر امی کا دو ٹوک رویہ اسے سہما رہا تھا۔

اتفاق سے ناعمہ کے ابا اسے لینے آ گئے۔ ناعمہ کا ارادہ تو نہ تھا، مگر یہاں اس نئی بحث سے بچنے کے لیے وہ ابا کے ساتھ ان کے گھر آ گئی۔ امتحان کی تیاری بھی کرنی تھی۔

عارف نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ وہ چلی جائے۔ کیونکہ تایا، تائی حج کر کے آئے تھے۔ ان کے اعزاز میں ایک بڑی دعوت کا چرچا بھی تھا اور یقیناً" ناعمہ سے پھر دن رات مشقت لی جائے گی۔ ناعمہ انکار کر کے بری نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس لیے چپ چاپ ابا کے ساتھ چلی گئی۔ عارف نے اطمینان دلایا۔

"تم بے فکری سے تیاری کرو۔ چھٹی کے دن آ کر لے جاؤں گا۔ فون کرتا رہوں گا مگر ابھی گھر نہیں لے جا سکتا۔"

رات کو عارف نے فون پر بتایا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ امی بے حد طیش میں ہیں۔ حمرا کا اچھا بھلا رشتہ ناعمہ کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ وہ مسلسل

عارف کو آنکھوں کا اندھا' زن مرید' احمق گدھا کہہ کر اسے مشتعل کر رہی تھیں۔ حرا ابھی رو رہی تھی۔ ابا چپ تھے۔ گھر میں عجب طرح کی ٹینشن تھی۔

عارف گھر سے باہر آگیا۔ مگر کسی کو اپنی الجھن نہ بتا سکا۔

ناعمہ پڑھنے میں گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتی تھی۔ اب بھی یہی ہوا اسے ہوش نہ تھا۔ امی ابا سمجھ رہے تھے۔ عارف کا فون آتا ہوگا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح چکر نہیں لگایا۔ شاید مصروف ہوگا۔ ناعمہ کے ابا بھی دورے پر پشاور گئے ہوئے تھے۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ عارف نہیں آیا۔ امتحان ختم ہو گئے اور دوسرا زندگی کا امتحان سامنے تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔۔ بہت اچھے پیپر ہوئے تھے۔ شاندار کامیابی اس کی منتظر تھی۔

اب عارف کو آجانا چاہیے۔ مگر وہ نہیں آیا۔ وہ فون کر کر کے تھک گئی تب ہولناک خواب نے اس کو نیند سے بیدار کر دیا۔ عارف نہیں' اس کی جانب سے ایک لفافہ ضرور آگیا۔

طلاق۔۔۔ عارف نے اسے اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔ خوف' دہشت' صدمہ' صدمے کی انتہا۔۔۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ اتنی آسانی سے وہ یہ کام کیسے کر سکتا ہے۔ فون بند' فون بند' فون بند۔۔۔ عارف جانتا تھا وہ پاگلوں کی طرح اسے فون کر رہی ہے۔ وہ خود کب ہوش میں تھا وہ ماں کے حکم کے زیر اثر۔ ان کی بدگمانی' دودھ نہ بخشنے' معاف نہ کرنے کی دھمکی۔

"وہ اپنے ماں باپ کے اشاروں پر چلتی ہے۔ اسے اس گھر کے مسائل سے کیا واسطہ۔ وہ جب چاہیں گے تمہیں ہم سے الگ کر لیں گے۔ اس لڑکی کا کریکٹر بھی مشکوک ہے۔ خود ہی دیکھ لو۔ یہاں حرا کے لیے آنے والا لڑکا اس کو دیکھتے ہی اس کا مطالبہ کرنے لگا۔ کیوں؟ اور وہ اس معاملے سے جان بچا کر رفو چکر ہو گئی۔ یہ گھر بسانے والیوں کے وتیرے نہیں ہوتے۔ ضرور کچھ تعلق ہے اس کا۔ وہ لوگ اسی کے لیے آئے تھے۔ ارے! تمہیں اور بیوی مل جائے گی میری غلطی تھی کہ اس خاندان میں کروں۔ لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔"

"مگر۔۔۔ امی! اس کا قصور کیا ہے؟ اور مجھے تو اس سے کوئی شکایت نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تمہارے منہ میں اسی جادوگرنی کی زبان ہے۔ میں تمہاری زبان کاٹ دوں گی۔"

وہ احتجاج کرتا رہا۔ ابا سے فریاد۔ بہنوں کی منت' امی پر دورہ پڑ گیا۔ انہیں اسپتال لے جانا پڑا۔ ماں کے حکم سے سرتابی۔۔۔ اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ماں کی نافرمانی کی صورت میں وہ ان سے محروم بھی ہو سکتا تھا۔

اسے ماں بہت عزیز تھیں۔ اسے ناعمہ سے محبت تھی۔ وہ بڑا دکھی' مجبور اور غم زدہ تھا۔ فیصلہ کرنا بے حد دشوار تھا۔ تکلیف دہ' اذیت ناک' مگر اسے کچھ تو کرنا تھا۔ ماں کے حکم کی پابندی' ابا بھی مجبور تھے۔ ماں اسپتال میں بے ہوش اور پھر۔۔۔ کاغذات پر دستخط کرتے ہی سب کچھ ویسا ہو گیا۔ پہلے جیسا سب ٹھیک۔ امی زندہ سلامت' خوش باش۔ بہنیں خوشی سے پاگل۔ انہوں نے ناعمہ کے کپڑوں۔ سینڈلوں پر قبضہ کرنے میں منٹ نہ لگایا۔ ان کی تو عید ہو گئی۔ اس کے چھوڑے ہوئے چھوٹے موٹے زیورات جو سائیڈ ٹیبل کی دراز میں' ڈریسنگ ٹیبل پر' ادھر ادھر لاپروائی سے رکھتی تھی۔ سب ثمرہ' حمرا نے لوٹ لیے۔

عارف ماں کے قدموں میں بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ اس کا جہان لٹ گیا تھا' دنیا روٹھ گئی تھی' وہ بزدل تھا' کمزور' یا۔۔۔ نہ جانے کیا۔

وہ کمرا بند کر کے بیٹھ گیا۔ اسے اب کسی سے نہیں ملنا تھا۔ اسے ناعمہ کا نام نہیں لینا۔ یاد بھی نہیں کرنا مگر وہ کیسے بھلا پائے گا؟

اس کی چیزوں سے دل بہلانا چاہا تو دنگ رہ گیا۔ کمرا تو یوں خالی تھا جیسے وہ یہاں کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ کوئی دوپٹا نہیں' کوئی بالی' کلا کٹ۔۔۔ یا میک اپ کی کوئی چیز۔ آج ہی آج کمرا کیسے خالی ہو گیا۔ جیسے دل۔۔۔ ماں' بہنوں کی خوشیوں سے اندازہ ہوا' وہ فتح کا جشن منا رہی تھیں۔ وہ ہار گیا تھا۔ وہ جیت گئی تھیں۔ اس کے

ارمانوں کا خون کر کے کیا ملا؟

اب زندگی میں کچھ نہیں تھا۔ کوئی امنگ، کوئی خوشی، امید، آس۔ کمرا پیٹ پیٹ کر اسے بلایا جاتا۔ بہنیں چڑیلیں لگتی تھیں۔ کراہت ہوتی۔ مگر۔۔۔ کئی دن کئی راتیں گزر گئیں۔ ماں کے حکم پر باہر نکلنا پڑا۔

"بیٹا! کیا ہو گیا ہے۔" لپٹا لیا محبت سے۔ ماں تو ماں ہوتی ہے اور بس۔۔۔

"بیٹا! وہ ایک سزا تھی۔ بھول جاؤ اسے۔ تم ایک مشکل سے نکلے ہو۔ شکر کرو، تم سزا سے بچ گئے ہو۔ وہ بے وفا تھی، دغاباز۔" وہ سر نیچا کیے کھانا کھا رہا تھا۔

"امی! کمرے سے ناعمہ کی ہر چیز غائب ہے۔ کپڑے، زیور، جوتے، میک اپ کا سامان۔" وہ شاید کچھ سن رہا تھا یا شاید کچھ نہیں سن رہا تھا۔

"مت ذکر کرو ان عارضی چیزوں کا۔ وہ تمہاری کمائی کی چیزیں تھیں۔ حمرا، ثمرہ کا ان پر حق تھا۔ انہوں نے لے لیا۔ بس یہ یاد رکھو۔ تم نے ماں کے حکم کی تعمیل کر کے جنت کمائی ہے۔"

"جنت۔" وہ گردن ہلاتا رہا۔ بولنے کی عادت نہ تھی۔ سوال کی اجازت نہ تھی۔ بھلا ناعمہ کے کپڑوں، سینڈلوں، میک اپ کے سامان اور زیورات پر حمرا، ثمرہ کا کیا حق۔ وہ جو ناعمہ اپنے ماں باپ کے گھر سے لائی تھی۔

وہ پھر کمرا بند کر کے لیٹ گیا۔ کیسی نوکری، کیسا دفتر۔ کب ناعمہ کے والدین آئے اور کون کون آیا۔ اسے اب کسی سے غرض نہ تھی۔ کون کون امی کو سمجھانے آیا، اسے خبر نہ تھی۔ عارف تنہائی کے غار میں سزا جھیل رہا تھا بغیر کسی جرم کے۔ سعادت مندی اور اطاعت شعاری کی سزا۔ محبت کی، ارمانوں کی قربانی دے کر قید تنہائی۔ جو اس کا مقدر تھی۔

☼ ☼ ☼

ابا نے مہینہ بھر بعد فکرمندی کا اظہار کیا۔ امی نے لاپروائی سے کہا۔

"ارے بچپن ہے ابھی۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ شاک لگا ہے، سنبھل جائے گا۔"

مگر سنبھلنے سے پہلے کمرے کی تنہائی، محبوب سے جدائی، اندر ہی اندر گھلتے رہنے سے بیمار ہو گیا۔ ابا نے زبردستی اسے کمرے سے نکالا۔ گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے گئے۔ وہ بنچ پر بیٹھ گیا۔ ابا ڈاکٹر سے ملنے کمرے میں گھس گئے۔ وہ بے زار بیٹھا تھا۔ علاج کی خواہش نہ تھی۔ ضرورت ہی کیا تھی۔ اب صحت زندگی، خوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

یونہی سامنے سے آتے لوگوں پر نظر پڑی۔ "ارے یہ کیا؟ خواب یا حقیقت؟" وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر۔۔۔ بیٹھ گیا۔

"ناعمہ کو کیا ہو گیا ہے؟ اتنی نقاہت۔ اتنی کمزوری؟"

ناعمہ کو پکڑ کر لاتی ہوئی اس کی امی ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئیں۔ ناعمہ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بے حد لاغر ہو رہی تھی۔ اسے بھی۔۔۔ غم۔۔۔ جدائی کا صدمہ ہے۔ جو عارف کو لاحق ہے۔ ابا ابھی نہیں آئے تھے۔ ناعمہ ماں کے سہارے باہر آئی وہ اٹھ کر دوڑا۔ ناعمہ کے قریب آیا۔

ناعمہ نے اسے دیکھا۔ شناسائی کی ذرا سی رمق اس کی آنکھوں میں نہ تھی۔ اس کی امی نے بھی عارف کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ پھر وہ اس کمرے میں گھس گیا، جہاں سے ناعمہ نکلی تھی۔ ڈاکٹر اکیلی بیٹھی کچھ کاغذات دیکھ رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب۔۔۔ یہ۔۔۔ مریضہ جو ابھی یہاں سے گئی ہے۔" وہ بے دھیانی میں نہ جانے ڈاکٹر سے کیا پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔ ڈپریشن ہے اسے۔ دراصل اس کے شوہر نے بغیر کسی وجہ کے اسے طلاق دے دی ہے۔ وہ صدمے سے نکل ہی نہیں رہی۔ میں نے تو انہیں کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرنے کے لیے کہا ہے۔ ہم زخموں کا علاج کرتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کی طاقت صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہ بے الجھی ہوئی ہے۔ اسے کسی ہمدرد کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر بہت افسردہ سی تھی۔

پھر ابا اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ سوالات جوابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ علاج اور ٹیسٹ۔ دوائیں لے کر وہ گھر آ گئے۔ کوئی یہاں اپنا نہ تھا، اس کا دل اسپتال کے اس کمرے میں رہ گیا تھا۔ وہ بے وفا نہ تھی۔ وہ بھی عارف کی طرح بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔ اس کا بھی دل ٹوٹا تھا۔ ابا باہر امی سے الجھ رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔

"سب تمہاری ذلیل فطرت کی وجہ سے ہوا۔ ضدی عورت! میں نے اسپتال میں ناعمہ کو دیکھا۔ وہ بھی بیمار اور عارف کی طرح ڈپریشن کا شکار ہے۔ کیا ملا تمہیں دو دلوں کو جدا کر کے۔ دو زندگیاں تباہ کر دیں۔ کیوں؟ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔"

"ابا! اب کیا فائدہ۔ آپ کیوں چلا رہے ہیں۔ کاش! پہلے کبھی آپ نے امی کو سمجھایا ہوتا۔ اپنا حق، اپنا فرض ادا کیا ہوتا۔ سعادت مند شوہر بنے رہے۔ مرعوب رہے۔ امی کی تعلیم، ان کی جاب، ان کی کمائی، وہ فخر کرتی رہیں۔ آپ اس فخر کو جلا دیتے رہے۔ پھر اب کیا ہو گیا۔ بیٹے کا دل ہی ٹوٹا ہے۔ قربانی دی ہے اس نے۔ خراج ادا کیا ہے۔ پوری زندگی بھسم کر دی۔ تو کیا؟ ماں کو خوش کر دیا۔ فتح کا جشن منا رہی ہیں۔" وہ کسی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ پھر یک لخت لائٹ چلی گئی۔ اسے تاریکی سے خوف آتا تھا۔ دروازہ کھولا۔ کسی نے گیلری میں موم بتی روشن کر دی۔ کوئی موم بتی لے کر اس کی طرف آ رہا تھا۔ پیلی روشنی نے ماں کے چہرے کو ایک منٹ کے لیے روشن کیا۔ وہ موم بتی قریب آ رہی تھی۔ ہیولا اس کے نزدیک آ رہا تھا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔

الجھے بالوں لمبے دانتوں والی ڈائن۔

"بیٹے اندر چلو۔" ڈائن نے کہا۔ وہ لڑکھڑایا۔ دیوار کا سہارا لیا۔ موم بتی ڈائن کے ہاتھ سے گر گئی۔ وہ چیخی۔ "کیا ہوا؟"

ڈائن نے اسے پکڑ لیا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

"یہ مجھے کھانے آ رہی ہے۔ لمبے دانتوں سے نوچ نوچ کر کھا لے گی۔"

بس پہلا خیال یہ ہی آیا اور اس نے گر کر بے ہوش ہونے میں دیر نہ لگائی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ماں ڈائن۔ بہنیں چڑیلیں اس سے لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ اب اس نیند سے جاگنا نہیں چاہتا تھا۔

دل ٹوٹا تھا اور ٹوٹے دل کا علاج صرف اللہ کے پاس ہے۔ اللہ کے حضور دست بستہ حاضر تھا۔

"میرے اللہ! مجھے معاف کر دے۔" اب فیصلہ اس قادر مطلق کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہوش میں آ گیا۔

اور اب اس کو تنہا زندگی گزارنی تھی۔ صرف اپنے ساتھ۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ وہ جانتا تھا۔ انسان کمزور ہے اس کے ارادے کمزور ہیں لیکن۔۔۔ جب دل خالی ویران کھنڈر ہو جائے پھر وہاں الو بولتے اور چڑیلیں بسیرا کر لیتی ہیں۔

اس نے ڈائن کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼
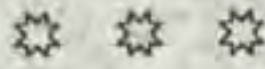
وقت کا کام ہے گزرنا اور وہ گزر رہا تھا۔ عالم بے خودی میں یا بے حسی کے حصار میں نہ جانے کتنے مہینے کتنے سال گزر گئے۔ تنہائی، بے زاری، بے خودی بھلانے کی کوشش۔۔۔ پھر ایک دن ثمو، حمرا اور امی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ ہنسی قہقہے، آوازیں، پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا یا گھر سے لاتعلقی کے سبب کچھ سننے کی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آفس سے آ کر ہر طرف سے بے خبر ہو کر۔۔۔ کیا اس نے احتجاج ہی رقم کرنا تھا صرف۔۔۔ احساس دلانے کے لیے اپنی برباد زندگی کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے یہ رویہ ناکافی تھا۔ انہیں تو اپنی خواہشوں کی تکمیل کے سوا شاید اور کسی بات سے غرض نہ تھی۔ آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔ اپنا آپ مار کر، خود کو برباد کر کے، دل کو ویران بنا کر دوسروں کو خوشی دینا کتنا اذیت ناک مرحلہ ہوتا ہے۔ انسان زندہ رہتے ہوئے اندر سے تقریباً "مر جاتا ہے۔

"امی! پرسوں میں نے لبرٹی میں ناعمہ کو دیکھا۔" ثمو کہہ رہی تھی۔ "وہ تو لگتا تھا شادی کی شاپنگ کر رہی ہے۔ ایک لڑکا ساتھ تھا اور ناعمہ کی امی کے علاوہ ایک

لڑکی اور بھی تھی۔ سب لدے پھندے، خوش و خرم پھر وہ کولڈ کافی کار زر پر کافی پینے چلے گئے۔ ناعمہ خوب چہک رہی تھی۔ لگتا نہ تھا کہ اسے کوئی غم ہے۔" حیران تھی ثمو۔

"ہاں تو کب تک ماتم کرتی۔ آخر اسے زندہ رہنا ہے اور وہ خوش کیوں نہ ہوتی۔ یہاں تو امی نے اسے خوش رہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔" یہ حمرا تھی پہلی بار بولی تھی۔

تلخ تبصرہ، اذیت ناک انکشاف، اس کا دل اپنی جگہ سکڑا، پھر پھیلا تھا، پھر ٹھٹھر گیا۔

"بھائی ابھی تک حالت سوگ میں ہیں۔ انہوں نے کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا۔" ثمو کہہ رہی تھی۔

"لینے دو اثر۔ آخر کب تک۔" امی کے لہجے میں لاپروائی اور بے نیازی تھی۔ "ہوش آجائے گا اسے بھی۔ جب زندگی کی امنگ جاگے گی تو دنیا کا سامنا بھی کرے گا۔"

"امی! بھائی کی شادی کا کب سوچیں گی آپ۔ گھل رہے ہیں وہ۔ انہیں بھی زندہ رہنے اور خوش رہنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ناعمہ کو دیکھیں، مزے کررہی ہے۔ جاب کررہی ہے۔"

"عارف شادی کے لیے راضی نہیں اور ابھی میں کروں گی بھی نہیں۔ اسے سزا ملنی چاہیے۔ مجھ سے مقابلہ کیا تھا اس نے۔ بیوی کے عشق میں مجھ سے جواب طلب کرنے لگا تھا۔ یہ میری، ایک ماں کی توہین ہے۔" امی کے لہجے میں ان کا غرور بول رہا تھا۔

"امی! سزا مل تو گئی۔ بیوی گئی۔ اس کا سامان گیا، ورنہ اسی سے دل بہلا لیتے۔ تنہا رہتے ہیں، چپ کا روزہ رکھے۔ بات چیت نہ ہنسی مذاق، ایسے تو نہ تھے بھائی۔ اگر کسی دن خود کسی کو لے کر آگئے اور کہا ڈرامائی انداز میں یہ آپ کی بہو ہے، میری بیوی اور اب یہ یہیں رہے گی۔ میرے گھر، میرے کمرے، میرے دل میں تب؟" دونوں بہنیں کھلکھلا اٹھیں۔ امی تلملا گئیں۔

"اللہ نہ کرے۔ میرا بیٹا اتنا نالائق ہو۔ گردن مروڑ دوں گی دونوں کی، کمزور نہیں ہوں۔"

اف۔ امی کا طنطنہ۔ وہ بے حد تھکن محسوس کر تھا۔ چپکے سے آکر کمرے میں بستر پر گر گیا۔ ڈائن خو پی کر ہی طاقت حاصل کرتی ہے۔

ابا اس دن بہت افسردہ تھے۔ "ناعمہ کی شادی ہو گ ہے۔ امریکہ چلی گئی شوہر کے ساتھ۔"

"خس کم جہاں پاک۔ بیٹے کو خوش خبری سنا دو۔ امی جلے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔ دیر تک ابا باتیں کرتی رہیں۔ ابا کو سمجھاتی، ورغلاتی رہیں بجز طرح بیٹے پر رعب جماتی تھیں۔ شوہر کو بھی اسی طر رعب میں رکھنے کی عادت پختہ ہو گئی تھی۔

کتنا مجبور تھا وہ۔ ایک مضبوط توانا مرد ہو کر کمزور او لاچار۔ قوت فیصلہ سے محروم۔

زندگی نے بھی کتنے عجیب تماشے دکھائے تھے۔ خود تماشا بن گیا نہ موت آکر دکھوں کا خاتمہ کرتی تھ نہ زندگی کا جوش دنیا میں قدم بڑھانے کا موقع دے تھا۔ جو اپنی زندگی کے فیصلوں کے لیے دوسروں کا محتا ہو۔ اسے یہی ملے گا مایوسی، ارمانوں کا خون، تمناؤں کی کرچیاں، لہولہان خالی دل، ویران دل۔

سب خوش تھے۔ مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ ا مطمئن، خوش حال، طاہر مکمل بھرپور زندگی گزار رہا ان کے گھروں میں ماؤں کی چھپر چھاؤں، بچوں کی قلقاریاں تھیں، بیویوں کی ہنسی اور چوڑیوں کی جھنکاریں، شاد باد منزل مراد۔

ہاں۔ عارف ایک تنہا ویران اجڑے مکان کا مکین غلط فیصلوں کا اسیر، حمرا بھی شادی کر کے چلی گئی، ثمو پہلے بھی دور تھی۔

اب گھر میں تین نفوس، تین کمروں میں الگ الگ رہائش، پھر ویرانیاں، سناٹے، عجیب ماحول تھا، چمگادڑوں کے بسیرے، اسے تو دن رات کا شمار بھی یاد نہ رہتا۔ بس طاہر اور احد نے اس کا ساتھ نہ چھو تھا۔ وہ ان کے ساتھ چلا جاتا۔ وہ سمجھاتے، تسلی دیتے امید آس کے جگنو مٹھی سے یوں اڑ جاتے جیسے قید رہا ہوئے ہوں۔ طاہر بزرگوں کی طرح نصیحت

کرتا۔ وہ نہ سمجھنے والے ہونق پن سے ادھر ادھر دیکھتا۔

☼ ☼ ☼

ثمو کی سسرال میں شادی تھی۔ ثمو نے بہت لجاجت سے شریک ہونے کا وعدہ لیا تھا۔ وہ امی کے ساتھ شادی کی تقریب میں چلا گیا۔ امی اسے لڑکیاں دکھانے کا لالچ دے کر لائی تھیں، مگر وہ صرف ثمو کی خواہش پر آیا تھا۔ بارات آئی تو حیرانیوں نے گھیر لیا۔ طاہر کی بارات کے ساتھ آمد، دولہا والے طاہر کی بہن کے سسرالی تھے۔ عجب اتفاق تھا۔ وہ باتیں کررہے تھے تو ایک گاڑی سے اترتے ہوئے خوش جمال اور خوش مزاج جوڑے کو دیکھ کر عارف کو کرنٹ لگا۔

طاہر کی بہن... ناعمہ اور اس کے شوہر کے ساتھ۔ ناعمہ کی گود میں ایک مچلتا ہوا صحت مند بچہ۔ اس کے شوہر نے بھی ایک بچے کو اٹھایا ہوا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے حسین عارف کے سامنے سے گزر گئے۔

عارف دم بخود طاہر کی بہن کو دیکھ رہا تھا، جو کسی خاتون سے ناعمہ کا تعارف کرا رہی تھی۔

"ہاں ہاں بھئی... وہی ناعمہ۔ میں نے ہی اس کی شادی اپنے دیور سے کروائی ہے۔ ہم بھلا ناعمہ جیسی لڑکی کو کسی غیر کے لیے چھوڑ دیتے؟ ناجی نا۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا۔ ہاں امریکہ میں رہتے ہیں اب۔"

وہ بے خودی کے عالم میں دھم سے کرسی پر گرا۔ طاہر نے اس کا کندھا تھپکا۔

"حوصلہ یار! کیوں تماشا بنا رہے ہو اپنا۔ ہمت کرو۔ تم کیا سمجھتے تھے تم آخری مرد ہو۔ نہیں۔ دنیا ابھی قدر دانوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ فیصلہ تم نے خود کیا ہے تو ثابت قدم رہو۔"

اس نے شکایتی نظروں سے طاہر کو دیکھا۔ "تم نے کبھی بتایا نہیں۔"

"کیا ہو تا بتا کر۔ تمہارے زخموں پر نمک چھڑکتا... یار عارف! یہ دنیا ہم انسانوں کے لیے ہی بنائی ہے قدرت نے۔ جو دنیا اور زندگی کی قدر نہیں کرتا اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ جو تم پر گزر رہی ہے۔ یہاں دکھ سکھ، آزمائشیں، امیدیں لائن لگا کر کھڑی ہیں۔ آگے بڑھو اور کسی کا دامن تھام لو۔ پچھتاووں کو اپنے ساتھ چمٹا کر ان سے خراج لینا بزدلی ہے۔ اٹھو ادھر چلتے ہیں۔"

وہ بے بسی سے ہونٹ کچل رہا تھا۔ وہ زخم کھولنا نہیں چاہتا تھا اور وہ سب پر کھلے ہوئے تھے۔ وہ بے تاب نظروں سے ناعمہ کو جاتا دیکھ رہا تھا۔ ہنستی مسکراتی پھول کی طرح کھلی ہوئی۔ اس کا تو کچھ بگڑا نہ تھا۔ وہ تو... اسی طرح تھی بلکہ پہلے سے زیادہ حسین، مگن، شوہر کے ساتھ خوش... اور میں زخم چاٹ رہا ہوں۔

"ناعمہ!" وہ اسے مل گئی۔ "میں تم سے... کیسی ہو؟" الفاظ ہی الجھ گئے۔ بولا نہ گیا۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "آپ کون؟" ہائیں بے گانگی...

"میں تم سے معافی..."

"سوری جی۔ میں آپ کو نہیں جانتی... آپ کو غلط فہمی..." وہ بچے کو سنبھالتی رہی۔

"ناعمہ! ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم کیسے بھلا سکتی ہو مجھے۔"

"میں اجنبیوں سے مخاطب نہیں ہوا کرتی۔" سختی سے کہتی ہوئی بچے کو گود میں اٹھائے وہ آگے چلی گئی۔ آگے، بہت دور، اپنے شوہر کے قریب۔ ہاں اس کی آنکھوں میں بے گانگی تھی، بے زاری۔ شناسائی کی ذرہ بھر چمک نہ تھی آنکھوں میں۔ پہچان کا کوئی رنگ نہ تھا چہرے پر۔

اب وہ شوہر کو بچے کی طرف متوجہ کررہی تھی۔ جو بڑے بیٹے کو کھانا کھلا رہا تھا۔ پھر کسی لڑکی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اس کا شوہر محبت اور خوشی کے ساتھ اس کی ہنسی کا ساتھ دے رہا تھا۔ ان کے مشترکہ قہقہے فضا کو رنگین کررہے تھے۔

عارف کی زندگی ایک نوحہ بن کر ہر سمت بکھر رہی تھی۔

مسز عظیم

"موقع آدمی کو چور بناتا ہے۔ آپ مان کیوں نہیں لیتے میری بات؟" الوینا نے وہ بحث سمیٹنا چاہی' جو اس وقت ہم دونوں کے درمیان شدومد سے جاری تھی۔

"ارے! میری سادہ سی گھریلو بیگم! جب آپ صحیح نہیں کہہ رہیں تو کیسے مان لوں؟" میں نے الوینا کی بات کی شدت سے نفی کی۔

"اچھا! تمہارا کیا خیال ہے میں اب تک ایک شرافت سے بھرپور زندگی گزار رہا ہوں تو اس کا مطلب ہے مجھے کبھی موقع ہی نہیں ملا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے الوینا کو دیکھا۔

"ارے! آپ بات کو کہاں لے گئے ہیں میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ..." الوینا نے گڑبڑا کر وضاحت دینے کی کوشش کی۔

"اچھا اچھا! بس کرو۔ میں نے الوینا کی بات پوری ہی نہ ہونے دی۔ نہ تم میری مانو گی' نہ میں تمہاری۔ اس بحث کو دفع کرو۔"

"یعنی یہ بحث بے نتیجہ ہی رہے گی؟" الوینا نے پوچھا۔ میں نے کندھے اچکا کر اس کی طرف دیکھا اور سونے کے ارادے سے بیڈ پر لیٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی مبشر صاحب!" میری نئی کولیگ سارہ نے مجھے پکارا۔

"جی مس سارہ! کہیے کیا بات ہے؟" میں اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"وہ مبشر صاحب! میری طبیعت ذرا خراب تھی۔ اگر آپ یہ فائل کمپلیٹ کر کے سر عباس کو پہنچا دیتے تو..." اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کی طرف دیکھا اور پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔

سارہ میری نئی کولیگ تھی۔ مجھے انکار کرنا مناسب نہ لگا۔

"او کے مس سارا۔ لایئے دے دیں..." میں نے فائل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

یوں اپنا کام چھوڑ کے میں اس کے کام میں جت گیا۔ فائل مکمل کی تو وہ آ کے مجھ سے لے گئی اور پھر سر عباس کو دے آئی۔

"تھینک یو مبشر صاحب... ریئلی تھینکس..." سارہ نے بے حد ممنونیت سے کہا اور میں بلاوجہ ہی شرمندہ ہوا۔

"ارے... مس سارہ!" ایسی تو کوئی بات نہیں..."

"مس سارہ... بھلا مس لگانے کی کیا تک ہے؟ آپ مجھے سارہ بلا سکتے ہیں۔"

اور یہیں سے ہماری بے تکلفی کا آغاز ہوا۔

☼ ☼ ☼

الوینا آج بھی ہمیشہ کی طرح میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی میرے آنے سے پہلے ہلکا پھلکا تیار ہو جایا کرتی تھی۔ مگر آج میں اس کے ویلکم کا جواب روز جیسا نہ دے سکا۔ کیونکہ ان دنوں تو سارہ کی دوستی سر چڑھ کر بول رہی تھی۔

میں الوینا کے رویے میں کوئی تبدیلی محسوس نہ کر سکا۔ اس کے وہی روز و شب... بدل تو میں گیا تھا... بدل تو میں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کیا خیال ہے مبشر! آج لنچ کہیں باہر کریں؟ میری آرزو سارہ کی فرمائش بن کر مجھ تک پہنچی۔

"شیور! کیوں نہیں؟" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"دراصل آفس میں تو روز گپ شپ کرتے ہیں۔ سوچا آج باہر جایا جائے۔ تھوڑا چینج آ جائے گا نا..." اس نے میری طرف تائیدی انداز میں دیکھا اور میں تو حرف بہ حرف یقین لے آیا تھا۔

ہماری بے تکلفی کا گراف مسلسل اوپر کی طرف جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے ڈھائی بجے میرے موبائل پر کال آئی... میں نے نمبر دیکھا تو "سارہ کالنگ" کے الفاظ چمک رہے تھے... میں الوینا کی وجہ سے فوراً" فون لے کر کمرے سے باہر آ گیا اور ٹیرس پہ چلا آیا۔

"ہیلو ہاں سارہ! خیریت...؟ اتنی رات کو فون کیا؟"

"کیوں؟ کیا میں اتنا بھی حق نہیں رکھتی کہ وقت بے وقت تمہیں فون کر لیا کروں جواب میں؟" سارہ نے خاصے لاڈ سے سوال پوچھا۔

"ارے ارے! کیوں نہیں... کر سکتی ہو۔ بالکل کر سکتی ہو۔" میں نے جواباً" کہا۔

"تمہاری بیوی سو رہی ہے کیا؟" اسے اچانک الوینا کا خیال آیا۔

"آں... ہاں سو رہی ہے۔"

"ویسے کیسی ہے تمہاری بیوی؟" سارہ نے سوال پوچھا۔

"ہاں..." انگلی سے ماتھا مسلتے ہوئے میں نے جواب سوچا... "عام سی ہے۔ گھریلو سی سادہ سی..." آخر کار جواب ڈھونڈ ہی لیا میں نے...

"اور میں...؟ میں کیسی ہوں؟" سوالیہ لہجے میں اشتیاق تھا۔ ستائش کی بھوک تھی۔ سراہے جانے کی خواہش تھی اور نہ جانے اور بھی کیا کچھ تھا۔

"تم...؟ ارے! تم تو نسیم صبح ہو... موسم بہار ہو... یار! تمہارا اور اس کا کیا مقابلہ... تم تو بلا مقابلہ..." فقرہ میرے منہ میں ہی رہ گیا۔ اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس پاتے ہی میں نے مڑ کے یوں ہی دیکھا تھا کہ بس...

پیچھے مڑ کر دیکھنا مجھے پتھر کر گیا۔

الوینا جن نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی... ان میں کیا کچھ نہ تھا... رنجیدگی... دکھ... تکلیف... بے اعتباری...

میں سہار نہیں پایا۔

"کمرے میں آجائیں... یہاں کافی ٹھنڈ ہے۔" الوینا نے کہا بھی تو کیا۔

"وینا..." بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ رکی ضرور۔ مگر مڑ کر نہیں دیکھا۔

"کچھ... کچھ کہو گی نہیں؟"

"آں... نہیں۔" وہ ایک لمحے کو ٹھٹکی۔ پھر بولی۔ "بس... وہ... موقع آدمی کو چور بنا دیتا ہے نا؟"

الوینا نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا... مگر اس کا یہ چھوٹا سا جملہ میرے اوپر گھڑوں پانی ڈال گیا۔ میں ہاتھ میں پکڑے موبائل کو مکمل طور پر بھول چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں مسز الوینا مبشر... اپنے شوہر سے بے حد پیار کرنے والی... اسے کل کائنات سمجھنے والی... خود پر پڑنے والی شوہر کی بدلی نظر پہلی بار میں ہی پہچان چکی تھی۔ وہ کون تھی... کیا تھی... مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مطلب تھا تو صرف یہ... کہ وہ تھی۔ وہ موجود تھی۔

میں سمجھتی تھی' یہ بحث ہمیشہ بے نتیجہ ہی رہے گی... مگر کاش! یہ بے نتیجہ ہی رہتی... کوئی شرط نہ لگا کر بھی یہ بحث میں بظاہر جیت چکی تھی۔ بے شک یہ ہماری طرف سے کوئی طے شدہ منصوبہ نہیں تھا۔ مگر ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گیا تھا۔

یہ قسمت کی طرف سے وہ ایک موقع تھا' جو میرے شوہر کو ملا تھا... اور جس ایک موقع نے میرے شوہر کو محرم سے مجرم کر دیا تھا۔

میں بحث جیت کر بھی ہار چکی تھی... کیونکہ اس ایک موقع نے' جو ہر انسان کی زندگی میں لازمی آتا ہے... اس ایک موقع نے مبشر کو چور بنا دیا تھا... ایک موقع نے آدمی کو چور بنا دیا تھا... میں نے ٹھیک کہا تھا نا...؟

میں مبشر علوی' اپنی بیوی کو عام گھریلو اور سادہ سی سمجھتے ہوئے یہ بالکل بھول چکا تھا کہ بیوی عام اور سادہ سی کیوں نہ ہو۔ مگر اس میں شعور بھی ہو سکتا ہے۔ کس قدر پختگی ہو سکتی ہے۔ اچھے اور برے کی پرکھ ہو سکتی ہے۔

الوینا مجھے پہچان چکی تھی... وہ تو بس احتراز برت رہی تھی۔ میں سمجھا تھا کہ میں دھوکا دے رہا تھا۔ لیکن دراصل میں تو دھوکا کھا رہا تھا... میں نے بڑے زعم سے اپنی بیوی سے کہا تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ میں اب تک شرافت سے زندگی گزار رہا ہوں تو اس لیے کہ مجھے موقع نہیں ملا؟"

اور میں نہیں جانتا تھا۔ موقع نامی تھپڑ اتنی جلدی میرے منہ پر مار دیا جائے گا۔ یہ ایک موقع جو مجھے قسمت کی طرف سے بطور آزمائش دیا گیا اور میں اس میں ناکام ہو گیا۔

اور اب سوچ رہا ہوں کہ الوینا نے ٹھیک ہی کہا تھا... ہے نا...؟

☼

سمیرا حمید

خیالِ یار

ناولٹ

سیاہ پالش سے پیانو جگمگا رہا تھا اس نے اس پر ہاتھ رکھا اور کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد بورڈ کا ڈھکن الٹ دیا اور اسٹول پر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اسے بیٹھنا نہیں تھا۔ دو انگلیوں کو پیانو کے سازوں پر رکھا' جلترنگ کا ایک ہی ساز لیے ردھم گونجا' پھر انگلیوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے گیا' صدھم ویسے ہی سوتی رہی۔ جیسے وہاں کچھ ہو ہی نہیں رہا تھا۔ نہ ہی کچھ ہونے والا ہے۔

یہ ایک بڑا اور بے حد وسیع ہال تھا جس کے ایک طرف کتابوں کی الماریاں تھیں جو ایک دیوار سے شروع ہو کر دوسری دیوار کے آخری کونے تک موجود تھیں جن میں ہزاروں کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے ہی آفس ٹیبل اور کرسی۔ دادا اسے رات کے وقت آفس کے لیے استعمال کرتے تھے' ہال میں داخل ہوتے ہی سامنے بنی قد آدم کھڑکیاں جو باہر لان کی طرف کھلتی تھیں اور اسی دیوار کے آخری کونے میں پیانو رکھا تھا۔ اس پیانو کو بجاتا کوئی بھی نہیں تھا بس یہ دادا کو اتنا پسند آگیا کہ وہ اسے خرید لائے اور یہاں رکھ دیا۔ فرش پر ایرانی قالین بچھا تھا' کھڑکیوں پر سفید پردے لہرا رہے تھے پیانو کی مخالف سمت میں رکھے کاؤچ پر وہ سو رہی تھی۔ وہ شام کو یہاں آئی تھی اور سوچتے سوچتے کاؤچ پر ہی سو گئی تھی۔ آج سے پہلے اس جگہ کبھی نہیں سوئی تھی۔

اس نے پھر پیانو پر اپنی انگلیاں رکھیں اس بار دونوں ہاتھوں کی دس اور انہیں حرکت دینے لگا۔ پیانو بجنے لگا۔

ایسا پیانو شاید ہی کسی نے کبھی بجایا ہو' وہ ساز نہیں حقیقت بجا رہا تھا۔ انسان کی حقیقت۔۔۔

اس ردھم میں بلاوا تھا۔ بھلائی کی طرف۔۔۔ ایک تنبیہہ تھی جو بہت کچھ آشکار کر رہی تھی۔

صدھم کی آنکھ کھل گئی' ہال میں لگا فانوس روشن تھا' ہال کی وسعت کی طرح ہی وسیع تھا یہ فانوس اور روشن اتنا کہ ویرانے میں لگا ہو تو چاند کی طرح نظر آئے یہ بھی دادا کو بے حد پسند آگیا تھا تو وہ اسے خرید لائے

اس ہال میں لگی سب سے شاندار چیز... اسے دادا خاص موقعوں پر ہی روشن کرتے تھے۔

"آج یہ فانوس کیوں روشن ہے؟" سوچتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ سوئی جاگی آنکھوں سے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی مگر پیانو وہ مکمل توجہ سے سن رہی تھی۔ وہ بے حد خوبصورت بجا رہا تھا اور اتنے انہماک سے بجا رہا تھا جیسے چاند سورج ستاروں کے لیے بجا رہا ہو۔

اپنے کھلے بالوں اور ڈھلکتے ہوئے دوپٹے کو سنبھالتی وہ چلتے چلتے پیانو کے قریب آگئی' وہ بے حد نفیس اور خوب صورت لبادے میں ملبوس تھا۔

"اٹھ گئی پیاری لڑکی!" جیسے ہی وہ اس کے بالکل قریب جاکر کھڑی ہوئی اس نے صرف گردن کو خم دے کر اس سے پوچھا۔ پیانو وہ ابھی بھی بجا رہا تھا۔

"تم نے مجھے اٹھا دیا۔" وہ خفا نہیں تھی۔

"میں نے... یا اس ساز نے؟" اس نے آنکھوں سے اشارہ کرکے پوچھا۔ "سنو یہ ساز کیا کہہ رہا ہے۔"

صدھم نے اپنی آنکھیں مسلیں اور اسے سننے لگی۔ وہ پیانو کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی تھی اور سامنے روشن فانوس کو دیکھ رہی تھی نہ جانے اسے کیوں لگ رہا تھا کہ وہ روشن سے روشن ہوتا جارہا ہے۔

وہ بھول گئی کہ وہ کہاں کھڑی ہے وہ سر سے پاؤں تک اس ساز میں ڈوب گئی۔ اس نے یکدم بجانا بند کردیا اس نے بھی فوراً "بند آنکھیں کھولیں۔

"بجاؤ..." صدھم نے فرمائش کی۔

"میں ایک اچھی دھن بجا کر جاؤں گا' مگر اس کا انتخاب تمہیں کرنا ہوگا۔" وہ مسکرایا۔ کتنا پیارا مسکرایا۔

"تم کون ہو؟" صدھم اس سے خوف زدہ بالکل نہیں تھی۔

"میں تمہارا خیال ہوں صدھم!"

وہ پھر اسی انداز سے مسکرایا وہ مسکراہٹ جسے اس دنیا کی مسکراہٹ نہیں کہا جاسکتا۔ اس نے سفید رنگ کا کھلا اور ڈھیلا چوغہ پہن رکھا تھا چوغہ گھٹنوں سے ذرا نیچے تھا' ڈھیلا اور کھلا ہی پاجامہ' چوغے کی آستین لمبی تھیں ایک لمبے اور چوڑے سفید کپڑے کو اس نے چوغے کے اوپر سینے پر اس طرح سے لپیٹا تھا کہ اس کے دونوں بازو اس میں چھپ گئے تھے' وہ اتنی خوب صورتی سے اس کپڑے کو لپیٹے ہوئے تھا کہ وہ اس کے وجود کا حصہ ہی نظر آرہا تھا لباس کا نہیں' ایسے ہی سفید چوڑے کپڑے کو اس نے سر پر ڈال رکھا تھا اور بے حد باریک لیکن بے حد مضبوط نظر آنے والی ڈوری سے اس کپڑے کو سر کے گرد لپیٹ کر باندھ رکھا تھا۔ ایسا رومال جسے صرف سر کے لیے بنایا گیا ہو۔

دونوں ہاتھوں کو اس نے کہنیوں سے نیچے تک سیاہ کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا۔ صرف یہ کپڑا سیاہ رنگ کا تھا جہاں سے انگلیاں ہتھیلی کے ساتھ جڑتی ہیں وہاں انہیں باریک نہ نظر میں آنے والے دھاگوں سے باندھا ہوا تھا۔ یہ اس کے سیاہ دستانے تھے۔ ان دستانوں کے علاوہ اس کا سارا لباس سفید ہی تھا لیکن کچھ سیاہ بھی تھا' یہ شاید وہ دھاگے تھے جو سر کے گرد لپیٹی ڈوری کا حصہ تھے۔ کبھی کبھی وہ بے حد سیاہ ہونے کا احساس دلاتے نہ جانے اصل میں وہ کس رنگ کے تھے۔ اس کے جوتے لکڑی کے رنگ کے تھے۔ اس کے تلوے سیدھے اور اوپر باریک ہی ڈوریوں کا جال سا تھا' جال اتنا گھنا تھا کہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ انہوں نے دو پیروں کو باندھ رکھا ہے یا دو پہاڑوں کو۔ اس کے جسم کا کوئی ایک حصہ بھی نظر نہیں آرہا تھا سوائے منہ اور ٹھوڑی کے نیچے کے کچھ حصے کے...

"میرا خیال..." وہ حیران ہوئی مگر اتنا نہیں۔

"یاد نہیں... میں وہ ہوں جسے تم نے سوچا۔"

"کیا میں نے اتنا خوب صورت سوچا۔" صدھم مسکرائی۔

"کیا میں اتنا خوب صورت سوچ سکتی ہوں' کیا کوئی اتنا خوب صورت سوچ سکتا ہے. جس کی تخلیق تم بن گئے ہو۔"

"ایسا ہوا تو ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور صدھم کے ادب میں جھک کر آداب بجا لایا۔ "میں تمہارا مشکور رہوں گا۔ اگر میں ہمیشہ ایسا ہی رہا تو... ایسا... اتنا ہی خوب صورت' دیکھو میں کتنا خوب صورت ہوں' میں مبہوت کردیتا ہوں' دھڑکنیں روک لیتا ہوں۔" وہ گھوم کر لہرایا۔

صدھم کو ہنسی آگئی۔

"دیکھو میرا مسکرانا... میرا چلنا... میرا بولنا... میں سراپا حسن ہوں۔ میں تم ہوں... تمہاری تخلیق ہوں۔" وہ اڑنے والے انداز سے لہرا لہرا کر گھوم گھوم کر بولا۔

"میں کائنات کا محور ہوں... میں دل ہوں... میں محبت ہوں۔" اس بار رک کر اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا۔

"تم "محبت" ہو؟" وہ واقعی جاننا چاہتی تھی۔

"کیا محبت سے خوب صورت کچھ اور ہے؟" وہ نرمی سے گویا ہوا۔ وہ سوال نہیں تھا۔ تصدیق بھی نہیں تھی وہ کچھ اور ہی تھا۔

"تم نے کہا۔ تم میرا خیال ہو۔" صدھم حیران ہوئی۔

"کیا تمہارا خیال "محبت" نہیں تھا؟" یہ بھی سوال نہیں تھا۔ اوہ خدایا پھر یہ کیا تھا۔

"تم نے ہادی کو سوچا' دن رات سوچا' بار بار سوچا۔ میں وہی خیال ہوں' تم نے سوچا۔ ہادی تمہارا ہے۔ میں یہی سوچ ہوں۔ تم ہادی سے محبت کررہی ہو۔ بے تحاشا بے حساب... تمہارے لیے ہادی ہی کافی ہے۔ تمہیں بس وہی چاہیے۔"

وہ چیز نہیں کائنات ہے...

وہ دل نہیں ایمان ہے...

وہ جان نہیں شان ہے۔ اس کے لیے تمہارا دل دھڑکتا ہے۔ تمہارا سر جھکتا ہے۔ تمہاری سانسیں اس کی امانت ہیں۔ تم ہادی کے لیے خود کو پیش کرچکی ہو' وقف کرچکی ہو۔" وہ چلتے چلتے ہال میں لگے فانوس کے عین نیچے آکر کھڑا ہوگیا۔

"تم ہادی سے ڈرتی نہیں ہو کیونکہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔" اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ اتنا خوب صورت ہے! خدایا..." فانوس کی چکاچوند روشنی میں خیال کا حسن جگمگانے لگا۔ صدھم اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں اسے دیکھ نہیں پارہی تھیں اور وہ اس سے ہٹ بھی نہیں پارہی تھیں۔ وہ اتنا خوب صورت تھا کہ اس کا حسن دنیاوی الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جاسکتا تھا وہ صرف حسن نہیں تھا۔ وہ اس سے کچھ اور زیادہ بھی تھا۔

"میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں۔" صدھم کی آنکھیں بے حد روشن ہوگئیں۔

"شادی...!" الجھا ہوا انداز تھا خیال کا۔ صدھم نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

"سوال نہیں ہے یہ صدھم...!" اس نے انگلی اٹھا کر اسے روکا۔

"جواب مت دو... اقرار کرو۔ یہ تمہارے عہد نامے کی ترتیب ہے۔ تمہیں معلوم ہے تم کس کے لیے کیا کہہ رہی ہو۔" وہ رکا اور پھر بولا۔ "تمہیں ہادی چاہیے۔ ہادی ہی چاہیے اور بس..." صدھم نے اسے ایسے دیکھا جیسے جادو کی چھڑی سے اسے ہادی دینے آیا ہو۔

"تم نے اس کی پسند کا سب کچھ کیا۔ اس کے لیے سب کچھ کرنا چاہا۔ تم نے ہر عبادت اس کے لیے کی۔ ہر دعا اسے مانگنے کے لیے کی۔" صدھم کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"ان دعاؤں نے مجھے یہ مسکراہٹ دی۔" وہ مسکرایا۔ کس قدر خوب صورت مسکراہٹ۔ "میری آنکھوں کو یہ چمک اور خاص کر یہ... یہ دیکھو میرا ماتھا۔"

صدھم اس کا ماتھا دیکھنے لگی۔ اسے وہاں باریک سا ایک سوراخ نظر آیا جس میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ سورج کی طرح روشن اور چاند کی طرح دودھیا روشنی نہیں تھی۔ اس کا اپنا ہی الگ رنگ تھا جسے دیکھا ہی جاسکتا ہے. جس کی پہچان مشکل ہے۔

"اتنا خوب صورت بنا دیا تم نے مجھے..." وہ خاموش ہوا اور پلٹ کر پیانو کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا اس کی پشت صدھم کی طرف ہوگئی۔ یکدم سے اس

کے ہاتھوں پر بندھے دستانے نما کپڑے پر لپٹی ڈوریاں کھلنے لگیں اور وہ کپڑا ڈھیلا ہو گیا جیسے گرنے کو تیار ہو۔

"یہ کیا ہوا؟" صدھم نے سوچا کہ وہ پھر سے ڈوریاں باندھ دیتی ہے۔

"تم بتاؤ یہ کیا ہوا صدھم... تم نے کل رات کیا سوچا تھا؟" اس بار وہ پوچھ ہی رہا تھا۔ آواز کانپ رہی تھی۔

"مجھے اللہ سے کچھ نہیں مانگنا۔" دو آنسو نکل کر صدھم کے گالوں پر آئے۔

دس انگلیوں اور کہنیوں تک بندھی بے حد مضبوط نظر آنے والی ڈوریاں جھٹکے سے کھل کر زمین پر گریں۔ وہ ایسے ٹوٹیں جیسے مکڑی کا جالا تھا جو ایک ہی لپیٹ میں سارے کا سارا لپٹ گیا۔ دستانے نما کپڑا بھی گر گیا۔

"تمہارے ہاتھوں کو کیا ہوا؟" اس کے ننگے ہاتھ دیکھ کر صدھم دل تھام کر رہ گئی۔ اتنے کریہہ ہاتھ... لگتا تھا انہیں ہر رات بھٹی میں جلایا جاتا ہے۔ وہ بھدے اور بدنما نہیں تھے۔ وہ بے حد غلیظ تھے۔

"انہوں نے مانگنا چھوڑ دیا ہے صدھم... اللہ سے ایمان اور یقین کے جن دھاگوں نے انہیں مضبوطی سے باندھا تھا انہیں تم نے کھول دیا۔"

صدھم نے دیکھا کہ ان ہاتھوں میں سے محلول سا رسنے لگا اور قالین پر گرنے لگا۔ ہال میں بدبو پھیل گئی۔ اس نے بے اختیار اپنی ناک پر ہاتھ رکھا۔

"میری اذیت کا تماشا مت بناؤ۔" خیال چلایا۔

صدھم نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ مگر وہ یہ بدبو کیسے برداشت کرتی۔

"تمہاری پیشانی پر کیا ہوا؟" صدھم کی نظر اس کی پیشانی پر پڑی جہاں سیاہ رنگ کے جال نے پھوٹنا شروع کر دیا تھا۔ روشنی وہاں سے ایسے غائب تھی، جیسے وہاں پہلے کبھی تھی ہی نہیں۔

"یہ سرکش ہو گیا ہے۔" خیال نے صدھم کو بتایا نہیں، بلکہ بیان کیا۔ جسے روز قیامت گناہوں کو بیان کیا جائے گا۔

"پیانو تو بجاؤ۔" صدھم نے فرمائش کی۔

"ضرور بجاؤں گا۔ اگر تم نے بجانے دیا۔ صدھم نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اس وقت ہادی کہاں ہے؟" وہ کیسے جان پاتی کہ اس نے کس ہادی کا پوچھا ہے۔

"وہ اپنی بڑی خالہ کی طرف جا چکا ہے۔ دادا نے کہا کہ اب وہ نکاح والے دن ہی آئے گا۔ سب لوگ جا چکے ہیں وہاں۔ آج وہاں ڈھولکی ہے۔" صدھم کا انداز بدل سا گیا۔

"تم نہیں گئیں صدھم؟" شاید اس نے طنز نہیں کیا تھا۔

"میں دلہن ہوں... دلہن نکاح تک پردہ کرتی ہے۔" وہ مسکرائی... عجیب سرکش سی مسکراہٹ تھی۔

"تم نے خود کو صرف دلہن ہی مان لیا؟"

"اپنے حق پر ہچکچانا کیسا۔" وہ نڈر سی ہو کر بولی۔

"انکار کیسا، کیوں نہ مانتی، مجھے تو آج منوانا بھی ہے۔"

"کیا...؟" وہ بولا۔

"دلہن صرف میں ہوں۔ دوسری کا جنازہ اٹھے گا صرف۔" صدھم نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ وہ اتنی زور سے تو نہیں دھاڑی تھی کہ فانوس ہی بند ہو جاتا۔ کمرے میں صرف ایک لائٹ ہی روشن رہ گئی۔

"میں نے سوچ لیا ہے... سوچ لیا ہے... ہاتھ پر ہاتھ رکھنے سے کچھ نہیں ہوتا، انسان اپنی قسمت خود لکھتا ہے، میں بھی لکھوں گی، تم دیکھنا۔"

"دیکھ رہا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا۔

اس کے سر پر بندھا کپڑا ڈھلک کر زمین پر آگرا۔ مضبوط نظر آنے والی ڈوری بھی ایسے ہی ایک دم سے کھلی تھی۔ جیسے ہاتھوں کی کھلی تھی۔ ڈوری جیسے جل چکی تھی۔

وہ گنجا تھا اور اس کے سر پر زخموں کے بے تحاشا نشان تھے۔ نہیں کچھ اور زخم ان میں سے پھوٹ رہے تھے اور نشانات بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

"خدا کے لیے اس کپڑے کو واپس اپنے سر پر لپیٹ لو، تم بے حد بدصورت لگ رہے ہو۔ جلدی کرو، میں تمہیں ایسے نہیں دیکھ سکتی، بدبو میری برداشت سے باہر ہو چکی ہے۔"

"اب میں یہ واپس نہیں پہن سکتا صدھم۔ تم نے ہی اسے اتارا ہے، تم ہی اسے پہنا سکتی ہو۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ میں نے..." وہ بے انتہا حیران ہوئی۔

"تم نے ہی تو کہا کہ تم نے سوچ لیا ہے اور تم بھول گئیں کہ میں بس تمہاری سوچ، تمہارا خیال ہوں، تم نے ہی تو کہا کہ تم نے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ تم نے قسمت کے قلم کو اپنے ہاتھ میں لینے کا سوچ لیا ہے۔ تاکہ تم اپنی مرضی کا لکھ سکو اور تم لکھ رہی ہو۔ تم ماسٹر بن گئی ہو۔ وہ جو تم بننا نہیں چاہتی تھیں۔"

صدھم نے کندھے اچکائے۔ "مت پہنو۔ مجھے کیا...! بدصورت تم لگ رہے ہو، میں نہیں۔"

خیال نے افسوس ناک نظروں سے صدھم کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "اس مقام پر شرمندہ ہونا تمہارا فرض ہے۔"

"تمہارے کالج میں ایک لڑکی ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے اپنی سوتیلی ماں کو زہر دے کر مار دیا۔ سنا ہے کہ اس نے زہریلی دوا کو اس کے سوپ میں ملا دیا۔ لیکن میں نے انگور کے جوس کا انتخاب کیا۔ اوصاف کو بے حد پسند ہے، جگ بھر بھر کر پی جاتی ہے۔ ایک ہی سانس میں۔" صدھم کا انداز بد سے بدتر ہو گیا۔

"تم زخمی ہو گیا؟" بولتے بولتے صدھم نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھنے لگی۔ اس کے بازوؤں، سینے اور گردن سے خون قطرہ قطرہ رسنے لگا تھا۔ سفید لبادہ سرخ ہونے لگا تھا۔

خیال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب اس کا لبادہ دے رہا تھا۔ آنکھ والوں کو کہ وہ دیکھ لے۔

"میں ہادی کو بچپن سے ہی پسند کرتی ہوں۔ گرمیوں میں جب وہ بڑے گیٹ کو چپکے سے کھول کر دبے پاؤں آیا کرتا تھا تو میں فوراً جان جاتی تھی کہ ہادی آیا ہے۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر میں آج بھی اسے اتنے ہی شوق سے دیکھتی ہوں جتنے شوق سے پہلی بار دیکھنا شروع کیا تھا۔ لان میں وہ دادا کے ساتھ کرکٹ کھیلتا۔ پاپا کے ساتھ والی بال، چچا کے ساتھ ریسلنگ یا باقی سب کے ساتھ بیڈمنٹن، میں اسے کھڑکی سے دیکھتی یا لان میں بیٹھ کر، دیکھتی ضرور تھی اور اوصاف بڑھ چڑھ کر ہر کھیل میں اس کے ساتھ حصہ لیتی۔ ہونہہ... ہم سب لڑکیاں ایک ہی اسکول میں تھیں۔ لیکن اوصاف نے ضد کر کے ہادی کے اسکول میں ہی ایڈمیشن لیا۔ اسی کے کالج میں۔ اسی کے ڈیپارٹمنٹ میں... وہ ہادی کا سایہ بنتے بنتے اس کے دل کا حصہ بن گئی۔"

صدھم نے اپنے گال پھر رگڑے۔ دکھ میں نکلنے والے آنسو اب اسے پسند نہیں تھے۔

"اس نے اتنے سالوں میں کوئی موقع نہیں جانے دیا۔ جب اس نے اپنا حق ہادی پر ثابت نہ کیا ہو۔"

"وہ ہادی سے محبت کرتی ہے؟" خیال نے پوچھا۔

"میں کرتی ہوں محبت... وہ تو یہ بھی نہیں جانتی کہ ہادی کس کروٹ سوتا ہے۔ کس وقت اٹھتا ہے... کتنا وقت سوتا ہے۔ میں جانتی ہوں یہ سب۔" وہ رکی۔

"میں بہت کچھ جان چکی ہوں۔ اس نے خود جا کر دادا سے کہا کہ اسے ہادی سے شادی کرنی ہے۔ میں نے بھی سب سے کہا۔ ایک ایک سے کہا۔ ہادی سے بھی کہا اور کس کس سے کہتی۔"

"تم اپنا وعدہ کیوں توڑ رہی ہو صدھم؟"

"کون سا وعدہ؟" وہ چونکی۔

"تم نے خود سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ تم ہمیشہ ہادی کو خوش رکھو گی، جو وہ چاہے گا، وہی تم کرو گی۔"

"میں نے کبھی اسے ناخوش نہیں کیا۔"

"تم ناخوش کر رہی ہو، کر دو گی۔"

"وہ خوش صرف میرے ساتھ رہے گا۔"

"کیا تم نے سب جان لیا ہے؟ جو سب جانتا ہے۔

وہ تو خدا ہے۔ تم خدائی صفت کا دعوا کر رہی ہو۔"

صدہم نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا اور بگڑ کر بولی۔

"اوصاف اس سے محبت نہیں کرتی، میں کرتی ہوں۔"

وہ چلائی اور رونے بھی لگی۔

"کیا تم اندھے ہو، تمہیں میری تکلیف نظر نہیں آرہی کیا؟ دیکھو، میری کیا حالت ہو گئی ہے۔ اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر میں نے کتنی بار اسے مانگا ہے۔ کتنی راتوں میں.... کتنے سجدوں میں.... زبان تھک گئی ہے اب.... دل رو رہا ہے اب.... اب بس۔"

"تمہیں ہادی مل تو رہا ہے صدہم، اندھی تو تم ہو گئی ہو۔"

"کہاں ہے ہادی.... جمعے کو اس کا نکاح ہے اوصاف کے ساتھ، وہ اس کا ہاتھ تھام لے گا۔ وہ اس کے نام ہو جائے گا۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پھر رونے لگی، ہچکیوں کے ساتھ۔

"ہو جانے دو یہ نکاح صدہم۔" اس نے پیار سے کہا۔

اس پر وہ اور رونے لگی۔

"تم کس ہادی کے کھو جانے پر رو رہی ہو؟"

"اپنے ہادی کے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تمہارا "اپنا" کون ہے؟"

"وہ جس سے میں عشق کرتی ہوں۔"

"کس سے کرتی ہو، کس "ہادی" سے؟"

صدہم نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے تو اصل "ہادی" کا ہی تعین نہیں کیا۔"

"میں کر چکی ہوں تعین۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔

"کر چکی ہوتی تو میری یہ حالت نہ ہوتی۔" اس نے اپنے ہاتھوں اور سر کی طرف اشارہ کیا۔ پیشانی پر پھوٹنے والا سیاہ جال اس کی روشن آنکھوں سے ہوتا ہوا چاروں طرف پھیلتا ہی جا رہا تھا۔

"میں اوصاف کو آج زہر پلا دوں گی۔"

سیاہ جال تیزی سے پھیلنے لگا۔ قطرہ قطرہ خون تیزی سے رسنے لگا۔ سر پر زخم اور پھوٹنے لگے۔

"وہ مر جائے گی۔" وہ شدید تکلیف سے بولا۔

"اسے مر جانا چاہیے۔" اس نے انتہائی نفرت سے کہا۔

"یہ ظلم ہے۔" وہ شدید کرب سے بولا۔

"میں بچپن سے اس ظلم کا شکار ہوں۔ میں جس اذیت میں ہوں، وہ موت سے بڑھ کر ہے۔ میں یہ گواہی دوں گی کہ کوئی لڑکا اس سے ملنے آیا تھا۔ اوصاف نے اسے بلایا تھا اور اوصاف....." وہ رکی۔ "وہ مر چکی ہو گی اپنی گواہی دینے کے لیے۔"

"یہ بہتان ہے۔"

"یہ میری پیش بندی ہے، میرا حق ہے۔"

"کیا کبھی اوصاف نے یہ سب کیا؟"

"وہ ضرور کرتی، اگر وہ میری جگہ ہوتی، جو وہ چاہتی ہے اسے سب مل جاتا ہے، سب کچھ۔"

"تم نے اتنا سب کچھ کرنا کیسے سیکھ لیا، تم اسے قتل کر رہی ہو۔ اس پر بہتان لگا رہی ہو، تم انسان سے شیطان بن رہی ہو۔"

"محبت سب سکھا دیتی ہے۔" اس نے گردن اکڑا کر کہا۔

"یہ سب جو تم نے سیکھ لیا ہے۔ محبت نے سکھایا ہے؟"

"ہاں....." اس نے گردن اور اکڑائی، غرور اور تکبر سے۔

"کس کی محبت نے؟" خیال رو دینے والے انداز میں بولا۔

"ہادی کی محبت نے۔" انداز میں اور غرور چھلکنے لگا۔

"ہادی کی نہیں، انسان کی محبت نے۔"

"وہ صرف ایک انسان نہیں ہے۔" وہ چلائی۔

"صرف ایک انسان ہی ہے، ورنہ اس کی محبت تمہیں جھوٹ، نفرت، گناہ، ناشکری، کرنا نہ سکھاتی۔ تم نے غور ہی نہیں کیا ان سب پر، غرور اور تکبر پر، گناہ اور

ثواب پر، نیکی اور بھلائی پر، تم سب بھول گئی ہو، ایک محبت نے تمہیں سب بھلا دیا ہے۔ تم نے تکبر سے سر اٹھا کر خود کو گناہ کے میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔ تم نے دعا کے لیے ہاتھ گرا کر اپنی مرضی کے لیے اٹھا لیے ہیں۔ کیا یہ محبت ہے، جس نے تمہیں منکر بنا دیا ہے۔ اللہ سے محبت کرتیں تو یہ سب نہ سیکھتیں انسان سے محبت نے تمہیں اتنا سکھا دیا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"صد ہم۔۔۔ تم بہت اچھی، لیکن بے حد ڈرپوک بچی ہو۔ جو مائیں میری طرح بیمار ہوں اور ان کی بیٹی تمہاری طرح گھٹی گھٹی ہو تو مت پوچھو کہ انہیں کتنا ڈر لگتا ہے، کیسے کیسے وسوسے گھیرتے ہیں۔ بہادر نہیں بن سکتیں تو اتنا ڈرو بھی مت۔"

صد ہم ان کے سرہانے بیٹھی تھی۔ رات کا وقت تھا اور وہ اسپتال کے کمرے میں دھیمی آواز سے اس سے باتیں کر رہی تھیں۔

"میں تمہیں موت کی حقیقت نہیں بتانا چاہتی، لیکن یہ اتنی بڑی حقیقت ہے کہ خود ہی سب پر آشکار ہو جاتی ہے، کاش موت کا فرشتہ ایک دکاندار ہوتا جسے کچھ دے کر ہم زندگی کا کچھ وقت خرید لیتے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے مرنے پر تم روؤ، میں چاہتی ہی نہیں کہ تم پر کبھی ایسا وقت آئے کہ تمہیں رونا پڑے۔ رونا برا نہیں، ہار جانا برا ہے۔ کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟

اس کے آنسو گرنے لگے اور سر نفی میں۔

"دیکھی نہیں۔" وہ اداس ہو گئیں۔ "تم کچھ تو کر ہی سکتی ہو گی میرے کہنے پر۔"

صد ہم نے بڑھ کر ان کا سر چوم لیا اور پھر آنکھیں۔ ان کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ صد ہم کے اس انداز پر۔۔۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہیں اور کیا رہنے دیں۔

"میری بیماری سے اتنا ضرور ہوا کہ تمہارے دادا اور تمہارے عقیل انکل نے میری ایک بات مان لی۔" وہ رکیں، "میری درخواست پر تمہارے دادا نے تمہارا رشتہ ہادی کے ساتھ طے کر دیا ہے۔ تمہیں بتا رہی ہوں، تاکہ تم یاد بھی رکھو اور دھیان بھی اور نبھا بھی سکو۔

بیٹا لوگوں کے پاس جو ہے اس پر نظر مت رکھنا، مگر جو تمہارا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ اپنا حق سمجھو اور پھر اس کا خیال رکھو، کاش تم کچھ تو۔۔۔ تھوڑی سی ہی سمجھ دار ہوتیں تمہاری ماں نہیں ہو گی تو تمہارا خیال کون رکھے گا۔"

اس رات وہ ساری رات بولتی رہیں اور صد ہم سنتی رہی۔ ٹھیک تین دن بعد وہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئیں۔ وہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کی مریض تھیں۔ ایک ماہ پہلے بی پی شوٹ کرنے جانے سے وہ کوما میں چلی گئیں۔ تین دن بعد وہ ہوش میں تو آ گئیں، مگر ان کی صحت دوبارہ بحال نہیں ہوئی۔ وہ خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔

اس کی ماما نے کہا تھا کہ وہ روئے مت، مگر وہ اس طرح سے روئی کہ اس نے زمین آسمان ایک کر دیا تھا۔

صد ہم۔۔۔ تیرہ سال کی، الگ تھلگ، خاموش سی، بے چاری سی لڑکی، اس نے زندگی میں بہت بڑی خوشیاں نہیں دیکھی تھیں۔ مگر ایک بہت بڑا غم دیکھ لیا تھا۔ اس کے خواب بڑے بڑے نہیں تھے۔ مگر اس کی ایک بڑی حقیقت ماں ایک خواب بن گئی تھی اب۔

"مجھ پر اتنا ظلم ہوا۔ کیوں؟"

اس نے پہلی بار نماز کے بعد دعا میں یہ الفاظ۔۔۔ خاص کر لفظ "ظلم" استعمال کیا۔ اسے اپنی ماں کے مرنے کا اتنا غم تھا کہ اس نے دوبار خودکشی کی کوشش کی۔ دونوں بار اس نے پیٹرول پی لیا۔

صد ہم رو رہی تھی۔ خیال نے ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھ پر اتنا ظلم ہوا۔۔۔ اس سے پہلے میری ماں پر ہوا تھا۔ ماما نے کہا تھا کہ مجھے بہادر بننا ہے اور اب میں بہادر بن گئی ہوں۔" صد ہم نے عزم سے کہا۔

"بہادر تو وہ ہوتا ہے جو صبر کرتا ہے۔ جو برائی سے بچتا ہے۔ کیا تم نے اس کتاب میں پڑھا نہیں ہے؟"

خیال چل کر ایک ریک کی طرف گیا اور ایک کتاب باہر نکالی اور صد ہم کو دکھائی۔

"یہ سب، یہ دیکھو اس میں سب لکھا ہے۔"

صد ہم نے ایک نظر اس کتاب کو دیکھا۔

"اس میں صرف الفاظ اور جملے لکھے ہیں۔" وہ بولی۔

"یہ الفاظ اور جملے عمل کرنے سے اعمال بن جاتے ہیں۔"

"مجھے اعمال میں دلچسپی نہیں۔" ۔۔۔ اب کے انداز زہریلا سا تھا۔

"تمہیں محبت میں دلچسپی ہے؟ انسان کی محبت میں؟"

صد ہم نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے نزدیک وہ بہت بار اس کا جواب دے چکی تھی۔ خیال کو بھی۔

"محبت سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں۔" اس نے صرف سوچا۔

"کس کی محبت؟" اگر وہ کہہ دیتی تو خیال ضرور پوچھتا۔

☼ ☼ ☼

یہ ظلم عجیب انداز سے شروع ہوا۔ کہاں کہاں کیا کیا ہوا۔ لیکن جہاں جو بھی ہوا وہاں صد ہم نہیں تھی۔ یہ سب حالات تھے صد ہم نہیں۔ اس کے پاپا احسن رضا نے اپنی پانچ سالہ منگنی ختم کر کے اس کی ماما زویا سے شادی کی تھی تو صد ہم کے دادا ذاکر رضا نے انہیں گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ بزنس۔۔۔ گھر۔۔۔ دولت، ہر چیز سے بے دخل کر دیا تھا۔ وہ سات سال تک گھر سے باہر رہے، بے اولاد رہے، وہ اجڑ گئے، بدحال ہو گئے، اکیلے اور تنہا ہو گئے۔

گھر واپس جانے اور اپنے ماں، باپ کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے ان کی مرضی سے دوسری شادی کر لی۔

"میں بے اولاد رہنا نہیں چاہتا۔" احسن کا کہنا یہی تھا کہ یہ شادی صرف انہوں نے اولاد کے لیے کی ہے۔

"اللہ آپ کو اولاد والا کرے۔" زویا نے صبر سے کام لیا اور کہا۔

اور وہ کیا کہتیں سات سال پہلے جو شخص ان کے لیے سب کچھ چھوڑ آیا تھا، سات سال بعد وہ انہیں تقریباً" چھوڑ ہی چکا تھا۔ نام کا سہی رشتہ قائم تھا۔ انہیں طلاق نہیں دلوائی تھی۔ احسن کے گھر والوں نے احسن کی بیوی بنے رہنے دیا تھا۔

زویا اپنے الگ گھر میں رہنے لگیں اور احسن اپنے آبائی گھر "رضا ہاؤس" میں۔ ہفتے میں ایک، دوبار وہ زویا کی طرف بھی چکر لگا لیتے تھے۔ سال کے اندر اندر وہ ایک بیٹے کے باپ بن گئے۔ دوسرے سال دوسرے بیٹے کے اور چوتھے سال دو بیٹیوں کے۔ صد ہم اور اوصاف کے۔ اللہ تعالیٰ نے زویا کو بھی اولاد دے دی تھی۔

احسن اکثر اپنے بیٹوں کو زویا کے پاس لے آتے تھے۔ کبھی کبھی کی تقاریب میں زویا بھی "رضا ہاؤس" جانے لگی تھیں۔ انہیں کوئی خاص رتبہ یا پروٹوکول نہیں ملتا تھا۔ مگر بہت زیادہ سرد رویے بھی نہیں ملتے تھے۔ زویا کی ساس ان کا خیال رکھتی تھیں۔ وہ صد ہم کی ماں بن چکی تھیں۔ تھوڑا بہت خیال اور محبت زویا کا حق بنتا تھا۔

میں اپنی زندگی میں خوش تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ "رضا ہاؤس" کیا ہے۔ کیوں ہے۔ میں اور میری ماں وہاں کیوں نہیں رہتی۔ ماما وہاں جانے سے گھبراتی کیوں تھیں۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ ان کے پاس کیا، کیا ہے اور میرے پاس کیا، کیا نہیں ہے۔ پاپا کے ساتھ میں کبھی کبھی وہاں جاتی تھی اور ایک ہادی ہی تھا جو مجھ سے بات کر لیتا تھا۔ گھر کے گیارہ بچوں میں وہ اکیلا۔۔۔ کبھی کبھی ہی سہی، مگر کر لیتا تھا۔

میری ماں زویا کا گھر چھوٹا تھا۔ مگر وہ میرا تھا۔ میں نے زندگی کو جہاں سے وہ مجھے ملی تھی، وہاں سے قبول کر کے گزارنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے وہ ویسی ہی پیاری تھی، میں اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی، ان کی لاڈلی اور بس،

زندگی میں محبت تھی' سکون تھا۔ بے شک وہ ایک ہی شخص کی طرف سے تھا' میری ماں کی طرف سے' صرف ان کی طرف سے۔ سوچو کیسا لگتا تھا جب وہ مجھے صبح اٹھانے سے پہلے میرا سر چومتی تھیں۔ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھیں۔ رات میں آنے والے میرے خواب سنتی تھیں۔ ان پر ہنستی تھیں۔

میرے پاس ایک وہی تھیں... ایک... صرف ایک اور کچھ بھی نہیں تھا میرا... پاپا چند دنوں کے پاپا تھے بس۔ پھر وہ جو صرف میرے لیے تھیں۔ وہ چلی گئیں۔ وہ بھی ہمیشہ کے لیے کیوں؟"

صد ہم کہہ کر رونے لگی۔ اس کا غم تازہ ہو گیا تھا۔

"ان کے اختیار میں نہیں تھا صد ہم۔" خیال بے حد پیار سے بولا۔ اتنے پیار سے صرف زویا ہی اس سے بات کیا کرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

دادا' پاپا سے زیادہ گھر آنے لگے۔ وہ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ اکثر مجھے اپنے ساتھ گھمانے لے جاتے تھے۔ وہ ماما کو بھی پسند کرنے لگے تھے۔ ان کا تعلق بننے لگا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا زویا؟" ایک دن وہ زویا سے شکوہ کر ہی بیٹھے۔ زویا ان ہی کے آفس میں کام کرتی تھیں۔ احسن نے وہیں زویا کو پسند کیا تھا۔

"وہ پاگل پن تھا پاپا۔ محبت کا پاگل پن... نہ احسن نے آپ لوگوں کا سوچا' نہ میں نے اپنی فیملی کا' آپ ناراض رہے تو میرے والدین بھی راضی نہیں رہے۔" وہ بے حد آزردہ ہو کر بولیں۔

"اپنے والدین سے ملا کرو۔" انہوں نے پیار سے کہا۔

"چلی جاتی ہوں کبھی کبھی ان سے ملنے' بھائی تو دونوں امریکہ ہی شفٹ ہو گئے ہیں۔ شاید ماما پاپا بھی ان ہی کے پاس چلے جائیں۔" وہ اداس تھیں بہت۔

"ہم ہیں تمہارے ساتھ زویا! پریشان مت ہو۔"

آہستہ آہستہ کچھ کچھ ٹھیک ہونے لگا' لیکن کہیں کہیں بہت کچھ بگڑنے لگا' بدلنے لگا۔

احسن نے گھر آنا چھوڑ دیا۔ وہ صرف مہینے بعد پیسے دینے ہی آتے اور چلے جاتے۔ ان کے لیے زویا کی بس اتنی اہمیت ہی رہ گئی تھی اب۔ وہ اپنی دوسری بیوی نورین کی محبت میں مبتلا ہو چکے تھے اور نورین کو ان کا یہاں آنا پسند نہیں تھا۔

زویا کا شوگر کا مرض زیادہ بڑھنے لگا تو ڈاکٹر رضا انہیں رضا ہاؤس لے آئے اور وہ کیا کرتے' احسن ان کا خیال رکھتا نہیں تھا۔ وہاں ایک بچی کے ساتھ وہ اکیلی ہوتی تھیں۔ بنا مرد کے وہ اکیلی رہتی تھیں۔

"رضا ہاؤس" جہاں صد ہم کی چھوٹی چچی' احسن کی سابقہ منگیتر نرگس اور اس کی سوتیلی ماں نورین تھیں۔ یہ دو ہی لوگ ان دو لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

"کتنی بڑی جگہ تھی وہ... جہاں ایک بیمار شخص اور بیمار ہو گیا۔ میری ماں ان دونوں کی نفرت برداشت نہیں کر سکیں۔ وہ خالی ہاتھ تھیں۔ ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں تھا۔ شوہر بھی نہیں' اب اگر وہ مزید محبت نہیں کر سکتے تھے تو خیال تو رکھ سکتے تھے نا۔ جب رات کو ماما تکلیف سے کراہتیں تو ان کے پاس صرف میں ہوتی تھی۔ پاپا اپنی بیوی کے ساتھ ہوتے تھے۔ نرگس آنٹی کو ان کا وجود گھر میں برداشت نہیں تھا۔ وہ میرے سامنے آکر انہیں یہ جتاتی تھیں کہ یہ ان کے کیے کی سزا ہے۔ ان کی بیماری... وہ انہیں یہ بتاتی تھیں کہ احسن کو ان سے چھین کر انہوں نے کتنا بڑا گناہ کیا تھا۔ یہ انجام تھا اس گناہ کا۔

تو گناہ کیا صرف ایک نے کیا تھا؟

کیے کی سزا کیا صرف ایک کو ملتی ہے... بولو... اب کیوں نہیں بولتے' تمہارے ہاتھ میں موجود یہ کتاب اب کیا کہتی ہے' کھولو اسے اور پڑھو۔"

"یہ کہتی ہے کہ گناہ اور سزا کا فیصلہ صرف خدا ہی کرتا ہے۔ اور توبہ سب گناہ معاف کروا دیتی ہے۔"

"تو وہ توبہ میری ماں نے کر لی تھی۔ دادا سے' دادو سے' میرے نانا' نانی سے' خدا سے اور کس کس کے پاس جا کر توبہ کرتیں' صرف وہی کیوں جاتیں۔

انہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ گئیں' میرے لیے وہ تایا جی کے پاس گئیں کہ وہ اپنے کسی بیٹے کے لیے مجھے مانگ لیں۔ پھر وہ پھوپھو کے پاس گئیں۔ پھر وہ عقیل انکل کے پاس گئیں۔ وہ دادو' دادا سب کے پاس گئیں' میرے لیے۔"

"انہیں صرف خدا کے پاس ہی جانا چاہیے تھا۔"

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کا ہی خون ہے پاپا! عقیل!" انہوں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"ہم جانتے ہیں' تم اتنی فکر مند کیوں ہو زویا؟ ابھی وہ صرف تیرہ سال کی ہے۔ ہم ہیں نا' تمہیں بھی اللہ سلامت رکھے اور احسن کو بھی' اتنی فکر مت کرو' اتنا ہلکان مت کرو خود کو۔"

"تیرہ سے اٹھارہ اور اٹھارہ سے بیس ہونے میں کتنا وقت لگے گا پاپا۔ میری ایک ہی اولاد ہے' آپ سے کیسے کہوں کہ اس کی کتنی فکر ہے۔ اس کے اکیلے رہ جانے کا درد بہت ہے۔ اس درد کی دوا مجھے کرنے دیں۔"

دادا نے عقیل کی طرف دیکھا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" عقیل فوراً بولے۔

وہ احسن سے چھوٹے تھے اور مزاج میں ان سے بہت مختلف تھے۔ وہ حالات کے ساتھ بخوشی سمجھوتا کر لیتے تھے۔ اسی لیے احسن کی منگیتر نرگس سے بھی شادی کر لی تھی۔

"میرے تین بیٹے ہیں' جس کے لیے چاہیں ہاں کر دیں بھابھی کو۔"

"زمان اور شرجیل کافی بڑے ہیں صد ہم سے' ہادی ٹھیک ہے۔" دادا بولے۔ "اس کی دوستی بھی ہے صد ہم سے۔"

"نرگس مجھے پسند نہیں کرتی۔ لیکن صد ہم احسن کا خون ہے۔ پاپا! آپ اس بات کا خیال رکھیے گا۔ وہ احسن کی بیٹی ہے۔"

"ہادی اور صد ہم کا رشتہ پکا سمجھیے بھابھی۔" عقیل نے انہیں تسلی دی۔ "نرگس کی فکر مت کریں۔ وقت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمارے خاندان کا حصہ ہے صد ہم۔"

"مجھ سے وعدہ کریں۔" زویا نے بے حد التجا لیے کہا۔

"وعدہ ہے بھابھی۔ صد ہم ہماری ہی بیٹی بنے گی' اگر آپ چاہیں تو نکاح کر لیتے ہیں۔"

"نہیں' نہیں' مجھے اعتبار ہے آپ پر' بچے ابھی چھوٹے ہیں' نکاح ٹھیک نہیں' بس آپ کی زبان کافی ہے۔"

لیکن یہ زبان کافی نہیں رہی۔

تین دن بعد زویا کا انتقال ہو گیا۔

اور اکیلی رہ گئی' صد ہم۔

ایک وقت میں اس کے پاس ایک ہی کیوں ہوتا تھا۔

ماں تھی تو ہادی نہیں تھا۔ ہادی ملا تو ماں نہیں رہی اور اب ہادی، وہ بھی۔۔۔

اب وہ اس کے لیے سب کچھ تھا۔ جیسے زویا سب کچھ تھی۔

وہ اس کی ماں کی نصیحت تھا۔

"اپنی چیزوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ان سے پیار کرتے ہیں۔"

وہ ہادی سے پیار کرنے لگی تھی۔

اس نے زویا والی غلطی نہیں دہرائی تھی۔ نہ اس نے کسی اور کی طرف دیکھا، نہ کسی اور کے بارے میں سوچا۔ اس نے کسی کا نہیں چھینا، بس اپنے کا خیال رکھا۔

"ہادی کو میری امانت سمجھ لو، صد ہم خیانت مت کرنا کبھی۔" اور اس نے کبھی اس کی محبت میں خیانت نہیں ہونے دی۔ وہ ہر بار اور۔۔۔ اور محبت کرنے لگی اس سے۔

"تمہاری اس گھر میں اتنی ہی حیثیت ہے کہ تم احسن کی بیٹی ہو اور تم اتنی ہی بے وقعت ہو جاتی ہو۔ کیونکہ تمہاری ماں زویا ہے۔ ہادی سے شادی ہو جائے گی تو تم معتبر بن جاؤ گی۔ خاندان کے ساتھ جڑ کر رہو گی تو ٹھیک رہو گی۔ ورنہ زویا کی طرح اکیلی اسپتال کے بستر پر پڑی ہو گی۔"

وہ خاندان کی حیثیت کو اچھی طرح سے سمجھ گئی۔ اس کا خاندان ہادی تھا۔ وہ یہ سمجھ گئی کہ اب اس کا صرف ہادی ہی ہے۔ ہادی اس کا خاندان ہے۔ اس کی زندگی، اس کی ماں کی پسند، اس کا ہونے والا شوہر۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی اور اسے کرنا بھی کیا تھا۔

کوئی وقت سے پہلے ہی آپ کو بتا جائے کہ آپ کو کیا انعام ملنا ہے تو وقت کٹتا نہیں، وہ بھی ہادی، اپنے انعام کے انتظار میں تھی، وہ پل پل اس کا انتظار کرنے لگی، اپنے ہادی کا۔

"سب جانتے تھے ہادی میرا ہے پاپا۔۔۔ دادا۔۔۔ عقیل انکل۔۔۔"

وہ گال صاف کرتے ہوئے بولی۔

"اور خدا بھی۔۔۔" پھر اسے اٹھا کر کیوں اوصاف کی جھولی میں ڈال دیا۔ جو میرا تھا، اسے کسی اور کا کیوں بنا رہے ہیں۔"

☼ ☼ ☼
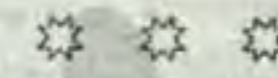
گھر کی سب لڑکیاں ایک ہی اسکول میں جاتی تھیں سوائے اوصاف کے، وہ ہادی کے اسکول جاتی تھی۔ تایا جی کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں کالج اور یونیورسٹی جانے لگے تھے۔ رضا ہاؤس میں چار خاندان آباد تھے۔

تایا جی۔۔۔ احسن۔۔۔ عقیل۔۔۔ اور صد ہم۔۔۔ وہ ایک اکیلی ہی الگ خاندان بناتی تھی کیونکہ وہ زویا کی بیٹی تھی۔ سب اپنے اپنے الگ خاندان کے ساتھ مکمل تھے، وہ زویا کے بغیر بالکل ادھوری تھی۔۔۔ رضا ہاؤس کو مکمل اوصاف کرتی تھی۔ اوصاف جگمگاہٹ تھی اس گھر کی۔۔۔ وہ احسن کی جان تھی۔ دادا کی باربی تھی، تایا کی کرکٹ ٹیم کی کیپٹن تھی۔ پھوپھو کے بچوں کے لیے سنڈریلا تھی، وہ سب کے لیے سب کچھ تھی۔ وہ اوصاف تھی، ہر صفت لیے۔۔۔ ہر رنگ لیے۔

اس کی آنکھیں گہری سبز تھیں۔ بے حد سفید رنگت، سنہری اور ڈارک براؤن بال تھے وہ انسانوں کے لیے بنائی گئی پری تھی۔ تایا جی کی عرشیہ اور امثال اسے خاص طور پر تیار کروا کر اپنے کالج فنکشن میں لے کر جاتیں۔ پھوپھو کے بڑے بیٹے فرید نے اس کا پورٹ فولیو بنوایا اور بڑی بڑی ایڈ کمپنیز میں کڈز ماڈلنگ کے لیے بھیجا، اوصاف نے ملک اور بیرون ملک کے بارہ اشتہارات میں کام کیا۔ وہ ایک ایمبسڈر کڈ بن گئی، ایک ماڈل کڈ۔

"اوصاف دی باربی گرل۔"

"جب وہ لوگ گھومنے کے لیے جاتے تو لوگ روک روک کر اس کی تصویریں بناتے۔ اس کے لیے ساری تعریف کم تھی۔ اس پر ساری تعریف ختم تھی۔

وہ اس گھر میں موجود ہر شخص سے زیادہ خوبصورت تھی۔۔۔ وہ بے انتہا خوبصورت تھی۔

"اتنا سب کچھ اور پھر ہادی بھی۔۔۔ وہ سب کا سب کچھ لے لیتی، میرا صرف ایک ہادی چھوڑ دیتی۔۔۔ پاپا کی ساری محبت اس کے پاس تھی۔ میری محبت چھوڑ دیتی۔"

اتنا کہہ کر صد ہم ہچکیوں سے رونے لگی۔

"اسے بنا مانگے بھی ملتا اور مانگ کر بھی۔۔۔ اور میں نے تو کچھ اور مانگا ہی نہیں تھا۔ "ہادی" کافی تھا میرے لیے، سب کچھ، سب سے زیادہ تھا۔۔۔ وہ ہی تھا۔"

"کیا تم نے ہادی کا تعین کر لیا ہے؟" دوبارہ ایک ہی سوال نہ جانے اور کتنی بار۔

صد ہم نے اس بار غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہادی میرا ایمان ہے۔"

"یہی تو میں نے کہا ہے صد ہم کہ ہادی ہی تو تمہارا ایمان ہے، تم کیوں بھٹک رہی ہو۔ کیوں پریشان ہو، کیوں فکر کرتی ہو، رویا تو ایمان بچانے جاتا ہے، پریشان تو گناہ پر ہوا جاتا ہے، تم رو، رو کر سمندر بھی بہا دو تو بھی وہ صرف آنسو ہی رہیں گے کیونکہ وہ انسان کے لیے بہائے گئے اور بس۔"

"سب لڑکیاں لاہور کالج ہی جاتی تھیں۔ صد ہم بھی وہیں گئی مگر اوصاف کو لمز جانا تھا۔ کیوں۔۔۔ کیونکہ وہاں ہادی تھا۔۔۔ دادا اسے وہاں بھیجنا نہیں چاہتے تھے انہیں وہاں کا ماحول حد سے زیادہ آزاد لگتا تھا مگر ہادی کو جانا تھا تو اوصاف کو بھی جانا تھا۔ وہ ہر اس جگہ ہوتی جہاں ہادی ہوتا تھا، خاندان بھر میں ان کی دوستی مشہور تھی۔ ان دونوں کی دوستی نہ جانے کب شروع ہوئی تب سے جب ہادی اسے بے بی کار میں بٹھا کر لان کی سیر کرواتا، یا اس کے ساتھ کرکٹ کھیلتا۔۔۔ والی بال کھیلتا۔ شاید تب جب وہ اسے بائیسکل چلانا سکھاتا تھا اور تب جب دونوں دادا کی کار چپکے سے ان سے پوچھے بغیر نکال کر لے جاتے۔۔۔ دونوں نے سب کچھ ساتھ ساتھ کیا۔۔۔ وہ ہر کام ساتھ ساتھ کرنا چاہتے تھے۔

کالج جانے سے پہلے ان دونوں میں پہلی بار لڑائی ہوئی تھی۔ لڑائی کی وجہ وہ لڑکیاں تھیں جو ہادی سے فری ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو ہادی کے میوزک بینڈ کے تیسرے کنٹریکٹ میں آئی تھیں۔

وہ اوصاف جتنی ہی خوبصورت تھیں۔ لڑائی کی اس وجہ نے بھی صد ہم کو پریشان نہیں کیا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ ہادی کسی کے بھی ساتھ رہے، ہے وہ اسی کا کیوں ہے اس کا؟ کیونکہ عقیل انکل اسے دے چکے ہیں، اور وہ ہر دعا میں اسے مانگتی ہے۔۔۔ اسے ضرورت نہیں تھی کہ وہ ہر وقت ہادی کا پہرا دیتی رہے۔۔۔ اتنا ضرور تھا کہ اسے دیکھنے، اس سے بات کرنے کا کوئی موقع وہ جانے نہیں دیتی تھی۔ گھر میں وہ کم ہی نظر آتا تھا۔

دو بجے کالج سے آنے کے بعد وہ بمشکل دس پندرہ منٹ تک اپنے کمرے میں رہتا، پھر وہ گھر میں ہی اپنے بنائے اسٹوڈیو میں چلا جاتا جہاں وہ شام تک رہتا۔ پھر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ باہر نکل جاتا اور رات گئے ہی واپس آتا۔ اس کے کمرے میں جانے۔۔۔ کمرے سے باہر آنے۔۔۔ گھر آنے اور گھر سے باہر جانے تک کا ہی وقت اور موقع ہوتا تھا جب وہ اسے دیکھ سکتی تھی، رات بارہ، ایک، دو، تین۔۔۔ جب تک وہ واپس نہیں آجاتا تھا وہ اپنے کمرے میں ہی ٹہل ٹہل کر اس کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ اس کے پاس اور کرنے کے لیے تھا ہی کیا۔ کالج اور گھر۔۔۔ یا دادا کی لائبریری۔۔۔ زویا کے جانے کے ٹھیک دو سال بعد دادو کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اس کا زویا کی طرح ہی خیال رکھتی تھیں۔۔۔ اچھے لوگ اس کی زندگی سے کم ہوتے گئے۔

گھر میں ایک وہی سب سے زیادہ دکھائی دیتی۔ سب سے زیادہ فارغ۔ گھر میں صرف نرگس تھیں جو کبھی بھی کسی بھی موقعے پر اسے مخاطب نہیں کرتی تھیں۔ وقت گزر گیا تھا مگر ان کا رویہ نہیں بدلا تھا۔ نورین صرف ضرورت کی بات کرتیں۔ ویسے بھی گھر اتنا بڑا تھا اور سب کی اپنی اپنی اتنی مصروفیات تھیں کہ

کوئی کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے، کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی اور اسے صرف ہادی کی خبر ہوتی تھی۔

تایا جی نے بڑے بیٹے انس اور بیٹی عرشیہ کی شادیاں ایک ساتھ کیں تو پہلی بار اس نے ہادی سے فرمائش کی۔

"پلیز۔ میرے ساتھ ایک تصویر بنوالیں۔"

"کیوں نہیں..... آؤ ادھر....." ان دونوں نے کھڑے ہو کر ساتھ ساتھ ایک تصویر بنوائی..... اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

اس تصویر کو ہی وہ رات دن آتے جاتے ہر وقت دیکھتی رہتی..... اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے "ہادی" کے لیے لفظ محبت پہلی بار کب استعمال کیا لیکن اسے زیادہ وقت نہیں لگا تھا اسے استعمال کرنے میں..... اب وہ اسے بھولنا نہیں چاہتی تھی۔

اس دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی کہ ہادی وہاں سے گزرا اسے روتا دیکھ کر وہ اندر آگیا، وہ زویا کی وفات کے آٹھ ماہ بعد کا کوئی دن تھا۔

وہ خاموشی سے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

"اب بس کرو رونا صدھم....." اس نے اسے اپنے ساتھ لگا کر بے حد پیار سے کہا اور ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کیے۔

صدھم نے بیچ میں رونا بند کر دیا۔ وہ اس کے سینے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"میرے کمرے میں اتنی ساری گیمز رکھی ہیں جاؤ اور جا کر ان سے کھیلو لیکن ایسے مت روؤ..... مجھے اچھا نہیں لگتا..... کیا تمہیں اچھا لگتا ہے؟" وہ اتنے پیار سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں....." اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"اب رونا نہیں..... آؤ ہم دادا سے کہتے ہیں۔ ہمیں آئس کریم کھلا کر لائیں....."

اسے ساتھ لے کر وہ دادا کے پاس آگیا، زویا کو یاد کر کے وہ دوبارہ روئی ضرور مگر اکیلے رہ جانے کے شدید غم سے نہیں..... وہ اپنے آنسو صاف کر لیتی تھی کیونکہ ہادی کو اچھا نہیں لگتا تھا۔

ہادی اسے اپنے کنسرٹ میں بھی لے کر جاتا تھا، ایسا کوئی امتیازی رویہ نہیں تھا جو ہادی یا اس کے باقی کزنز اس کے ساتھ رکھتے تھے، وہ ان سب کے لیے ان کی ایک کزن تھی۔ اس میں ایسا کچھ خاص نہیں تھا مگر وہ ان سب کے لیے ایک تعلق تھا..... وہ اوصاف کی طرح خوبصورت نہیں تھی مگر عرشیہ اور امشال کی طرح پیاری تھی۔ وہ کسی بھی وجہ سے چونکاتی یا حیران نہیں کرتی تھی۔ وہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی اپنی دنیا میں مگن لڑکی تھی۔

اپنی دنیا۔ ہادی کی دنیا میں گم۔

گھر کے سب لوگ اس کے ساتھ او کے ہی رہتے تھے لیکن ان سب او۔ کے میں سے ایک او۔ کے کم ہو گیا..... نورین۔

☼ ☼ ☼

اوصاف اپنا موبائل اچھالتی دادا کی لائبریری میں آئی، وہ ایسے ہی ہوا میں اچھال کر اپنے موبائل توڑ دیتی تھی۔

"ڈیڈ!" وہ دادا کو ڈیڈ کہتی تھی۔ کبھی کبھی ڈان۔

"کیا میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟ بات سن کر آپ مجھے بتائیں کہ آپ اس کا اعلان کریں گے یا میں کروں؟"

"بات بتاؤ۔" دادا مسکرائے۔

"اس عید سے پہلے مجھے ہادی سے شادی کرنا ہے، آپ کو بتا دیا ہے۔ باقی سب کو آپ بتا دیں۔" اس نے اس طرح کہا جیسے کالج ٹرپ پر جانے کی بات ہو۔

ریک سے کتابیں نکالتے اس کے ہاتھوں کی جان ختم ہو گئی۔ سب کتابیں زمین پر آگریں۔

اوہ..... صدھم! اوصاف نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ "تم یہاں ہو؟ آجاؤ تم بھی..... مل کر طے کرتے ہیں۔"

آج سے پہلے اسے کبھی اوصاف اس طرح بری نہیں لگی تھی۔

"اوصاف۔!" دادا کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔

"ڈیڈ!" اوصاف نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

"پاپا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" نورین بھی وہیں آ گئیں۔

"تم جاؤ اوصاف۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اوصاف وہاں سے چلی گئی' صدہم کو بھی جانا پڑا مگر پیچھے سے جا کر وہ لان کی کھڑکی کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"جسٹس امتیاز کے بیٹے کا پرپوزل آیا ہے' اوصاف انکار کر رہی ہے۔"

"تم انہیں ہاں کہہ دو" دادا فوراً بولے۔

"میں انہیں فوراً "ہاں" کہہ دیتی مگر پاپا یہ... کہہ رہی ہے ہادی..."

"یہ ہادی کا نام بھی نہیں لے سکتی... ہادی میں زویا کو دے چکا ہوں' صدہم کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہے۔"

نورین کو شدید صدمہ ہوا' ٹھیک ہے زویا کی بیٹی کو اس گھر میں سب کچھ ملا' اتنا کچھ ملے گا' انہیں معلوم نہیں تھا۔

"کہاں صدہم... کہاں ہادی۔" چڑ کر وہ طنز کر ہی گئیں۔

"اپنی بیٹی صدہم کے لیے ہی کہہ رہی ہو نا؟" دادا کو بہت برا لگا ان کا انداز۔

"وہ زویا کی بیٹی ہے۔" وہ اور برا مان گئیں ایسے جیسے مرنے والی زویا نے مر کر بھی ایک طمانچہ دے مارا ہو۔ ان کی بیٹی اوصاف کا انتخاب ہادی' زویا کی بیٹی صدہم کے لیے پہلے ہی طے کیا جا چکا تھا۔ کہاں اوصاف کی پسند اور کہاں صدہم کا نصیب... وہ بل کھا کر رہ گئیں...

"ٹھیک ہے۔" وہ اتنا ہی کہہ سکیں اور چلی گئیں اور کھڑکی کے باہر کھڑی صدہم بھی اطمینان سے چلی گئی۔ اس رات وہ اطمینان سے سوئی ورنہ اسے بے چینی لگی رہتی تھی کہ کوئی اس گھر میں ان دونوں کے رشتے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب دادا نے لیا تو نورین کی زبان سے سب کو معلوم ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا...

نرگس آنٹی کو بھی معلوم ہو گیا۔

نرگس آنٹی اس کے کمرے میں آئیں پہلی بار...

"زویا مر تو گئی مگر گر وہ تمہیں سب سکھا کر گئی ہے" انہوں نے سالوں پہلے والی نفرت کا پہلی بار اظہار کیا۔ صدہم کو بہت دکھ ہوا ان کے انداز پر... مرے ہوئے لوگوں کو کوئی ایسے یاد کرتا ہے اور ایسے یاد کرواتا ہے...

نرگس آنٹی دادا کے کمرے میں گئیں' وہ بھی گئی اسے کسی بھی طرح چھپ کے ان دونوں کی باتیں سننی تھیں۔

"جب احسن نے مجھ سے اپنا رشتہ ختم کیا تو آپ نے مجھ سے آ کر کیا کہا تھا..." وہ غصے میں تھیں مگر تحمل سے ہی بولیں۔

دادا گڑبڑا گئے۔

"میں یاد دلاتی ہوں آپ کو۔ آپ نے کہا۔ تم پر ظلم ہوا ہے پر یہ ظلم احسن نے تم پر کیا ہے۔ چاہو تو اس کی سزا مجھے دے لو... جو جی چاہے کرو۔ کیا میں نے کچھ کیا؟" ان کا انداز کاٹ دار ہوا۔

"نہیں..." وہ شکست خوردہ سے بولے۔

"تو آج آپ مجھے اس کی سزا کیوں دے رہے ہیں؟ آپ جانتے ہیں میں زویا اس کی بیٹی سے کتنی نفرت کرتی ہوں' پھر آپ نے ہادی کے ساتھ اس کے رشتے کا کیسے اور کیوں سوچا۔"

"یہ رشتہ عقیل نے طے کیا تھا۔" انہوں نے بودی سی دلیل دی۔

"یہ رشتہ آپ نے طے کروایا ہے عقیل کے ساتھ مل کر۔"

"میرا فیصلہ غلط نہیں ہے بیٹا' کیا تمہارے لیے عقیل کا میرا فیصلہ غلط تھا؟ صدہم بے حد اچھی لڑکی ہے۔"

"وہ زویا کی بیٹی ہے۔"

"وہ احسن کی بیٹی ہے۔" دادا نرمی سے بولے۔

"مجھے یہ یاد نہیں کہ اس کا باپ کون ہے۔ مجھے صرف اس کی ماں یاد ہے۔"

"بھول جاؤ پرانی باتوں کو۔"

"بھول جاتی اگر صرف بات ہی ہوتی۔"

"صدہم کا کوئی قصور نہیں اس سب میں..." ان کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"میرا بھی کوئی قصور نہیں تھا' آپ کچھ بھی کریں' نہیں' صدہم کے لیے میری ناں ہاں میں نہیں بدلے گی۔" وہ تن کر کھڑی تھیں۔

"ایسا انداز مت اپناؤ نرگس! اٹل فیصلے صرف اللہ کے ہوتے ہیں اور ان فیصلوں میں نفرت اور ناپسندیدگی نہیں ہوتی۔"

"اس معاملے میں' میں مجبور ہوں پاپا... پلیز مجھے مجبور مت کریں۔" لفظ اللہ پر وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئیں۔

"یہ کیسا رشتہ ہے نفرت کا جو ہم ہمیشہ بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔" وہ دکھ سے بولے۔ "کیا بلاوجہ کی نفرت گناہ نہیں... تمہاری بھی ایک بیٹی ہے' وقت اور موت کسی کو نہیں چھوڑتے... آج ہم ہیں کل نہیں ہوں گے... پھر... وقت بدلتے کتنا وقت لگتا ہے۔"

ان باتوں نے نرگس پر عجیب سا اثر کیا۔ وہ ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"جن کی اپنی بیٹیاں ہوں ان کے دل تو بہت نرم ہوتے ہیں' کیا یہ کم ہے کہ اس کی ماں نہیں ہے۔ اور وہ کتنے دکھوں کی مستحق ہے۔ اتنے بڑے غم کے بعد بھی... خون تو وہ ہمارا ہی ہے نا۔"

نرگس خاموش سی ہو گئیں۔ لفظ موت نے ان پر گہرا اثر کیا تھا۔ ایک یہ موت ہی ہے' جو سب سے بڑا غم ہے ان کے لیے جو زندہ رہ جاتے ہیں۔ انہیں اپنی بیٹی سارہ بہت پیاری تھی۔ صدہم کی جگہ پر اس کا سوچ کر وہ کانپ سی گئیں۔

وقت اور موت کسی کو نہیں چھوڑتے' وقت گزر جاتا ہے اور موت آ ہی جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"وہ نہیں مان رہی۔" نورین پھر ان کے پاس موجود تھیں۔

"بلاؤ اسے... اور تم جاؤ..."

"یہ سب انکار اور تکرار کیوں ڈیڈ؟" وہ آتے ہی حیرانی سے بولی۔

"جسٹس امتیاز کی طرف سے آنے والا..." انہوں نے بات شروع کی لیکن اوصاف نے ان کی بات کاٹ دی "آنے والا یا جانے والا' مجھے نہیں معلوم کرنا' ان کی دولت' رتبہ' کم آن ڈیڈ... مجھے عہدے مت گنوائیں' کیا ہو گیا ہے آپ کو... آپ چاہتے ہیں میں صاف صاف بات کروں' تو سنیے... میں بے حد... بے حد اور بے حد محبت کرتی ہوں ہادی سے' کیا اتنا کافی ہے یا اور بتاؤں' میں نے تو سوچا تھا آپ سب لوگ خوش ہوں گے' آپ سب کو لگتا تھا کہ میں ضدی ہوں اور اپنی مرضی کروں گی اور نہ جانے وہ "اپنی مرضی" کس طرح کی ہو گی' اب ہادی کا کہہ دیا ہے تو... ایسا کیوں کر رہے ہیں جیسے میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔"

"نورین..." وہ دھاڑے... اوصاف ڈر سی گئی۔

"لے کر جاؤ اس بے شرم کو یہاں سے۔" ان کی بات پر اوصاف حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ حیرت سے صدہم بھی اسے دیکھنے لگی' اوصاف کی اتنی جرأت کہ وہ ہادی کے بارے میں سوچے... اس نے یہ سب باتیں بھی چھپ کر سنی تھیں۔ دادا کا انداز اسے اچھا لگا' وہ جانتی تھی ایسے ہی کسی انداز میں ہادی اوصاف کو جھڑک دے گا۔

"نہ جانے آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔" اوصاف وہیں کھڑی تھی "میں نے ہادی کو فون کیا ہے' وہ آ رہا ہے۔"

"ہادی آ رہا ہے۔" صدہم نے سوچا...

پانچ منٹ بعد ہی ہادی وہاں تھا۔

"تم دونوں جاؤ یہاں سے۔" اس کے آتے ہی دادا نے دونوں کو ایک ساتھ ڈپٹ دیا... ان کا غصہ بڑھنے لگا تھا۔

"ہادی! ڈیڈ نہ جانے کیوں ایسے کر رہے ہیں۔" اوصاف وہاں سے جانے والی نہیں تھی... وہ ہادی کی

طرف مڑی۔

"اوصاف! تم جاؤ یہاں سے۔۔۔" ہادی نے تیز لہجے میں کہا اور وہ چلی گئی نہ چاہتے ہوئے ہی سہی۔

صد ھم جانتی تھی کہ اوصاف زبردستی ہی اپنی بات منواتی ہے ورنہ ہادی اس کی آدھی بات بھی نہ سنے۔۔۔ دوستی اپنی جگہ مگر وہ ہادی پر مسلط تھی اس نے خود کو اس کے گرد جال کی طرح بن دیا تھا۔۔۔ وہ خوبصورتی کا ایک جال تھا اور بس۔۔۔ اور تھا کیا اوصاف میں۔ ظاہری خوبصورتی اور بس۔ اوصاف جا چکی تھی۔

"ہادی! تم بھی جاؤ، مجھے تم دونوں سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

"دادا! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"میں نے تمہارے لیے صد ھم کو پسند کیا ہے۔۔۔ بس مجھے انکار نہیں سننا۔۔۔" دادا نے بات الجھا کر کی۔ سیدھی طرح کرنی چاہیے تھی۔

ہادی حیران سا انہیں دیکھنے لگا۔ "صد ھم!" وہ بڑبڑایا۔ "صد ھم کو کون ناپسند کر سکتا ہے۔۔۔ وہ اتنی پیاری ہے، لیکن اوصاف کے مقابلے میں آپ کسی کو بھی لا کر کھڑا کریں گے تو میں انکار ہی کروں گا۔۔۔ آپ جانتے ہیں میری اور اوصاف کی دوستی کو۔" دادا سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگے۔

کھڑے کھڑے صد ھم کے جسم میں سے جان نکل گئی۔۔۔

"اگر اوصاف نہ ہوتی تو میں کبھی آپ کو انکار نہیں کرتا۔ اب آپ بھی مت کریں۔" ہادی صاف گوئی سے بولا۔

اس آخری بات سے وہ متفق تھی اگر اوصاف نہ ہوتی اگر وہ ہوتی ہی نہ تو۔۔۔ اسے ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مگر فی الحال تو وہ تھی۔۔۔ موجود تھی۔۔۔

☼ ☼ ☼

"مجھے اور حسن کو ہادی کے ساتھ رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ بھی اعتراض مت کریں۔"

"ہادی صد ھم کا منگیتر ہے۔" دادا کڑے تیور لیے بولے۔

"ہادی اوصاف کے ساتھ خوش رہے گا۔"

"وہ صد ھم کے ساتھ بھی خوش رہے گا۔" دادا اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ احسن اور نورین آج ایک ساتھ آئے تھے۔

"ہم صد ھم کی کہیں اور۔۔۔ اچھی جگہ کر دیں گے۔" احسن بولے۔

"کیا صد ھم تمہاری بیٹی نہیں ہے احسن؟ ساری حمایت تم اوصاف کی ہی کر رہے ہو۔"

"بیٹی ہے اسی لیے کہہ رہا ہوں، دونوں کی پسند کو جانتا ہوں، سب جانتے ہیں اوصاف اور ہادی کی دوستی کو۔۔۔"

"صد ھم سے پوچھا اس کی پسند کا۔۔۔؟"

"صد ھم کسی کے ساتھ بھی خوش رہ لے گی مگر اوصاف نہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں صد ھم اور اوصاف کے فرق کو، آپ جانتے ہیں کہ اوصاف کیا ہے اور صد ھم کیا۔"

دونوں میں ایک ہی فرق تھا ایک محبت کرتی تھی اور اظہار بھی کرتی تھی اور دوسری محبت کرتی تھی اور خاموش تھی۔

صرف صد ھم تھی جو لائبریری، ہال، دادا کے کمرے میں ہونے والی گفتگو کو جانتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں اور کان اچھی طرح سے کھول لیے تھے وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ بے خبری میں ماری جائے۔

ہادی اپنے کنسرٹ کے لیے شہر سے باہر تھا اور اوصاف بھی اس کے ساتھ تھی۔ دادا بہت بے چین رہتے تھے اور وہ کسی کی بھی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔۔۔ وہ جانتی تھی، دادا اس کا حق کسی کو نہیں لینے دیں گے۔۔۔ ہادی صد ھم کا حق تھا اور ان کا فرض تھا اس کا حق اسے ہی دینا۔

نورین آنٹی نے ایک بار پھر دادا، تایا جی، پھوپھو، عقیل انکل اور نرگس آنٹی کو بات چیت کرنے کے لیے اکٹھا کر لیا۔

"نہیں نورین! ہادی کے رشتے کے لیے میں صرف صد ھم کے لیے ہی ہاں کروں گی۔" اس جواب نے نورین کی گویا زبان چھین لی، انہیں یقین نہیں آیا کہ صد ھم کے لیے یہ نرگس کہہ رہی ہیں، ثریا کی بیٹی کے لیے۔

"وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" نورین بمشکل اپنا غصہ دبا کر بولیں، ان کی بیٹی کے مدمقابل ایک صفر لڑکی تھی۔ یہ بھی ان کی بے عزتی ہی تھی۔

"میں ہادی کو سمجھا لوں گی۔ ایک مرتے ہوئے انسان سے میرے شوہر نے وعدہ کیا ہے۔۔۔ مجھے بھی مرنا ہے۔۔۔ میری بھی ایک بیٹی ہے۔"

"اوصاف ایسا نہیں ہونے دے گی نرگس!"

"تم اسے سمجھاؤ۔۔۔ اسے بتاؤ کہ صد ھم کا رشتہ سالوں پہلے سے ہی طے ہے۔" نرگس انتہائی سنجیدگی لیے بولیں۔

"میں تو آپ کو سمجھا رہی ہوں، گھر میں لڑکوں کی کمی نہیں ہے، ہادی نہ سہی، شرجیل ہے۔۔۔ جذباتی ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے سوچیے! عقیل نے وعدہ کیا تھا تو شرجیل سے کر دیتے ہیں۔"

دادا اس بات پر سوچنے لگے۔

"اوصاف اور ہادی نہیں مانیں گے۔ آپ سب مان جائیں، اگر ہادی صد ھم کے لیے مان جاتا ہے تو آپ ان دونوں کی کر دیں، اوصاف نہیں بھی سمجھے گی تو کیا کر لے گی۔۔۔" نورین نے منہ بنا کر کہا۔

"اوصاف کے ہوتے ہوئے ہادی صد ھم کے لیے کیسے مان جائے گا۔"

سب جانتے تھے، اوصاف زمین آسمان ایک کر دے گی۔ خود کو جلا دے گی۔ دنیا کو آگ لگا دے گی مگر کسی کی نہیں اپنی منوائے گی اسے ہادی چاہیے تھا اور بس۔۔۔ اور اسے۔۔۔ صد ھم کو؟

"آپ نے نکاح کا اعلان کر دیا ہے دادا؟" وہ دادا کے سامنے تن کر کھڑی تھی۔

"ہاں۔" وہ شرمندہ سے ہوئے۔ "دونوں کی مرضی تھی تو۔۔۔" وہ اتنا ہی کہہ سکے۔

"اور میری مرضی۔۔۔؟" وہ پہلی بار ان سے ایسے مخاطب تھی۔

"تمہاری مرضی۔۔۔" وہ حیران ہوئے۔

"ماما نے مجھے بتا دیا تھا۔ میرے اور ہادی کے رشتے کے بارے میں۔"

وہ چونکے، انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ اس بات سے واقف ہے۔

"تمہارا اور ہادی کا نہیں بیٹا! تمہارا اور شرجیل کا۔۔۔" انہوں نے صاف جھوٹ بولا۔

"جھوٹ مت بولیے دادا! آپ سب جانتے ہیں۔" وہ رونے لگی۔ "کتنے ظالم ہیں آپ، کتنی ظالم ہیں نورین آنٹی، اپنی بیٹی کا مقدمہ لڑ کر جیت گئیں۔ ماما زندہ ہوتیں تو وہ بھی میرے لیے لڑتیں۔ آپ کو یاد دلاتیں آپ کا وعدہ۔

کوئی میرے لیے نہیں لڑا، میں صرف آپ کا خون ہوں، آپ کی بیٹی نہیں، میرا کوئی نہیں۔ میں کسی کی نہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔" وہ پیار کرنے اس کے قریب آئے۔ "ہم شرجیل کے ساتھ۔۔۔"

"محبت کے بدلے میں آپ تعلق دے رہے ہیں۔"

"میں مجبور ہوں۔ ہادی اوصاف سے۔۔۔"

"آپ مجبور نہیں ہیں، غلط ہیں آپ، غلط کیا آپ نے۔"

"ہادی کی مرضی یہی ہے۔" یہی ایک ٹھوس دلیل تھی ان کے پاس۔

"ہادی کی مرضی مجھے ہونا چاہیے تھا۔ آپ کو اسے، سب کو بتانا چاہیے تھا ہمارے رشتے کے بارے میں۔۔۔ اپنے وعدے کے بارے میں۔"

"میں ایسا کرتا تو بھی ہادی اپنی ہی مرضی کرتا۔"

"یہ ایک نام نہاد عذر ہے بس۔۔۔ میری ماں کو کوئی محبت نہیں دے سکا، مجھے بھی نہیں دے سکا، میں شرمندہ ہوں کہ میں اس خاندان کا حصہ ہوں جہاں

لفظوں کا پاس نہیں، جہاں مرنے والے اس لیے مرجاتے ہیں کیونکہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، جہاں زندہ لوگوں کو اکیلا اور تنہا کردیا جاتا ہے انہیں کچھ دیا نہیں جاتا، لیکن کسی کا دیا ان سے چھین لیا جاتا ہے۔"

کہتے کہتے وہ ہانپ گئی، دادا خاموش کھڑے سنتے رہے۔

ہادی کنسرٹ سے واپس آیا تو وہ رات گئے اس کے کمرے میں گئی۔

"تم سوئیں نہیں ابھی تک۔" وہ حیران ہوا۔

"مجھ سے شادی کرلو۔" ہاتھوں کو مسلتے وہ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی۔

شوز اتارتے اس نے رک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بہت دیر تک دیکھتا ہی رہا پھر کھڑے ہوئے آہستہ سے اس کا گال تھپتھپا کر بولا۔

"جاکر سوجاؤ۔۔۔ بہت رات ہوگئی ہے۔"

اور وہ کمرے میں آگئی مگر سوئی نہیں۔۔۔ سوتی کیسے۔

اس نے ہاتھ پھیلائے اور دعا مانگی اور مانگتی ہی رہی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے ہاتھ پھیلائے اور ہادی کو مانگا۔ تم شمار نہیں کرسکتے اتنی بار۔۔۔ اتنی شدت سے مجھے ہادی چاہیے۔۔۔ مجھے ہادی چاہیے۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔

"پاپا نے میری حمایت میں ایک لفظ نہیں کہا، دادا خاموش رہے، عقیل انکل، نرگس آنٹی سب خاموش رہے، میرے لیے کچھ بھی نہیں۔ سب کو اوصاف ہی نظر آئی حسن۔۔۔ ذہانت۔۔۔ ماں باپ، کامیابی اور ہادی۔۔۔ اللہ کو اوصاف کی جھولی ہی نظر آئی سب دینے کے لیے اور جو کب سے میرے ہاتھ پھیلے تھے وہ۔۔۔؟ مجھے نفرت ہے ہر انسان سے۔۔۔ اوصاف سے، پاپا سے، نرگس آنٹی، نورین آنٹی، دادا، سب سے۔" وہ تنفر سے بولی۔

"کیسی محبت ہے تمہاری جس نے تمہیں نفرت سکھادی۔"

خیال اتنے دکھ سے بولا کہ وہ خود کو بھول کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کتنا کبیرہ گناہ ہے نفرت، کس مذہب سے سیکھا ہے تم نے، یا ان کتابوں سے؟" اس نے کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

پیشانی سے پھوٹنے والے سیاہ جال نے اس کی آنکھوں میں پھیل کر ان کی بینائی لے لی۔ اس کی آنکھوں سے سیاہ سیال ٹپکنے لگا اور جال تیزی سے سارے جسم میں پھیلنے لگا، سفید لباس تیزی سے سیاہ ہونے لگا، ہاتھوں سے اٹھنے والی بدبو بڑھتی ہی جارہی تھی۔ تیزی سے پھیلتے سیاہ جال نے اسے ہیبت ناک بنا دیا تھا انسانی آنکھ اتنے کریہہ منظر کو دیکھ نہیں سکتی تھی، مگر صدہم کو دیکھنا تھا۔

"میرا کوئی بھائی نہیں۔ بہن نہیں، باپ تک میرا نہیں، ایک ماں تھی اور وہ بھی نہیں۔ ایک ہادی ہے، وہ کیسے کسی کو دے دوں؟ اجنبیوں کی طرح اس گھر میں زندگی گزاری ہے، ایسے جیسے مسافر ہوں۔"

"یہاں کیا کیا کس کا ہے؟ یہ سورج چاند ستارے کس کے ہیں؟ یہ فلک کی چھت کس کے لیے؟ چیزوں پر ہاتھ کیوں رکھتی ہو۔ کیا پیغمبروں نے، نبیوں نے، ولیوں نے مسافروں کی طرح زندگی نہیں گزاری؟ انہوں نے دنیا کی چیزوں پر ہاتھ نہیں رکھے صدہم۔"

"میں نبی یا ولی نہیں۔۔۔ میں انسان ہوں، اس دنیا کی ہوں۔"

"وہ بھی انسان ہی تھے، اسی دنیا کے تھے اور یہ کیسی محبت کہ تم نے نماز چھوڑ دی، دعا چھوڑ دی، نفرت سیکھ لی۔۔۔ کتنا وزن ہے اس محبت کا؟ آؤ ذرا دیکھیں۔"

ہاتھوں کے دستانے اور سر کا رومال اٹھا کر اس نے صدہم کے ہاتھ میں پکڑا دیا بائیں ہاتھ میں۔۔۔ لیے کے کروڑویں حصے میں صدہم نے وہ نیچے پٹخ دیے۔

"بہت وزنی ہے نا۔۔۔ بائیں ہاتھ میں پکڑ نہیں سکتیں۔ دائیں ہاتھ سے چھوؤگی نہیں۔۔۔ صدہم یہی ہے سب کچھ۔ یہ تم پر ہے کہ تم انہیں کن اعمال سے وزنی کرتی ہو۔ دائیں میں پکڑنے کے لیے تیار کرتی ہو یا بائیں میں پکڑنے کے لیے۔ روز قیامت کیسے پکڑوگی۔۔۔ بائیں ہاتھ میں؟"

سفید لباس سیاہ تر ہوگیا۔ پھر وہ لباس پھٹنے لگا اور جسم کے زخم پھوٹ پھوٹ کر نظر آنے لگے۔ ان میں سے پیپ رسنے لگی۔

"تم نے مجھے کتنا بدصورت بنادیا صدہم۔"

سیال رستا ہوا جوتوں پر گرا اور ڈوریوں کے جال کو آہستہ آہستہ تیزاب کی طرح جلانے لگا۔ ساری کی ساری ڈوریاں کھل گئیں اور خیال لڑکھڑا گیا جس پہاڑ سے وجود کو انہوں نے باندھ رکھا تھا اب وہ آزاد تھے۔ اب وہ کسی بھی راستے کی طرف جاسکتے تھے۔ انہیں باندھے رکھنے والے مضبوط دھاگے جل چکے تھے۔ اب وہ گناہ کی طرف بڑھنے کے لیے تیار تھے۔

"آف۔۔۔!" وہ نیچے گر گیا۔ "اب یہ پاؤں چل کر خدا کی بارگاہ تک نہیں جائیں گے کیونکہ انہیں ہادی نہیں ملا۔"

"ہاں نہیں جائیں گے یہ۔" وہ بھی چلائی۔

"ہائے۔۔۔!" خیال نے اپنے دونوں بازو اپنے گرد لپیٹ لیے۔ پھر اپنی آنکھوں کو ٹٹولنے لگا۔

"میں اندھا ہوگیا ہوں، میری آنکھوں کا نور چلا گیا ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔"

"مجھے اس کے آگے پیچھے کچھ نظر نہیں آرہا۔ مجھے دنیا نظر آرہی ہے، دنیا کا مالک نہیں، مجھے دنیا میں رہنے والے چاہئیں۔ دنیا بنانے والا نہیں، میری چاہت، میری آنکھوں کا نور نگل گئی۔ ہاں اندھی ہوگئی ہوں میں، مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

اس کے کانوں میں سے بھی سیال رسنے لگا اور دھواں نکلنے لگا۔ "او خدا مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ رحمتوں کے قصے، خدائی محبت کے وعدے۔ قرآن کی آیتیں۔۔۔"

"مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔۔۔ مجھے محبت نے بہرا کردیا ہے، میں نے اپنے کان لپیٹ لیے ہیں، اللہ نے میری نہیں سنی، مجھے بھی اس کی نہیں سننی۔ ہاں بہری ہوگئی ہوں اب میں، کیا سب میرے لیے بہرے نہیں ہوئے؟ کیا سب کو جواب نہیں دینا اپنے اعمال کا اللہ کو، صرف میں ہی کیوں۔۔۔ سب میرے لیے ہی کیوں؟"

"تمہیں اپنے اعمال کی فکر نہیں تو دوسروں کے اعمال کی فکر کیوں کرتی ہو۔" اس بار وہ دھاڑ کر بولا۔

"بس کرو۔۔۔ خدا کے لیے۔" صدہم چلائی۔ بدبو سے اس کا دماغ پھٹنے کے قریب تھا۔ "رحم کرو مجھ پر۔" وہ رونے لگی۔ "چلے جاؤ یہاں سے۔"

"تم رحم کرو۔۔۔ مجھ پر رحم کرو۔۔۔ ایک بشر کے لیے مجھے خدا کی محبت سے محروم نہ کرو۔ مجھے جنت نہیں چاہیے۔ جنت کا مالک تو چاہیے نا۔۔۔ میری آنکھوں کو میرا نور واپس دے دو۔ میرے کانوں کو ہدایت کی صدا دے دو صدہم۔"

خوب صورتی کا پیکر سیاہ سیال میں ڈھل کر زمین بوس ہونے لگا۔

"صدہم! مجھے بچالو۔ تم ہی بچاسکتی ہو مجھے۔"

"میں خود خالی ہاتھ ہوں۔" وہ ضدی انداز سے بولی۔

"جس کے پاس ایمان ہے، وہ خالی ہاتھ نہیں ہوسکتا۔ آنکھیں کھول کر صرف ایک بار اور خود کو ٹٹول لو۔ ڈھونڈ لو وہ ایمان جسے کل رات تم نے جلا دیا۔ صدہم اس گناہ کا بار۔۔۔ یہ کون اٹھائے گا۔ اسے اٹھا کر کیسے معافی مانگوگی۔ کیسے گڑگڑاؤگی؟"

"میں اوصاف کو زہر دوں گی۔۔۔ ضرور دوں گی۔۔۔ ہادی میرا ہے۔"

"ہادی ہی تو تمہارا ہے صدہم۔۔۔ ہادی کا تعین کرلو۔"

"میں کرچکی ہوں، ہادی میری جان ہے۔"

"یہ جان کب تک ہے؟ تیس سال۔۔۔ چالیس سال۔۔۔ اسی سال۔۔۔ کب تک ہے یہ جان تم میں۔۔۔؟ اتنے سے سالوں کے لیے ابد کا سودا۔۔۔ چند عشروں کے لیے۔۔۔ چند عشروں کی زندگی کے لیے۔۔۔ چند عشروں کی

سانسوں کے لیے۔۔۔ ابدی محبت کو مت ٹھکراؤ۔۔۔ صرف ایک انسان کے لیے۔۔۔ کل جہان کے مالک کو مت بھلاؤ۔ تمہاری یہ نفرت سب اعمال لے ڈوبے گی تم ایک انسان کو مار دو گی۔۔۔ اللہ سے معافی کیسے مانگو گی۔ کیسا لگے گا جب دعا کے بجائے توبہ کرنی پڑے گی' توبہ کی نوبت مت لاؤ۔"

"مجھے نہیں چاہیے معافی۔۔۔ کون کرے گا توبہ۔۔۔" تکبر سا تکبر تھا۔

"نہیں۔ اللہ سے معافی بھی نہیں چاہیے۔" وہ موم کی طرح پگھلنے لگا تعفن جان لیوا ہو گیا۔

"تمہیں صرف ہادی چاہیے۔ دنیا میں بسنے والا۔ دنیا کا ہادی چاہیے او خدایا۔"

وہ رونے لگا۔ چلانے لگا۔

"ہادی کا فیصلہ کر لو صدھم! کون ہے ہادی۔ کائنات کے ہادی کو پالو۔ وہ تمہارے لیے سو بشر بنا دے گا۔ تم اس ایک ہادی کو کہاں ڈھونڈو گی۔

اپنی نمازوں اور تہجد کے سجدوں کو بچالو۔ اپنے صبر' اپنی نیکی کو بچالو۔۔۔ جھکنا سیکھ جاؤ۔۔۔ مان جاؤ راضی بہ رضا ہو جاؤ۔ دعا مانگو۔۔۔ اللہ سے زبردستی مت کرو۔۔۔ دعا مانگنے والوں میں سے ہی رہو۔

تم اللہ کی حکمت جان نہیں سکتیں تو اس کے غلط ہونے کا دعوا بھی مت کرو۔

اللہ کو مت بتاؤ کہ اسے تمہیں کیا کیا دینا ہے۔

اس کو مت جتاؤ کہ اس نے تمہیں کیا کیا نہیں دیا۔ کیا کیا دے کر چھین لیا۔۔۔ کیا کیا دینا تھا۔ اپنی مرضی کی فہرست پھاڑ دو۔

اسے مت سناؤ کہ وہ نہیں سنتا۔۔۔ یہ کفر ہے۔۔۔ یہ کفر تم نے کیسے سیکھ لیا۔۔۔ خدا کے بندے یہ کفر نہیں سیکھتے۔

اسے کچھ مت بتاؤ' اس سے اپنی محبت بیان کرو' نفرت نہیں۔۔۔ ہاتھ اٹھا کر صرف چیزیں مت مانگو۔"

"وہ میری نہیں سنتا۔۔۔ اس نے مجھے کچھ نہیں دیا۔" وہ اور اونچی آواز سے رونے لگی۔

"اس کے لیے اپنی طرف سے کوئی جھوٹ مت گھڑو۔

گنو وہ سب، جو تمہارا ہے اور اس کا وزن کرو اور گنو' وہ سب، جو اللہ کا ہے اور اس کا وزن کرو۔۔۔ سمت کا تعین کر لو صدھم۔۔۔ ہادی کو پہچان لو۔"

"مجھے ہادی چاہیے۔۔۔ ہادی۔۔۔ میرا ہادی۔"

خیال آہ و بکا کرنے لگا جیسے گونگے کرتے ہیں۔۔۔ وہ اندھا بہرا' گونگا' لنگڑا' لولا ہو چکا تھا۔ تازہ گوشت کو جلائے جانے کی بدبو سے ہال بھر گیا گندگی اور غلاظت کا ڈھیر قالین پر جمع ہونے لگا۔

اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ ایک دھن بجا کر جائے گا وہ صدھم کی مرضی کی دھن بجا رہا تھا' وہ اس طرح سیاہ سیال میں جل کر راکھ ہو گیا جیسے کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کا نشان تک ختم ہو گیا۔ اس کا وجود گناہ کے خیال سے ہی جل کر راکھ ہو گیا بدبو دینے لگا۔

وہ صدھم کی تخلیق تھا۔ اس کا خیال تھا' اس کا نفس تھا جو اس نے بچپن سے تراشا تھا اس نے اس خیال کو عجیب انجام سے دوچار کیا۔ کیا ہے یہ انجام' کیا وہ انجام جو موت کے بعد نظر آئے گا انجام دیکھنے کے لیے موت کا انتظار ہی کیوں؟ یہ انجام پہلے کیوں نہیں دیکھ لیتے۔

☼ ☼ ☼

کاؤچ پر لیٹے لیٹے صدھم کی آنکھ کھلی' کمرا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر رات ہو چکی تھی' اس کی آنکھیں اور بالوں کی چند لٹیں آنسوؤں سے تر تھیں اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کیے۔ وہ شاید بہت دیر تک اور بہت زیادہ روتی رہی تھی۔ اٹھ کر اس نے لائٹ روشن کی۔ گھر خالی تھا' نڈھال سی چلتی وہ اوصاف کے کمرے میں آئی۔

"یہ دیکھو' نکاح کا جوڑا آگیا بن کے۔" اس نے صدھم کو شرارہ پکڑایا اور صدھم نے اسے انگور کا جوس۔۔۔

"صرف ایک گلاس؟" وہ مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔

"اوہ۔۔۔! جگ میں کچن میں بھول آئی ہوں۔" وہ گئی اور جگ لے آئی۔

اوصاف گلاس ختم کر چکی تھی اور شرارہ دیکھ رہی تھی۔

"کیسا لگا جوس؟" صدھم دوپٹا پکڑ کر دیکھنے لگی۔

"بہت اچھا۔۔۔ ویسے بھی مجھے آج سب کچھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ سنو صدھم۔۔۔ پاپا بتا رہے تھے کہ جلد ہی تمہاری اور شرجیل کی بھی۔۔۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

صدھم خاموش ہی رہی' اسے شرجیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"تم خوش ہو؟" اس نے اوصاف کی طرف دیکھا۔

"خوش۔۔۔ بے حد چھوٹا لفظ ہے۔"

"تمہیں ہمیشہ سے معلوم تھا نا کہ ہادی تمہارا ہی ہے۔" خلا میں نظریں ٹکائے صدھم پوچھ رہی تھی۔

"ہاں! جن سے محبت کی جاتی ہے ان کا معلوم ہی ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ہی ہیں۔"

"مجھے بھی معلوم تھا کہ وہ میرا ہے اور میں اس کی ہی ہوں پھر نہ جانے میں کیوں بھول گئی' صرف چند مہینوں میں ہی میں اسے بھول گئی۔" صدھم کھوئی کھوئی سی بولی۔

"کسے۔۔۔؟" اوصاف نے پلٹ کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

"اپنے ایمان کو' اس ایمان سے اپنی محبت کو۔"

اوصاف الجھ سی گئی۔

"میں نے سنا تھا دادا چاہتے تھے کہ تمہاری اور ہادی کی۔۔۔ تمہیں ہادی اچھا لگتا ہے کیا؟" اس نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"ہاں۔۔۔!" اس نے پرزور انداز سے سر ہلایا۔ "بہت۔۔۔"

اوصاف سمجھی وہ مذاق کر رہی ہے۔

"بہت نہیں' صرف وہی۔" پھر صدھم نے جیسے فیصلہ سنایا۔

اوصاف نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ "مذاق کر رہی ہو نا؟"

"نہیں' ابھی تو سنجیدہ ہوئی ہوں۔"

"تم کس ہادی کی بات کر رہی ہو؟"

"میں ہادی ولد عقیل احمد کی بات نہیں کر رہی اوصاف!"

اس نے جگ اٹھایا جسے وہ آدھا خالی کر چکی تھی۔

"میں اس ہادی کی بات کر رہی ہوں جس کی میں ہوں اور جو میرا ہے۔۔۔ اس کے لیے میں کچھ بھی چھوڑ سکتی ہوں۔ تمہارے ہادی کو بھی۔"

اوصاف نے اسے ناسمجھی سے دیکھا۔

"میں واحد اور لاشریک کی بات کر رہی ہوں' اپنے ہادی کی۔۔۔ جس کا تعین اب میں کر چکی ہوں۔"

☼

سائرہ رضا

پیدا ہوئی تو اذان دے کر کان میں ببانگ دہل بتا دیا گیا، مسلمان ہوئی ہو۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی۔ بے چینی اضطراب..... اے خالق! کہاں بھیج رہا ہے اور کیوں؟ مجھے تو تیرے ہی پاس رہنا ہے۔ نہیں جانا کہیں بھی..... "مگر اطاعت ہی شرط بندگی ہے۔ سو نو مہینے کوکھ کا پیالہ جو حکم خداوندی سے پرسکون جھیل جیسا تھا اس میں تیرتی رہی۔ جدھر کو جی چاہا نکل گئی اتنی وسیع دنیا ہوتی ہے اس مشکیزے کی کہ.....

اب کیا بتاؤں، آپ سب بھی تو اس کی سیر و قیام سے واقف ہیں ہی.....

مگر دنیا میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وقت پورا ہوا تو منہ کے بل سجدے کی سی حالت میں باہر آنا ہی پڑا اور ڈولتے دل کو قرار ملا۔ ہاں! مسلمان ہوئی ہوں۔

پھر کچھ وقت گزرا۔ دیکھنا آیا..... سمجھنا..... سننا..... اور پھر بولنا۔

اور یہ بھی پتا لگا کہ فقط اذان و اعلان سننا کافی نہیں تھا۔ ابھی تسلیم اور یقین کو بہت کچھ باقی ہے اور پھر ایک فہرست تھی۔ ہاں کی..... اثبات اور ایمان کے تقاضے۔

ہاں! میں مانتی ہوں، اللہ ایک ہے۔

اور ہاں! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری نبی اور بندے ہیں۔

اور ہاں! تمام ارکان ادا کروں گی۔

اور ہاں! ہاں، بالکل میں روز حشر پر یقین رکھتی ہوں۔

کہ قیامت آئے گی اور حساب کتاب ہوگا، جواب دینے ہوں گے اور سب کچھ بھگتنا ہو گا۔ وہ بہت تاریک دن ہو گا۔ ایسی تاریکی کہ سورج ہاتھ اٹھانے سے مٹھی کے اندر..... اور ایسی روشنی جو بینائی کھا جائے اور پیاس ہوگی اور بھوک اور برہنگی۔

قیامت آپ کے اپنے ہاتھ سے پیٹی گئی تالی کی گونج ہوگی۔

جتنی طاقت اور لگن ہمت سے ہاتھ پر ہاتھ مارا گیا تھا۔ آواز یہاں تک جائے گی۔

اور پھر ویسا ہی جوابی رد عمل۔

اور آج وہی روز یقین آگیا تھا۔ اللہ کا حکم ظہور پذیر ہو گیا۔

یہ روز اضطراب تھا۔ روز حساب، روز حاقہ، روز قصاص، روز گریہ، روز غاشیہ، روز مصیبت، روز قارعہ اور..... اور..... اور جی ہاں! جس روز حشر سے ڈرتے رہے اور ڈراتے رہے، وہ بالآخر آن پہنچا اور یہ بالکل بھی ویسا نہیں ہے، جیسا ہم سنتے رہے، سناتے رہے اور توبہ توبہ کرتے رہے۔

یہ اس سب سے بہت ہولناک ہے۔ بہت تاریک بہت خراب۔

یہاں سایہ نہیں ہے۔ نہ کوئی جائے پناہ
بھاگ کر جائیں تو جائیں کہاں.....

لباس فطرت میں انسانوں کا جم غفیر..... ٹھٹھ کے ٹھٹھ..... سر ہی سر..... سورج کی حدت سے پگھلتے دھڑ ہی دھڑ.....

اتنے چہروں میں کوئی آشنا نہیں ہے۔
کسی غلام اور فقیر کی پہچان کی کوئی نشانی نہیں۔
کسی آقا و بادشاہ کی شناخت نہیں

سب انسان

کون ظالم، کون مظلوم۔ اسی کا فیصلہ بس آج ابھی ہوا چاہتا ہے۔ مگر قیامت کے روز کا "آج اور ابھی" کتنے برسوں صدیوں پر محیط ہو گا، اللہ ہی جانے..... ہم جو صدیوں پہلے قبروں کے مکین تھے۔ ہمیں بھی اٹھا کر ہانکتے ہوئے فرشتے یہاں لا کر پٹخ گئے ہیں۔

نامۂ اعمال کس ہاتھ میں دیا جائے گا۔ کچھ خبر نہیں۔

آگ پر دھری چربی کی طرح پگھلتی کھال اور لٹکتی زبانوں کے ساتھ کسی کو کوئی ہوش نہیں، کچھ یاد نہیں۔

یہ قیامت ہی کا دن ہے، کوئی خواب نہیں.....
میں اپنے ماں باپ کو نہیں پہچان رہی..... اور اپنی کوکھ سے جنے بیٹوں اور بیٹیوں کو، نواسوں اور پوتوں کو، دوست، رشتے داروں اور دشمنوں کو..... سب کو بس اپنی پڑی ہے۔

میں نے کہا ناں۔ یہ قیامت کا دن ہے۔۔۔ اور قیامت کے دن کو سوچنا اور تصور کرنا بہت آسان ہے۔ مگر

قیامت کے دن کو دیکھنا۔۔۔ آہ۔۔۔ آپ نے پہلے کبھی قیامت دیکھی ہے؟

اور آپ سب بھی تو یہیں کہیں ہیں۔ مگر میں کسی کو نہیں پہچان سکتی۔ بس! منہ اٹھا کر دیکھتی ہوں۔ اس مشکل سے کیسے چھٹکارا ہوگا؟ کب نمبر آئے گا اور فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

خوف اور دہشت سے بگڑے چہرے۔۔۔ چیخ و پکار اور کوئی مددگار نہیں۔

اور جو مددگار تھا۔ وہ تو خود ہی آج حساب لینے بیٹھا ہے۔۔۔ کہاں امان پائیں۔

ہاں! کچھ چہرے اتنے کریہہ ہیں کہ بس۔

مگر کچھ روشن بھی ہیں۔

کچھ یوں ہیں کہ جیسے ان کے پیٹ میں چیرا لگا کر آنتوں کو باہر کی جانب کھینچا جا رہا ہو اور کچھ ایسے جو یوں کھڑے ہیں۔ جیسے کسی سرسبز چراگاہ پر دور کسی منظر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ خوشبو، تازگی، ہلکے پن کے احساس کے ساتھ۔

بڑے جرائم کی سزائیں ہیں۔

مگر چھوٹے چھوٹے وہ گناہ جنہیں ہم نے کبھی گناہ سوچا بھی نہ تھا۔ ان کی سزائیں اتنی اندوہ ناک ہیں کہ

۔۔۔

غیبت، چوری، بدگمانی، بداخلاقی، اونچا قہقہہ، منافقت، اونچی آواز سب کی سزائیں درج ہیں اور لاگو کی جا رہی ہیں۔

میرے پاس بڑے گناہ نہیں ہیں۔ مگر ان چھوٹے گناہوں کی تعداد یاد نہیں۔۔۔ فرشتوں کے رجسٹر میں میری پلکوں کی جنبش تک درج ہے۔

میرا نمبر کب آئے گا اور اصل سزائیں کب ملیں گی۔ اصل سزا سے پہلے کا یہ وقت۔۔۔ میں چیخ رہی ہوں اور یوں اچھل رہی ہوں جیسے گرم توے پر کھڑی ہوں دفعتاً میں کچھ چہروں کو پہچان لیتی ہوں۔

حیرانی صد حیرانی۔ وہ تینوں میرے پڑوس میں رہنے والے۔۔۔ ایک ظالم، ایک گناہ گار، جھوٹ سچ والا۔۔۔

مگر۔۔۔ یہ کیا۔۔۔

فرشتے گھسیٹ کر جہنم میں تو کسی اور کو دھکیل رہے ہیں۔

مگر کیوں۔۔۔ ایسا کیوں۔۔۔ اور وہ جو گناہ گار ہے، وہ کہاں چلا گیا۔

اور وہ ظالم بھی۔۔۔ اے اللہ۔۔۔ اللہ! سنیے تو۔۔۔

☼ ☼ ☼

امانت برف والے کی شادی سارے محلے کے لیے ہاٹ ایشو تھی۔ سانولے رنگ کا اونچا لمبا سانڈ نما امانت برف کا کارخانہ چلاتا تھا۔ لوڈشیڈنگ کی مہربانی کے باعث اس کی برف خوب بکتی۔ ایک تو سیدھے سیدھے عمر بیس کا ہندسہ چھوتی ہوئی، اوپر سے پکا منہ، کرخت تاثرات، قد کاٹھ میں کسی سرکاری سانڈ جیسا۔۔۔ سر جھکائے گرد و پیش سے انجان بن کر گزرتا۔ راہ گیروں میں سے کوئی جان پہچان والا سلام کر لیتا تو اپنی بھاری آواز میں جواب یوں دیتا جیسے دھکے مار رہا ہو۔

سب سے خطرناک چیز ہوتا برف کا سوا۔۔۔ دوپہر میں کھانا کھانے گھر آتا تو اکثر بے خیالی میں یا اللہ جانے۔۔۔ برف کا وہ نوکیلا سوا ہاتھ میں لہراتا ہوتا۔۔۔ گھر مارکیٹ سے دور تھا۔ مگر ایک ذیلی تنگ گلی جہاں کچرا وغیرہ ہوتا، وہاں سے گزر کر وہ لمحوں میں گھر کے اندر۔۔۔

امانت برف والے کی ماں۔۔۔ بالکل بیٹے جیسی تھی (یا بیٹا ماں جیسا۔۔۔) اتنی ہی کرخت رو اور کرخت زبان۔۔۔ بدتمیز عورت۔

جو چلتی ہوا سے بیر باندھ لے کہ اس کے دوار سے گزری ہی کیوں؟

جوانی کے زمانے میں اپنی ساس سے لڑتی تھی۔

پھر مرحوم شوہر کے ڈھائی تیلے (بال) دو مٹھیوں میں بھر کے نوچے تا وقتیکہ وہ گنجے سر کے ساتھ مٹی اوڑھ

گیا۔

اس نے آٹھ بچے جنے تھے۔ دو بیٹے بڑے۔۔۔ پھر بیٹی۔۔۔ پھر امانت۔۔۔ اس کے بعد نزاکت اور دو بیٹیاں بالترتیب پندرہ، چودہ برس کی۔

اتنے تلخ مزاج کی بدزبان عورت بہوؤں کے ساتھ کیسے گزارا کرتی۔

تھی تو وہ بڑی حساب دان۔ ہر چیز کو جانچ لیتی۔ گھر گھومنے کا شوق تھا اور بڈحرامی گھٹی میں پڑی تھی۔ دونوں بڑے بیٹے ابھی اتنے بھی جوان جہان نہیں ہوئے تھے کہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر شادی کی فکر کی جاتی۔ مگر اسے خیال آیا۔ بیٹے بیاہ دیتی ہوں۔ آنے والیاں اپنے شوہروں کا پکانا دھونا تو کریں گی ہی۔۔۔ ساتھ ہی گھر کی دیکھ ریکھ بھی ہو جائے گی۔

کون دھوئے اتنے لمبے ڈھینگ مردوں کی لمبی قمیصیں اور گھیردار شلواریں۔۔۔

تھی تو ماں، مگر پانچ پانچ روٹیاں فی بیٹا ایک وقت میں ٹھونستے ہوئے ہوش ٹھکانے آتے۔۔۔ کچے پکے ڈھوڈھے چنگیر میں رکھ کر پٹخ دیتی۔۔۔ بیٹی جوان تھی۔ مگر وہ بھی ماں کے ڈر سے مارا باندھا کام کرتی۔ ایک گلاس کوئی بھی فالتو نہ اٹھاتی۔

پلاننگ بے عیب تھی۔ بہوؤں نے آکر نہ صرف اپنے شوہروں کو سنبھالا۔ بلکہ سارا گھر بھی ان کے کندھوں پر آگیا۔ ساس تلخ، بدزبان، گالم گلوچ کرنے والی۔ یہاں تک کہ چوٹی پکڑ کے کمر پر مکا جڑ دینے سے بھی نہ چوکتی۔ کھانا اٹھا کر پھینک دینا۔ ناک چڑھا کر رکھنا معمول کا حصہ تھا۔

بہوؤں کے ساتھ اس ناروا سلوک پر کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ شوہر ماں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے۔ کمرے میں آکر جب شیر بننے کی کوشش کرتے تو بیویوں کو کتوں سے بھی بدتر لگتے۔

سارا جھوٹا سچا التفات ابکائیاں لینے پر مجبور کر دیتا۔

ساس اور شوہر حضرات کے رویے کا شکوہ تو کرتیں کس سے۔ چھوٹی نند انتہا کی بدزبان اور شکایتی ٹٹو۔۔۔ دیور نزاکت اپنے نام کا پر تو تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر شکایتیں

جڑتا، بدتمیزیاں کرتا۔ وہ ماں کا لاڈلا بیٹا تھا۔ جیب خرچ کے نام پر بڑی رقمیں اینٹھتا۔ پیسے مار بھی لیتا۔ اسکول کے نام پر وردی پہن کر نکلتا ضرور۔۔۔ مگر اسکول جاتا نہیں تھا۔ آوارہ گردی کرتا۔ امانت باپ کے ساتھ برف خانے جاتا تھا۔ وہ شروع ہی سے کرخت مزاج سا تھا۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے کچھ پروا نہیں۔ وہ کچھ اور ہی مزاج کا تھا۔۔۔ اپنے آپ میں گم، کام میں مگن عجیب سا مشینی انداز۔۔۔ وہ ایسی فطرت کا آدمی تھا کہ اگر اسے کہا جائے کہ سارا دن پتھر کوٹو۔۔۔ یا گول دائرے میں گھومو تو وہ سر جھکا کر پتھر کوٹتا رہے یا دائرے میں چکر لگاتا رہے۔

بڑے دونوں کسی فیکٹری میں ملازم تھے۔ باپ برف خانہ دیکھتا، مددگار امانت۔۔۔

متوسط گھرانہ تھا اور ایک لحاظ سے یہاں معاشی تنگی نہیں تھی۔ سب کماتے تھے اور سیدھی سادھی خوراک، سستے کپڑے بھی بڑی خوشی سے زیب تن کر لیے جاتے۔ پیسوں کی تنگی کا رونا نہیں تھا۔

اللہ جانے کن وجوہات کی بنا پر۔ مگر زمانے بھر کا نکما نکھٹو نزاکت ماں کا لاڈلا تھا۔ وہ اسے ہر کسی سے ذرا الگ رکھتی۔ جیب خرچ بھی زیادہ۔۔۔ وہ اپنی خوشی سے بھی دیتی۔ یہ لاڈ سے بھی اینٹھتا۔ ضد سے مانگتا اور پھر ماں کے رکھے گلاسوں ڈبوں سے بھی جیبیں بھر لیتا۔ جیب میں پیسے بھرے ہوتے تو وڈیو گیم کھیلنے نکل جاتا۔ چھوٹی موٹی شرطیں بھی لگاتا۔ پھر کچھ بڑا ہوا تو موبائل ہاتھ لگ گیا۔۔۔ نئی ہی دنیا۔۔۔ اچھا برا سب پوروں کی جنبش کا محتاج۔۔۔ اور برائی قسمت کی دھنی ہوتی ہے۔ بے حد کریہہ صورت ہونے کے باوجود لبھاتی ہے اور ساری اچھائیاں اس کے آگے پیچھے۔

پہلے فلمیں دیکھتا تھا تو بھابھیوں کے گیلے بال دیکھ کر آنکھیں مٹکاتا۔

ان کے آٹھ نو ماہ کے پیٹ کو دیکھ کر ہنکارے بھرتا۔ وہ عمر اور رشتے میں اس سے کہیں بڑی تھیں۔ مگر ماں کے لاڈلے اور سب سے بڑھ کر چھوٹے، مگر جانے والے کے منہ نہ لگتیں۔ سو جلتی کڑھتی رہتیں۔ بچوں

والیاں ہوگئی تھیں۔ مگر گھر میں اتنی حیثیت مستحکم پھر بھی نہیں تھی کہ۔ اس سے پنگا لیتیں۔ دونوں آپس میں گفتگو کرتیں۔ ایک دوسرے کو تسلی دیتیں۔ شوہروں پر گرفت پالینے کے لیے سنار کی طرح ہلکی ضربیں لگاتیں کہ شاید کسی روز صورت ڈھل ہی جائے۔ مگر ساس کی نگاہیں اور گرفت زیادہ جان دار تھی۔ نزاکت باپ اور بھائیوں کے آگے سر جھکا کر دھیما رہتا۔ کوشش کرتا ان کے سامنے کم سے کم آئے۔ ایسا ماحول ڈھال لیتا کہ اسکول کا کام کررہا ہے۔ عمر کم تھی۔ مگر آوارہ گردی نے ہر شے سے روشناس کروادیا تھا۔

باپ بھائیوں کی آنکھیں بھی چمک اٹھتیں۔ بھائی کتابیں کھول کر بیٹھتا ہے۔ شاید افسر بن جائے... تو چلو! بن جائے۔ شوق پورا کرے...

حالانکہ خود باپ اور بھائی اس عمر میں کارخانوں میں مزدوری کرنے میں کھپ گئے تھے۔ مگر چلو! چار جی کما رہے ہیں۔ کیا فرق پڑے گا اور بالآخر پیٹ بھرنے کے لیے سب کو کمانا پڑتا ہی ہے۔

لیکن باپ بھائیوں کی دی گئی گنجائش کا نزاکت جی بھر کے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ چوک پر کھڑا ہوکر نہ صرف جوان لڑکیوں پر جملے کستا، اشارے کرتا، بلکہ بڑی عمر کی بوڑھی عورتوں کے بارے میں بھی انتہائی شرمناک جملے ہنسی ہنسی میں کہہ جاتا۔

بڑی عمر کے مردنما لڑکوں سے دوستی تھی۔ بارہ تیرہ برس کی بچیوں کو بھی نگاہوں نگاہوں میں تول لیتا۔

عزت کے مارے لوگ شکایت نہیں کرتے۔ خاموش رہتے اور راستہ بدل لیتے۔

کون رستوں پر کھڑے لوفروں سے اپنی بچی کھچی عزتوں کی دھجیاں اڑائے۔

ہاں! نو عمر لڑکیاں بچیاں اپنی ماؤں سے شکایت کرتیں۔

محلے کی سمجھ دار عورتوں کا ایک ٹولہ ماں کے پاس آیا۔ سلام دعا ہوئی۔ اخلاق، مروت سے چائے کے کپ پیش کیے گئے۔ عورتیں ماں کے اخلاق سے متاثر ہوئیں مگر جس شکایت کے لیے آئی تھیں، وہ بھی تو کرنی تھی۔ لب کھولے۔ پہلے تو ماں پھٹی آنکھوں سے بے یقینی لیے سنتی رہی۔ پھر چہرے کے تاثرات بدلے۔ مگر یہ شرمندگی، پچھتاوے، ذلت کے نہ تھے۔

ماں کا چہرہ تمتمانے لگا۔ آنکھوں سے شرارے نکلے... پھر جب اس کی زبان کھلی تو آنے والیاں "توبہ توبہ" کرتی اٹھیں۔ مغلظات کا طوفان، شکایت کنندہ کے اگلے پچھلوں کی مٹی تک اکھیڑ ڈالی۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں کہنے آئی تھیں۔

"آپ کے باقی تینوں بیٹوں سے کوئی شکایت نہیں ہمارے سامنے جوان ہوئے... گھر بار والے... بس اس نزاکت ہی کو غلط صحبت سے بچائیے۔ محلے کی بہنیں، بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

نزاکت کی ماں نے ان ہی بچیوں پر شرمناک الزام تراشیاں کیں اور ان سب کو بیچ بچ دھکے دے کر گھر سے نکالا۔

"میرے بیٹے پر الزام لگاتی ہیں۔ خود کون سی دودھ کی دھلی ہیں۔ آئیں بڑی جماعت بنا کے۔"

ماں کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اسے کسی صورت چین نہیں آرہا تھا۔ ایسی شکایت پہلی بار آئی تھی۔ وہ شام تک گھر میں پھرتی رہی۔ نزاکت آیا تو اسے پہلے سے کچھ سن گن تھی۔ جھوٹ سچ ملا کر ایک جواز گھڑ چکا تھا۔ خود ہی شروع ہوگیا۔

"یہ ساری کی ساری خود ہی خراب ہیں اماں۔ ہنستی ہوئی اشارے کرتی گزرتی ہیں۔ رقعے بازیاں کرتی ہیں۔ اب مرد تو روڈوں پر کھڑے ہوتے ہی ہیں۔ نام میرا لگادیا... ہونہہ!"

"ہاں میرا لال... ایسا سبق سکھا کر بھیجا ہے کہ کبھی زندگی میں دوبارہ ادھر کا رخ نہ کریں گی۔" ماں نے اپنی ساری کارگزاری بتائی۔ "میرے چھوٹے سے نابالغ بیٹے پر الزام لگانے چلی تھیں۔"

"اور اماں! اگر بھائیوں کو... ابا کو پتا لگا تو...؟"

"ذرا بھی شرم والیاں ہوئی ناں تو سانس بھی نہیں نکالیں گی... اور اگر ایسا کچھ ہوا بھی تو ان سے بھی نبٹ لوں گی۔"

"میں ان کے بھائیوں کی نہیں، اپنے بھائیوں کی بات کررہا ہوں۔"

"تو! ان کی مجال، جو میرے آگے کچھ بولیں۔" ماں نے بے پروائی سے ہاتھ ہوا میں چلایا۔ نزاکت پُرسکون ہوگیا۔ اس کی ماں تو بڑی جی دار نکلی۔ ورنہ وہ تو بہت زیادہ ٹھکائی اور سرزنش سوچ کے آیا تھا۔

لیکن یہ طمانیت زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ مردوں کے گروپ نے وہی سب شکایتیں دونوں بڑے بھائیوں کے گوش گزار کردی تھیں۔

"سارا دن آوارہ گردی کرتا ہے۔ اسکول تو زمانے ہوئے گیا نہیں..." وہ اسکول ماسٹر صاحب کو بھی لائے تھے۔

"لیکن وہ تو روز اسکول جاتا ہے؟"

"لیکن وہ اسکول کبھی پہنچا نہیں۔"

"فساد سے پہلے بات چیت کرلینی چاہیے۔ وہ چونکہ عمر میں بہت کم ہے ابھی۔ اس لیے آپ لوگوں کو بلوا کر بات کررہے ہیں۔ اگر ہوتا کوئی بڑا، ہٹا کٹا تو..." کچھ نوجوان بہت جوشیلے تھے۔

"لڑکے اس عمر میں ایسی حرکتیں کرہی جاتے ہیں۔"

"سمجھانا اور اطلاع کرنا ہمارا کام تھا۔ دوبارہ آپ کے پاس... یا آپ کی ماں کے پاس نہیں جائیں گے۔"

بھائی گھر پہنچے تو وہ حسب معمول پڑھ رہا تھا۔ جملے جوڑتے رہے اور ابا کا انتظار...

بیویوں نے بھی سارا قصہ زیر زبر پیش کے ساتھ سنا دیا۔ کچھ نمک مرچ بھی ایسی، جو بھڑکا دے...

اور پھر گھر میں فساد کا نیا دور شروع ہوگیا۔

نمبر دو والے بھائی نے اپنے طور پر مزید تحقیق کی تو وہ مزید خرابیات میں جتلا پایا گیا۔

انہوں نے ماں اور باپ پر زور ڈالا کہ اسکول والا ڈراما بند کرکے اسے کسی کام پہ لگایا جائے۔ آخر وہ بھی تو اتنی سی عمر ہی سے کام کو نکلے تھے۔

"اب اسے حرام خوری نہیں کرنے دی جائے گی۔"

یہاں پھر ماں اڑ گئی۔ "میرا بیٹا تو ایسے ہی رہے گا۔ تم لوگوں سے روٹی مانگنے نہیں آنے والا۔ ابھی اس کے ماں باپ زندہ ہیں۔ چھوٹے بھائی سے دشمنی پال لی۔" پھر بہوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب ان فتنوں کا کیا دھرا ہے۔ جھوٹی سچی لگا لگا کر بھائیوں کا دل بدگمان کیا۔"

بہوؤں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انہوں نے دل بدگمان ضرور کیا تھا۔ مگر صرف سچ کہہ کر... دیور کی کارروائیاں تو باہر سے اندر آئی تھیں ناں... دونوں کے چہرے پر طمانیت اور بے فکری تھی۔ ساس کا دماغ ایک دم گھوما۔ اس نے گلاس اٹھا کر مارا۔ ناک کی ہڈی پر جاکر لگا۔ ہڈی کے پاس سے ایک طرح کٹ گیا۔ جیسے کسی نے چھری سے کاٹا ہو۔

خون کا شدید پرنالا سا بہہ اٹھا۔ دوسری بہو نے چیخ چیخ کر ساری دنیا اکٹھی کرلی۔ ان کے والدین بھی آگئے۔

سسر کافی حد تک شرمندہ تھے۔ مگر ساس کی ہٹ دھرمی مزید بڑھی۔ وہ اکڑی رہی۔ نئے قضیے میں نزاکت والا معاملہ دب گیا۔ بہو کو زخمی کردیا۔ گالیاں دیں۔ غلطی تسلیم نہیں کی۔ گھر کے درمیان دیواریں کھینچ گئیں۔ دونوں بہوئیں الگ ہوگئیں۔

"ماں سے کوئی گلہ نہیں۔ مگر جس طرح وہ نزاکت کی بے جا حمایت کررہی ہے اور اوپر سے الزام بھی ہم پر... بجائے اس کے اسے سمجھائے... تو ٹھیک ہے، رہے پھر وہ اپنے بیٹے کے ساتھ۔ آج سے ہمارا نزاکت کے کسی معاملے میں کوئی معاملہ نہیں۔"

☼ ☼ ☼
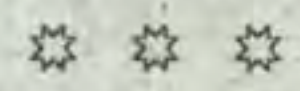
نزاکت کو ماں کی پشت پناہی حاصل ہوگئی۔ اس نے اسکول جانے سے انکار کردیا۔

"ماسٹر صاحب کو اس سے خصوصی پرخاش ہے۔ بس اب وہ کام کرے گا۔" ماں نے آگے بڑھ کر منہ سر چوما۔

"ہاں! اپنے پیروں پر کھڑا ہو تاکہ کوئی جھوٹے سچے

الزام نہ لگائیے۔"

ہڈ حرامی کی عادت پڑ چکی تھی۔ وہ برف خانے جا کر بیٹھتا اور بڑی صفائی سے گلک سے پیسے اڑاتا ۔۔۔ دوستوں کی محفل جماتا۔ یہ ہوا تھا کہ اب غلط کاموں ، نفاست اور ہوشیاری آ گئی تھی۔ پیسے ماں سے تو ، سں سے مل جاتے تھے۔ نکالنے ہوتے تو مکھن سے بال کی طرح والا سلیقہ آ گیا۔

اپنا محلہ چھوڑ کر شہر میں اور بھی ہزاروں چورستے، گلیاں اور پھر موبائل ۔۔۔ ایس ایم ایس، پیکجز پر راتوں کے کئی گھنٹے ۔۔۔

مل جاتی تھیں اسے اپنے مطلب کی بہت سی ۔۔۔ اور موبائل میں قرآن حکیم کی تلاوت بھی ہوتی ہے۔

اسی موبائل میں وہ سب بھی ہوتا ہے۔ جس سے مسلسل قرآن حکیم میں منع کیا جاتا ہے۔

سننے والا بھی ۔۔۔ اور دیکھنے والا بھی

سو نزاکت کی دنیا میں اب عیش، آرام اور سکون تھا۔

دوسری طرف نزاکت کی ماں ۔۔۔

بڑی بیٹی بیاہ دی تھی۔ اب گھر میں تھے۔ شوہر، امانت، نزاکت اور دو بیٹیاں۔ ایک بار پھر کام کاج کے مسائل اٹھے۔ پہلے تو پھر بھی جسم میں توانائی تھی۔ اب ذرا بڑھاپا بھی آ گیا۔ کام چوروں کی سو تاویلیں۔

امانت برف والے کی ماں نے بہوؤں پر کڑی نگاہ رکھی تھی۔ مگر وہ قسمت کے پھیر سے بڑے مزے سے نکل گئیں کہ کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

"دو سگی بہنیں اس لیے لائی تھی کہ مل کر رہیں گی۔" ماں نے بیٹی سے کہا۔ بیٹی کی جان جل گئی۔

"مل کر ہی رہتی ہیں۔ مگر آپس میں ۔۔۔ آپ سب کو تو نکال باہر کیا۔ بہوئیں تو چلیں غیر تھیں۔ بیٹے کون سا پوچھ رہے ہیں؟؟"

"تو نہ پوچھیں ۔۔۔ میرے امانت، نزاکت ہیں ناں۔"

"ہاں! ہیں تو۔ مگر کیا اب تم کو امانت کی شادی نہیں کرنی؟ لوگ پوچھنے لگے ہیں۔ کاٹھی کا بھی اونچا لمبا۔ عمر سے بڑا لگتا ہے اور مزاج کا بھی کرخت ۔۔۔"

"کرنی ہے شادی کیوں نہیں کرنی ۔۔۔ مگر اس بار بہو بہت سوچ سمجھ کر لاؤں گی۔ باپ تیرا بوڑھا ہو گیا۔ اب کام کرنے کا دم نہیں ہے اس میں ۔۔۔ امانت ہی نے سب کچھ سنبھالا۔ بلکہ سنبھالا کیا ۔۔۔ ماشاءاللہ سے اتنی ترقی کر گیا ہے۔" ماں کے لہجے میں فخر آن ٹھہرا۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں ماں۔" بیٹی نے پُراسرار انداز میں قریب سرک کر کہا۔

"بات اگر تمہیں بری لگے تو لگے۔ مگر مجھے کرنی صاف صاف ہے۔" ماں نے ٹھٹک کر بیٹی کی صورت دیکھی۔

"یہ سچ ہے کہ ماں کے لیے سب بچے برابر ہوتے ہیں۔ مگر کوئی ایک کسی بھی وجہ سے یا بغیر وجہ کے بھی دل کو بہت اچھا لگتا ہے۔ اب تم مکرنا مت ۔۔۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نزاکت تمہارا سب سے لاڈلا بیٹا ہے ۔۔۔ حالانکہ سب سے زیادہ نکما بھی وہی ہے۔"

بیٹی نے صاف گوئی کی حد کر دی۔ ماں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا۔ مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"پہلے میری پوری بات سن لو۔ عمر میں کم ۔۔۔ گھریلو کسی غریب یتیم سی لڑکی کو بیاہ کر لے آؤ۔ جسے ہوش ہی نہ ہو کہ کماتا کون ہے اور کھاتا کون ۔۔۔ چار اچھے جوڑے، تین ٹائم کی روٹی کھا کر ہی بے ہوشی کی نیند سو جائے۔ صبح اٹھے تو کام کا زور ۔۔۔ اور اگر جو تم لے آئیں کوئی پچھلوں سے مضبوط، عمر کی زیادہ اور ہشیار لڑکی تو تمہیں تو شاید وہ برداشت کر لے گی۔ چار سناؤ گی تو سن لے گی۔ ادب کے مارے یا ڈر کے مارے چپ بھی رہ لے گی۔ مگر اس مفت خورے نزاکت، جو کسی کام کا نہیں ہے۔ اسے اس نے اگلے دن ہی نکال باہر کرنا ہے۔ وہ کیوں تھوپے گی اس کی روٹیاں۔"

"تیرے منہ میں خاک ۔۔۔ ایسے منہ بھر بھر کے منحوس باتیں کرتے ہوئے دل نہیں دکھا تیرا ۔۔۔ کیوں مفت خورا ہو گا؟ بڑے بھائی کماتے ہیں تو چھوٹے بہن بھائی کھاتے ہیں ہی ۔۔۔ اور کام کی خوب کہی ۔۔۔ کیوں نہ کرے گا ۔۔۔؟ سب کرے گا ۔۔۔ وقت تو آ جائے ذرا۔" ماں کو آگ ہی لگ گئی تھی۔

"اماں! وہ جتنا کمانے والا ہو گا ناں تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ تمہارے لاڈوں نے ہی یہ سب دکھایا۔ کون سا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی عمر کے لڑکے پورے پورے گھر سنبھالتے ہیں اور وہ دروازے سے سر جھکا کر نکلتا ہے۔ اتنے قد پر تو کرنے والے آسمان سے چاند اتار لیتے ہیں۔ وہ گلیوں کے چاندوں کے پیچھے خوار ہوتا ہے ۔۔۔ ہونہہ!"

☼ ☼ ☼

میرا تین منزلہ گھر امانت برف والے کے گھر کے عین سامنے تھا۔ وہ سامنے والی گلی کا آخری گھر اور میرا اپنی گلی کا آخری ۔۔۔ درمیان میں دو رویہ چھوٹی سڑک۔ میں اپنے تین منزلہ ٹیرس پر بیٹھ کر جب سارا دن مجھے اردگرد دیکھتے ہوئے بڑھاپے اور تنہائی کے دن گزارتی تو آتے جاتے لوگ، گاڑیاں، شور میری تنہائی کے ساتھی ہوتے۔ امانت برف والے کے گھر کے سارے تماشے مجھے صاف دکھائی اور سنائی دیتے۔ سنائی یوں کہ وہ سب بہت اونچی آواز میں بولتے تھے اور دکھائی ایسے کہ ان کے گھر کی تمام کھڑکیاں وا رہتیں اور سارے کمرے میری نگاہ میں۔

امانت کی دولہن دیکھنے کا اشتیاق زیادہ دن نہیں رہا۔ وہ تیسرے دن ہی سے کچن میں دکھائی دینے لگی۔

دبلی پتلی، درمیانہ قد، صاف رنگت پر نقشہ بڑا ہی دل موہ لینے والا تھا۔ کسی قدر ہراساں، شرمائی گھبرائی سی ۔۔۔ بلکہ ڈری سہمی بھی لگی۔

لوڈشیڈنگ کے باعث مجھے اکثر ہی امانت سے برف لینا پڑتی تھی۔ وہ کرخت چہرے والا آدمی جس نے کبھی بزرگی کے لحاظ میں بھی سلام نہیں کیا تھا۔ ایک ڈل سا مرد۔ اسے اتنی پیاری سی دلہن مل گئی۔ واہ! بڑا اچھا نصیب رہا امانت برف والے کا ۔۔۔ اتنی پیاری دولہن پا کے اب تو شاید وہ مسکراتا ہو ۔۔۔ کوئی مثبت تبدیلی ۔۔۔ میں ویسے ہی خوامخواہ برف لینے چلی گئی۔ مگر وہاں ہنوز وہی پرانا پکا پن ۔۔۔

"کمال ہے یہ امانت بھی۔ شادی اور وہ بھی اتنی اچھی دولہن تو بڑے بڑوں کی بتیسی باہر کر دیتی ہے۔ عجیب ہی رہا امانت۔"

میرے تخت سے امانت کا سارا گھر نظر آتا تھا۔ گندا سندا گھر چمچمانے لگا تھا۔ صبح صبح ہی دھلے کپڑوں سے رسیاں بھر جاتیں۔ وہ آٹا گوندھتی، روٹیاں بناتی نظر آتی اور مجھے بے حد اچھی لگتی۔ امانت کا تو پتا نہیں، میری ویران زندگی میں وہ رونق بن کر آ گئی تھی۔ بیٹیاں بیاہ دیں۔ اکلوتا بیٹا ملک سے باہر ۔۔۔ میاں ریٹائرمنٹ کے بعد کہیں سیلزمین بن گئے تھے۔

نواسا ساتھ رہتا تھا۔ مگر صبح کا نکلا، رات گئے لوٹتا۔

وہ کام کرتے ہوئے کبھی کبھار سر اٹھا کر مجھے دیکھ لیتی۔ پھر شناسائی کے دن کچھ اور گزرے تو سلام کر دیتی ہاتھ کے اشارے سے ۔۔۔ اور پوچھ لیتی کہ میں کیسی ہوں؟

اس کے اس طرح مخاطب کرنے سے مجھے بے حد خوشی ہوتی۔

اس کی ساس بیٹھ کر سبزی کا ڈھیر بناتی اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کام کو ہاتھ لگانا گویا گناہ تھا۔ دونوں چھوٹی نندیں اسکول جاتی تھیں۔

میں نے نوٹ کیا کہ وہ کام تو بے حد کرتی۔ مگر رہتی خاموش ہاں! چلتے ہونٹ بتاتے، وہ خود کلامی کرتی ہے۔ وہ اتنی کم عمر اور معصوم تھی کہ چمکیلے کپڑے نہ پہنے ہوں اور اسکول یونی فارم دے دیا جائے تو بھولی بھالی طالبہ دکھائی دے۔

امانت گھر آتا تو سر پر دوپٹا جما کر اسے پانی پیش کرتی۔ مسکراتے لبوں پر سنجیدگی آ جاتی۔ جیسے سہم جاتی۔ ہر قدم، ہر جنبش نپی تلی۔

وہ منہ سے کچھ نہیں مانگتا تھا کہ پانی دو، روٹی یا سالن

یا تکیہ۔۔۔ ہاتھ بڑھاتا تو پانی حاضر۔۔۔ پھر روٹی سالن۔ پیچھے تکیہ لگا دیتی۔ بجلی نہ ہوتی تو پنکھا جھلتی جاتی۔ حیران کن بات تھی۔ گھٹنوں پر ٹھوڑی چپکائے وہ اس سے کافی فاصلے پر بیٹھتی۔ کبھی کبھار نگاہ اٹھا کر اسے دیکھ لیتی۔ وہ کھانے میں مگن ہوتا۔

ساس پاس ہی بیٹھی ہوتی اور کڑی نگاہ رکھتی۔ وہ اگر کبھی غلطی سے سب کے ساتھ کھانا کھا لیتی تو ایسے جیسے کوئی کاما (ملازم) ڈرتے' جھجکتے دستر خوان پر براجمان ہو۔ چھوٹے چھوٹے نوالے لیتی۔

امانت کھانا کھا کر چلا جاتا یا کبھی آنکھیں موند لیتا۔۔۔ یا ساس نہ ہوتی تو میں اس کے چہرے پر پُرسکون سانس دیکھتی۔

میں نے کبھی ساس بہو کو آپس میں باتیں کرتے نہ دیکھا۔

نندیں تقریباً" ہم عمر تھیں۔ مگر وہ بھی اسے مخاطب نہ کرتیں۔ آپس میں سر دے دے کر خوب قصے سناتیں۔ وہ بہت اشتیاق کے سے عالم میں پاس بیٹھ کر سنتی۔ اگر کبھی کوئی جملہ بول بھی دیتی تو وہ دونوں ایسے دیکھتیں کہ خود ہی جھینپ جاتی۔

"سوائے گھر لش لش کرنے کے مجال ہے' جو کوئی تبدیلی آئی ہو۔ ارے! لوگ کام کرنے والی سے سو باتیں کر لیتے ہیں۔ یہاں تو وہ بھی نہیں۔۔۔"

"کرتے ہوں گے نانو۔۔۔ آپ کون سا سارا وقت یہاں ہوتی ہیں۔" میرے نواسے نے کہا۔

"میں سارا وقت یہیں ہوتی ہوں بچے۔۔۔ صبح نماز پڑھنے تخت پر بیٹھتی ہوں۔ تو عشاء کے بعد اٹھتی ہوں۔ سبزی یہیں بناتی ہوں۔۔۔ نمازیں یہیں پر۔۔۔ کھانا بھی یہیں کھاتی ہوں۔ تمہارا ابھلا جو ٹی وی یہاں سامنے رکھ دیا ہے۔ بجلی ہو تو خبریں سنتی ہوں۔ بہت ہوا تو تمہارے نانا کی آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہوں۔ وہاں سے بھی سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔"

"اپنی تاکا جھانکی کے جواز نہ بنائیں۔" وہ شرارت سے کہتا۔

"کہاں کی تاکا جھانکی۔۔۔ بڑھاپے کے دن ہیں اور ہم ہیں۔۔۔ دن جو گنے جا رہے ہیں۔ گنتی پوری۔ کھیل ختم۔"

"اوہو نانو! ایسی باتیں نہ کریں۔"

"ایسی باتیں ہی ہیں۔ تم میری مان لو۔ ایسی ہی دولہن لا کر دوں گی۔"

"ایسی کیسی؟"

"ایسی ہی۔۔۔ عفت جیسی۔"

"اب یہ عفت کون ہے۔۔۔؟"

"لو! یہ بھی نہیں پتا۔" میں نے سر پر ہاتھ رکھا۔ "یہی امانت کی دولہن جیسی۔ وہی تو ہے عفت۔"

"اچھا! تو وہ عفت ہے۔" نواسے نے ہنکارہ بھرا۔

☼ ☼ ☼

لیکن میرا یہ قیافہ غلط نکلا کہ نئی دولہن کے آنے سے گھر میں صرف صفائی ستھرائی کے حوالے سے تبدیلی آئی ہے۔ ایک اور حیران کن تبدیلی میں نے دیکھی۔۔۔ اور پھر حیرت میں مبتلا ہو گئی کہ پہلے کیوں نہ دھیان دیا۔

نزاکت اب گھر میں زیادہ سے زیادہ رہتا تھا۔ میں جو پہلے اسے ہفتوں' دنوں کے حساب سے گھڑی دو گھڑی کے لیے دیکھتی تھی' اب وہ صبح' دوپہر' شام نظر آتا۔

اور حیرت کے ساتھ کچھ انکشافات نے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا۔

وہ زیادہ سے زیادہ وقت عفت کے ساتھ گزارتا۔ وہ عفت کے بیڈ پر لیٹ جاتا۔ کبھی اپنے موبائل سے اسے ویڈیوز دکھاتا۔ کبھی اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کانوں میں ہینڈز فری ٹھونستا' باتیں کرتے ہوئے ہاتھ پکڑ لیتا اور دوسرے ہاتھ سے سہلاتا جاتا۔ عفت بعض اوقات کسمسا کر یا کچھ چونک کر ہاتھ کھینچ لیتی یا پھر قصے کی دلچسپی میں گم رہتی۔

عفت کے گم صم چہرے پر ہنسی دیکھی تو وہ اور بھی پیاری اور معصوم لگی۔ میں اسے بہت خاموش طبع سمجھتی تھی۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ بہت بولتی تھی۔ بولتے وقت چہرے کے تاثرات بڑے دلچسپ ہوتے آنکھیں چمکتیں' بجھتیں' پھیل جاتیں' ماتھے پر اسی حساب سے تیوریاں چڑھتیں' اترتیں۔ جیسے قصے کا تقاضا ہوتا۔

گھر سے غائب رہنے والا نزاکت جو عجیب جنگلی حلیے میں رہتا تھا۔ صاف کپڑے پہن کر بھابھی ہی کی ڈریسنگ کے سامنے کھڑا ہو کر بال سنوارتا۔

اسے میں نے کبھی ماں بہنوں سے بھی ایسے محو گفتگو نہ دیکھا تھا۔ جیسے وہ اب عفت سے کرتا۔

شروع میں عفت کی چلتی زبان اور مسکراتا چہرہ مجھے اچھا لگتا۔ مگر پھر کچھ عرصے سے مجھے عجیب سا احساس ہونے لگا۔ عفت کم عمر تھی۔ سترہ برس تک کی اور نزاکت شاید انیس بیس برس تک کا۔۔۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے دیور' بھابھی کا رشتہ بہت پاکیزہ بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی ہے۔

مگر اسی رشتے کو ایک دوسرے کے لیے موت اور آگ سے بھی پکارا گیا ہے۔ کچھ ایسا تھا' جو ہضم نہ ہو رہا تھا۔

اور نزاکت کی ماں۔۔۔ وہ دوپہر کو اونگھتی یا پردہ گرا کے بند کمرے میں ماں' بیٹیاں کیبل سے لطف اندوز ہوتیں۔ کبھی کبھار عفت بھی ہمراہ ہوتی۔ لیکن وہ تجربے چہرے والے شوہر کو کھانا پانی دینے اٹھتی اور دیور کو بھی کھانا پانی دیتی۔ وہ کھانا بھی اس کے بیڈ پر بیٹھ کر کھاتا۔

وہ کپڑے دھوتی تو ساتھ رسی پر پھیلانے لگتا۔

دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنستے' وہ کمر پر دھپ جما دیتی' وہ ران پر چٹکی کاٹ لیتا۔ ایک روز اس نے پیچھے سے ہاتھ ڈال کر اسے کس لیا اور ایک روز۔۔۔ اور ایک مرتبہ۔۔۔

مجھے عفت سے نفرت ہونے لگی۔ اسے اپنے نام کی لاج بھی نہ تھی۔

میرا دل چاہتا نزاکت کا خون کر دوں۔

میں منصوبہ بناتی اور اپنے پیروں کو بمشکل روکتی۔۔۔ زبان کو دانتوں تلے داب لیتی۔ جب امانت برف والے سے برف لینے جاتی کہ اپنی بیوی کو اپنے بھائی سے دور رکھو۔

ایک بار نام تک پکار بیٹھی۔

"امانت۔۔۔ وہ۔۔۔"

وہ زور زور سے سوا برف پر برسا رہا تھا۔ ہاتھ روک کر مجھے دیکھا۔

اس کی سوالیہ نگاہیں۔۔۔

"آں۔۔۔ ہاں! کچھ نہیں۔" (اگر اس نے سوا میرے اندر اتار دیا تو)

میں جھرجھری لے کر رہ گئی۔

اور اس نے وہی برف والا نوکیلا سوا پیٹ میں اتار دیا۔ پے در پے وار کر کے۔۔۔ خون کی پچکاریاں دیواروں کو رنگین اور فرش کو گیلا کر گئیں۔

عفت زمین پر چیخیں مارتی گری پڑی تھی۔ پھر آواز بھی ساکت ہو گئی اور عفت بھی۔۔۔ گلی میں بھاگتے قدم تھے۔۔۔ شور۔۔۔ امانت برف والے کی ماں چیخ چیخ کر کسی کو کوس رہی تھی اور رو رہی تھی اور "بھاگ نزاکت! بھاگ۔۔۔ رک جا امانت! رک جا" کے نعرے بلند کر رہی تھی۔

میں جس دن سے ڈر رہی تھی وہ ایسے اچانک آ جائے گا' یہ تو میرے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ میں کانپتی ٹانگوں کے کارن تخت پر ڈھیر ہو گئی۔

ایک ایمبولنس کا سائرن تھا اور مزید چیخ و پکار۔۔۔ نجانے کتنا وقت بیت گیا۔

☼ ☼ ☼

میں نواسے کے ساتھ اسپتال آ گئی۔ شدید صدمہ۔۔۔ بلڈ پریشر بہت لو ہو گیا۔ ڈرپ چڑھا دی گئی۔ میں نیم غنودگی میں تھی۔ سوچوں کا اژدحام۔۔۔ چہرہ گٹڈ۔۔۔ دکھتا سر۔۔۔ تب ہی اسپتال میں بھگدڑ سی مچی۔ چیخنے' رونے پیٹنے کی آوازیں۔

وہ عفت کی ماں تھی اور باپ۔۔۔ اور نجانے کون کون۔۔۔ ان کے رونے میں اس قدر تکلیف اور بے یقینی کا عنصر تھا کہ میرے ضبط کا یارانہ رہا۔ میں کینولا میں لگی ہوئی سوئی کھینچ کر باہر آ گئی۔ وہ عین سامنے

والے وارڈ میں تھی۔

"تھی ہی چھنال تیری بیٹی۔۔۔ بے غیرت اب تک زندہ ہے۔ معصوم دیور بھابھی سمجھ کر محبت کرتا رہا۔ یہ اپنی مرضی کی محبت بنا کر بیٹھ گئی۔"

"میری بیٹی ایسی نہیں تھی۔ وہ تو اتنی شرمیلی، حیادار، نماز قرآن کرنے والی بچی تھی۔" عفت کی ماں سب کو بتا رہی تھی۔

"ہاں! دنیا نے دیکھ لیا حیا والی کا کارنامہ، بھائی کے ہاتھوں بھائی کو مروانے والی۔" عفت کے پیٹ میں سوا گھونپنے کے بعد امانت ننگے پیر نزاکت کے پیچھے بھاگا۔

وہ ہاتھ نہ آیا تو سوا پوری طاقت سے اچھال دیا۔ لوگوں نے بمشکل امانت کو سنبھالا اور نزاکت کو غائب کیا۔

"مجھے تو پتا تک نہ چلا۔۔۔ پہلے سے بہوئیں رکھی ہیں میں نے۔ کب ایسی کوئی بات اڑی۔۔۔ وہ تھی ہی گند کی پوٹ۔ میرا معصوم نزاکت، میرا غیرت مند امانت۔"

"میں نے تو دھلی دھلائی، نکھری ستھری بیٹی آپ کے حوالے کی تھی۔" عفت کی ماں صدمے سے چور تھی۔ رو رو کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔

"تو سسرال میں رہنے کے ڈھنگ بھی سکھا کر بھیجنا تھا۔ امانت کے ساتھ بیاہا تھا تم نے۔۔۔ نزاکت کے ساتھ ہنسی ٹھٹھول کیوں کرتی رہی؟" امانت کی ماں کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔

"مائیں کنواری زندگی کے اصول سکھا کر بھیجتی ہیں۔ شادی شدہ زندگی کے ڈھنگ تو ساس دیتی ہے۔"

"تاں! تو ہم نے کون سا اسکول کھول رکھا تھا؟"

"آپ نے کبھی اس سے بات تک نہ کی۔"

"ارے چل جا۔۔۔ بات کی۔۔۔ کتنی بے شرم ہے۔ ابھی بھی سانس لے رہی ہے۔۔۔ اب تک دم بھی نہ نکلا۔۔۔ چلو آؤ۔"

امانت برف والے کی ماں اپنے ساتھ آئے لوگوں کو لے کر نکلی۔ جاتے ہوئے پانی کی خالی بوتل زرد، بے جان، ڈریس میں جکڑی، پٹیوں میں چھپی عفت پر اچھال گئی۔ جو ذرا کھلی آنکھ سے نجانے کیا دیکھ رہی تھی۔

"میری تو دعا ہے، مر جائے۔۔۔ تمہاری ہمت ہے جو ڈرپ چڑھا کر بے شرمی کو زندگی دینے لگے ہو۔ ذرا جو غیرت ہوتی باپ بھائیوں میں تو وہی سانس گھونٹ دیتے ہونہہ۔۔۔ بہرحال ہماری طرف سے فارغ ہے یہ۔" وہ تنتناتی ہوئی نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

اور رات عفت جھٹکے کھا رہی تھی۔ اس کی ماں اسے چپ رہنے کی تلقین کرتی تھی۔ مگر وہ بولنا چاہتی تھی نجانے کیا۔۔۔ کیا۔

میں بھی خاموشی سے اس کمرے کے بینچ پر ٹک گئی

میرے دل میں کوئی تجسس نہیں تھا۔ نہ ہمدردی میں بس بیٹھ گئی تھی۔

وہ مجھے پہلی نگاہ میں اچھی لگی تھی۔ بھولی بھالی معصوم، خوف زدہ ہرنی جیسی۔۔۔ مسکراتا، دل موہ لینے والا چہرہ، کس قدر حیران آنکھیں۔

وہ میرے اندازوں سے غلط نکلی تھی۔ مجھے اس بات کا دکھ تھا بہت زیادہ۔

"جو دولہا تھا ناں۔۔۔ وہ زیادہ باتیں کرتا نہیں تھا۔ بس اپنے کام سے کام۔۔۔ کبھی کوئی تعریف نہیں کی۔ ڈانٹا بھی نہیں۔

اماں نے بولا۔۔۔ جوان بیٹوں کا گھر ہے۔ شوہر کے سامنے ہنسنا نہیں۔

اور بات نہیں کرنا۔۔۔ ساتھ کھانا نہیں کھانا۔۔۔ اور سب کے سونے کے بعد کمرے میں جانا اور۔۔۔ اور سب سے پہلے باہر آنا۔

نندیں اچھی تھیں۔۔۔ پر مجھ سے بات ہی نہیں کرتی تھیں۔

میں بات کرتی تو اماں کہتی۔۔۔ وہ بہنیں اپنی باتیں کرتی ہیں۔۔۔ کنواری بچیاں ہیں اور تم شادی شدہ۔ ان کے ساتھ تمہارا کیا کام۔۔۔

اور۔۔۔ اور وہ خود بھی مجھ سے بات نہیں کرتی تھی۔ میں ڈرتے ڈرتے بلاتی تو اتنا سخت روکھا جواب دیتی کہ۔۔۔

میں بات ہی بھول جاتی۔"

عفت کا سانس نہیں نکلتا تھا۔ اس کا انداز سراسر خود کلامی کا سا تھا۔ وہ اپنی ماں کو، سب کو، سب کچھ بتا رہی تھی۔ سب اسے سننا بھی چاہتے تھے اور اس کی حالت کے پیش نظر اسے خاموش رہنے کی تلقین بھی کر رہے تھے۔

مگر اسے کسی ہدایت کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ بس بول رہی تھی اور بس بولنا ہی چاہتی تھی۔

کبھی رک جاتی۔۔۔ خاموش جیسے یادداشت کے پتے پلٹ رہی ہو۔

جیسے کچھ بھول رہی ہو۔۔۔ جیسے کچھ یاد آ رہا ہو۔۔۔ اچانک۔

"شادی ایسے تو نہیں ہوتی۔۔۔ کہ نئے گھر میں کوئی بات ہی نہ کرے۔ میں دولہا کو کچھ باتیں سنانے لگتی تو وہ ہوں ہاں کرتا۔۔۔ یا خراٹے بھرتا۔

ہنستا بھی نہیں تھا۔

ماں نے کہا۔ اماں کو میری جگہ سمجھ۔۔۔ مگر ماں تو مجھ سے بات کرتی تھی ناں! لاڈ بھی کرتی تھیں اور ڈانٹتی بھی تھیں۔ گالی ہی سہی۔۔۔ مگر مجھ سے بولتی تھیں۔ سارا سارا دن ہم ساتھ رہتے۔ مگر وہ مجھ سے ایک بات نہ کرتی۔ چپ رہ رہ کر میرا منہ دکھ جاتا۔

کیا۔۔۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ مگر۔۔۔ میں نے کیا کیا تھا؟"

دھیرے دھیرے بولتی وہ ذرا سا اٹھ کر جیسے چلائی اور ہائے ہائے کرتی تکیے پر ڈھلک گئی۔

اس کی ماں اسے سنبھالنے لگی۔ مگر وہ سر کو پٹخنے لگی جیسے اور بھی بولنا چاہتی ہو۔

"اور اس گھر میں نزاکت آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنستا تھا۔۔۔ میری تعریف کرتا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ مجھے باہر لوگوں کے قصے سناتا اور میری باتیں بھی سن لیتا۔

اور میں ایک بار امانت کی بات پر ہنسی تو اماں نے بری طرح ڈانٹا تھا۔ مگر میں نزاکت کے ساتھ ہنستی تو اماں نے کچھ نہیں کہا۔

اور

وہ

نزاکت

بہت اچھی باتیں کرتا تھا۔

بات کرتا تھا تو تالی مارتا اور کمر پر دھپ لگاتا۔۔۔ اور گدگدی کرتا۔

اور۔۔۔" (کچھ یاد آنے پر اس نے آنکھیں سختی سے میچیں۔)

"کسی نے منع نہیں کیا۔" وہ رونے لگی تھی۔

"مجھے بھی پتا نہیں لگا۔

میں اس کے کپڑے دھوتی تھی۔ استری کرتی تھی۔ وہ لطیفے سناتا تھا۔" اس کے آنسو بہنے لگے۔

"یہ سب اماں دیکھتی تھیں۔۔۔ جیسے امانت کے ساتھ ہنسنے پر منع کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی منع کر دیتیں۔ انہوں نے ڈانٹا ہی نہیں۔

دولہا تو ہر وقت چپ رہتا۔ ہر کام ایسے کرتا جیسے مشین ہو۔۔۔ اگر اتنا غلط تھا تو اماں نے کچھ کہا کیوں نہیں؟

میں نے تو کبھی ٹی وی نہیں دیکھا۔ ابا نے رکھا ہی نہ تھا گھر میں۔

مجھے نہیں پتا تھیں گندی باتیں۔" اس نے ہچکی لی

"اور اچھی باتیں بھی۔" اس نے ایک اور ہچکی لی۔ پھر اس کے جسم کو جھٹکے لگنے لگے۔

اس کی تیرہ، چودہ برس کی بہن ڈاکٹر کو بلانے بھاگی۔ عفت بہت تکلیف کے شکنجے میں کس گئی تھی۔ وہ اچھلنا چاہتی تھی۔ جبکہ جنبش سے بھی قاصر تھی۔

پلکیں جھپکنا بھی پہاڑ کاندھے پر رکھ کے چلنے جیسا تھا۔

"تو کس نے کہا پلک جھپکنے کو؟" اس کی آنکھیں چھت پر ٹک کر ساکت ہوئیں تو اندر داخل ہوتے ڈاکٹر نے ہاتھ رکھ کے آنکھیں بند کر دیں۔

مرنے کے بعد پلکیں کیسے جھپک سکتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اور دنیا نے تھو تھو کی تھی۔ لعن طعن۔۔۔ امانت کی

غیرت کی داد دینے والے برف خانے پر باجماعت حاضری دیتے اور پہلی بار امانت کے بے تاثر چہرے پر فخریہ رنگ جمنے لگے۔ وہ اب برف توڑتا تو مسکراتا بھی تھا۔ سو جیسے برف پر نہیں عفت کے پیٹ میں گھونپتا ہر بار۔۔۔۔

امانت برف والے کی ماں نے امانت کو قائل کیا کہ۔

"وہ۔۔۔۔ (گالی) تھی ہی ایسی۔۔۔۔ اور تیرا بھائی تو معصوم دودھ کا دھلا۔۔۔ اسے کیا خبر دنیا کی۔۔۔۔ اللہ بھی اسے گناہ گار تھوڑی کہیں گے۔ وہ کنوارا ہائے ہائے ۔۔۔۔ وہی چھنال فلاں۔۔۔۔ اور ڈھمکاں۔ میرے غیرت والے بیٹے۔"

وہ بیٹوں کو دلاسا دیتی۔ بیٹے بھی خوش۔ نزاکت نے کچھ عرصہ گھر سے دور گزارا۔ پھر ماں اسے گھر لے آئی۔ وہ امانت کی موجودگی سے کتراتا تھا (چور کی داڑھی میں تنکا۔) پھر ماں ہی کو خیال آیا۔ ایک دن دونوں کو بغل گیر کروایا۔

"ناخن سے گوشت جدا ہوتا ہے بھلا۔۔۔۔ بھائی جان سے خفا۔۔۔ توبہ توبہ۔"

جہاں چار لوگ اکٹھا ہوتے عفت کی ذلت کی جاتی اور دھجیاں بکھیری جاتیں۔ تھو تھو کرتے لوگ۔

شادی شدہ عورت تھی۔ عمر سترہ سال تھی تو کیا ہوا؟ سب جانتی تھی۔ وہی ہو گی جس نے ترغیب دی۔ نزاکت تو لاعلم کنوارا جوان لڑکا۔

ہائے ہائے۔۔۔۔ تھو تھو۔۔۔۔

میں بھی تاسف سے سوچتی۔ نواسا چھیڑتا۔

"نانو! بہو نہیں لانی۔۔۔۔ عفت جیسی؟؟"

میں برا مان جاتی۔۔۔۔ اور ڈانٹ دیتی۔ مجھے بہو کے نام پر "عفت جیسی کا" جملہ آگ لگا دیتا۔

"اللہ نہ کرے۔" مگر میرا دل۔۔۔ اور دل کا ایک کونہ جو گونگا تھا۔

گونگے زبان سے بولنا نہیں جانتے۔ مگر ان کے اشارے بہت کچھ کہتے ہیں۔ لیکن گونگوں کی زبان ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

اور ابھی قیامت کے اس دن میں میں نے جن چہروں کو دیکھ لیا اور پہچان لیا تھا۔

وہ یہی تھے۔ امانت برف والا۔۔۔۔ نزاکت۔۔۔۔ عفت اور امانت برف والے کی ماں۔۔۔۔

ہاں! آج فیصلہ ہونا تھا کہ اصل گناہ گار کون تھا۔ پہلے دنیا نے صرف عفت کو سزا سنا دی تھی۔ اسے ذلیل و خوار کیا تھا۔ اسے مجرم گردان کر اس کی میت کی تضحیک کی گئی تھی۔

اور نزاکت جو جرم کا برابر حصہ دار تھا۔ اسے دنیا نے کچھ نہیں کہا۔

ہاں! آج اللہ اس کا صحیح فیصلہ کریں گے۔

آج پتا لگے گا کہ عفت اکیلی قصور وار نہیں تھی۔

اور تالی دو ہاتھوں سے ہی بجتی ہے۔ اکیلا ہوا میں لہراتا ہاتھ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

کاش! آج اس تماشے کو دیکھنے والے حظ اٹھانے والے سب دیکھیں کہ کیا فیصلہ ہو گا۔

اور فیصلہ ہو گیا۔ آج یوم انصاف تھا یوم قرار یوم حساب یوم انجام۔

مگر یہ کیسا فیصلہ۔۔۔۔؟

حیرت سی حیرت۔۔۔۔ مگر اللہ ہمیشہ صحیح کرنے والے ہیں۔۔۔ وہ اور غلط۔۔۔۔ لیکن میری انسانی عقل۔

یہ فرشتے اس جرم میں امانت برف والے کی ماں کو کیوں گھسیٹ کر لے جا رہے ہیں۔ وہ چیخ رہی ہے چلا رہی ہے۔

نزاکت بھی مجرم ہے اور امانت بھی۔۔۔۔ سزا شدہ عفت کے لیے بھی۔۔۔۔ مگر اس جرم میں سب سے بڑی گناہ گار "امانت برف والے کی ماں۔"

یہاں سب کو اپنی پڑی ہے۔ ماں کو اپنی کوکھ جنے بچے یاد نہیں۔۔۔۔

میرے اپنے گناہ بے شمار۔۔۔۔ بال کی گنتی سے زیادہ۔

کیا آپ کی سمجھ میں آرہا ہے کہ وہی اصل گناہ گار کیوں؟

نہیں ناں۔۔۔۔ آپ پر بھی تو اپنی پڑی ہے۔

نگہت سیما

زمین کے آنسو

وہ جو صرف اریب فاطمہ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ مایوس سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر اندرونی گیٹ سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اریب فاطمہ سیاہ چادر اوڑھے چھوٹا سا بیگ اٹھائے اپنے کمرے سے نکلی۔ عاشی اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر چلی گئی اور وہ وہیں کھڑا اریب فاطمہ کا انتظار کرنے لگا۔ اریب فاطمہ کی پلکیں جھکی تھیں اور ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

"اریب فاطمہ! آپ جارہی ہیں۔"

اریب فاطمہ نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھائی تھیں اور پھر فوراً" ہی جھکالیں۔

"ہاں! مجھے اماں سے ملنا تھا بہت ضروری۔ میری دوست گاؤں جارہی تھی۔ میں نے بھی پروگرام بنا لیا۔"

"کون دوست؟ وہی اسپتال والی نرس؟"

اس نے پوچھا اریب فاطمہ نے سرہلا دیا۔

"تو کل پہ تو تو دس گھنٹے لگ جائیں گے شاید۔"

اور اریب فاطمہ نے پھر سرہلا دیا۔

"کیا آپ ابھی جائیں گی۔ بہت دیر نہیں ہوجائے

مکمل ناول

گیارہویں قسط

گی وہاں پہنچتے پہنچتے؟"

اریب فاطمہ نے نظریں اٹھائیں۔

"میں رات کو اپنی دوست کے پاس ہی رہوں گی۔ اور کل صبح بہت سویرے نکلیں گے۔"

"تو اس وقت آپ اپنی دوست کی طرف جارہی ہیں؟" اس نے سرہلا دیا۔

"میں ڈراپ کردیتا ہوں۔"

"نہیں! بابا جان نے یاسین سے کہا ہے وہ مجھے اسپتال چھوڑ آئے گا۔ وہ وہیں کوارٹر میں رہتی ہے۔"

"آپ کیوں اجازت نہیں دے دیتیں اریب فاطمہ! کہ میں کچھ دور تک آپ کی ہمراہی میں چلوں؟" بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا۔ اریب فاطمہ نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ تو عمر بھر کی ہمراہی کے خواہاں ہیں پھر یہ تھوڑی دور کی ہمراہی کی چاہ۔۔۔۔"

"اریب! عمر بھر کی ہمراہی کی چاہ تو میری زندگی کی سب سے بڑی چاہ ہے۔۔۔۔ میں تو اس وقت جانے سے پہلے۔۔۔۔"

"یہ مناسب نہیں ہے۔" اریب فاطمہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے یہاں بہت محتاط ہو کر رہنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی کی انگلی میری طرف اٹھے۔"

"اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کی عزت آپ کا وقار میرے لیے اپنی زندگی سے بڑھ کر ہے۔" اس نے دروازہ کھول کر اسے گزرنے کے لیے رستہ دیا تھا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہو گئے؟" اریب فاطمہ پریشان سی ہو گئی۔

"ہرگز نہیں۔" وہ کھل کر مسکرایا۔

"ایسا سوچنا بھی مت۔ میں کبھی آپ سے ناراض نہیں ہو سکتا۔"

اریب فاطمہ کے ہونٹوں پر ی مدھم سی مسکراہٹ آگئی۔

اس نے بھی اریب فاطمہ کے پیچھے باہر قدم رکھا۔ لان خالی تھا۔ سب لوگ ملک ہاؤس جا چکے تھے۔ یاسین پورچ میں گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔

"اللہ حافظ اریب فاطمہ۔"

"اللہ حافظ۔"

اریب فاطمہ نے بھی آہستگی سے کہا تھا اور سیڑھیاں اتر کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کی نظریں رائٹنگ ٹیبل پر پڑیں.... اور اسے یاد آیا کہ وہ تو ملک ہاؤس سے اس لیے ادھر آیا تھا کہ لکھنے کا کام نبٹا لے۔ اسے ہفتہ وار کالم لکھنا تھا اور کچھ تحقیقی کام بھی کرنا تھا۔

وہ اٹھا اور یوں ہی ننگے پاؤں چلتا ہوا رائٹنگ ٹیبل تک آیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے دراز سے فائل نکالی ... لوگ اس کے کالم پسند کرتے تھے۔ ہر ہفتے ایک نیا موضوع ' ایک نئی بات۔ موضوعات کی کمی نہ تھی۔ بے شمار ایشو تھے' بے شمار دکھ تھے اور بے شمار زخم تھے جو' روز اس پاک سرزمین کے سینے پر لگتے تھے۔ وہ کالم نہیں لکھتا تھا' آنسو پروتا تھا اپنے لفظوں میں۔ لیکن آج.... آج کیا لکھے۔

اس نے قلم نکالا.... اور فائل میں سے سادے صفحات نکالے۔

"ہمیں پینے کے لیے صاف پانی ملے نہ ملے۔ روشنی نصیب ہو نہ ہو' ہمارا عدالتی نظام ضرور آزاد ہونا چاہیے۔ وہ قومیں تباہ ہو جاتی ہیں' جن سے انصاف رخصت ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا تھا۔ تم سے پہلے قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ وہ امیروں کو تو معاف کر دیتے تھے اور غریبوں کو سزا دیتے تھے۔"

وہ لکھتے لکھتے ٹھٹک گیا۔

اس موضوع پر تو وہ پہلے بھی لکھ چکا ہے۔ ایک نہیں' بلکہ دو کالم۔ پھر.... پھر کیا لکھے۔ کچھ دیر وہ قلم یوں ہی ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہا۔ پھر فائل بند کر کے اس نے دراز سے دوسری فائل نکالی۔

"زمین کے آنسو"

فائل پر لکھا تھا۔ اس نے فائل کھولی۔

بہت دنوں سے وہ یہ بھی نہیں لکھ پایا تھا۔ جب سے فلک شاہ اور عمارہ لاہور آئے تھے۔ تب سے اس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔

اس نے فائل کھولی اور پچھلے لکھے پر سرسری سی نظر ڈالنے لگا۔

"مجھے ہمیشہ بہت آنسو ملتے رہے ہیں۔ میرا سینہ زخمی ہے۔ میں تھک گئی ہوں' اتنی کہ اب صرف آنسو بہتے ہیں۔"

حور عین کہہ رہی تھی اور اس کے آنسو خاموشی سے اس کے رخساروں پر بہتے تھے۔ میں فاصلے پر بیٹھا تڑپتا تھا' اس کے لیے اور اس کے آنسو میرے دل پر گرتے تھے۔

مریم کی طرح۔

اور زمین کی طرح میں نے بھی بہت آنسو بہائے ہیں شاید

مریم کے دکھوں پر اور زمین کے دکھوں پر

مریم کے دکھوں کو سمجھنے اور بانٹنے والا کوئی نہ تھا

جب سعدیہ مری تھی۔

اور جب رقیہ ملک ممتاز کے ساتھ رخصت ہوئی تھی اور رخصتی سے پہلے اس نے اپنی نندوں کی منتیں کی تھیں۔ ہاتھ جوڑے تھے۔ وہ جو رقیہ سے پیار کرتی تھیں یا جتاتی تھیں اور اسے لاڈ میں ملکہ الزبتھ کہتی تھیں کہ ان کے نزدیک خوب صورتی کا معیار یہ ہی تھا۔ لیکن کسی نے اس کی داد رسی نہیں کی تھی اور اس کا پور اور وجود ایک آنسو بن گیا تھا۔

اور صرف حور عین تھی' جو اس کے دکھوں کی بھیدی تھی.... اور جو نہ روتی تھی نہ مریم کو تنگ کرتی تھی اور جن راتوں میں مریم سعدیہ اور رقیہ کے دکھ میں جاگتی رہتی تھی وہ بھوکی ہی سو جاتی تھی۔

اس نے صفحہ پلٹا۔

جب یہودا اسکریوتی تیس سکوں کے عوض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کاہنوں کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا تو زمین کے آنسو رکتے ہی نہ تھے۔

"یہ یہودا کون تھا حور عین؟" میں نے شرمندگی سے لبریز آواز میں پوچھا۔

"متی کی انجیل میں ہے کہ یہودا حضرت مسیح کے بارہ حواریوں میں سے تھا اور جب اس نے دیکھا کہ حضرت مسیح کو مجرم قرار دیا جا رہا ہے تو اس نے سکے پھینک کر خودکشی کر لی تھی۔"

اس نے کئی صفحے الٹ ڈالے اور پھر ایک صفحہ پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔

"اور اس شام جب ملگجے سے اندھیرے میں مریم حور عین کا ہاتھ تھامے گھر سے نکلی تھی تو ہر قدم پر ایک سسکی اس کے لبوں سے نکلتی تھی۔

وہ رقیہ اور سعدیہ کو نہیں بچا سکی تھی۔

لیکن وہ فریدہ کو ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔

فریدہ جو تیسری بیٹی تھی اور صرف تیرہ سال کی تھی اور وہ ابھی رابعہ کے ساتھ حویلی کے صحن میں کیکلی ڈالتی اور گڑیوں اور پٹولوں سے کھیلتی تھی۔ جس کی سریلی آواز کچن میں کام کرتی مریم کے لبوں پر مسکراہٹ لے آتی تھی۔ وہ رابعہ کے ساتھ مل کر اونچا اونچا گاتی۔

"ہرا سمندر گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی"

"گوڈے گوڈے"

رابعہ جواب دیتی

اور پھر دونوں کی کھلکھلاہٹوں سے حویلی میں پھول سے بکھر جاتے تھے اور مریم اندر اونچی پیڑھی پر بیٹھی بے اختیار ان کی خوشیوں کے لیے دعا مانگتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں مریم کی دعائیں بے اثر رہ جاتی تھیں۔

حور عین کا ہاتھ تھامے ملگجے سے اندھیرے میں اچھی طرح چادر سے خود کو لپیٹے جب وہ شیر افگن چودھری کے دروازے پر دستک دیتی تھی تو اس کا دل کانپتا تھا اور اس کے کانوں میں گلابو ماچھن کی آواز آتی تھی۔

"سنا ہے چودھری فرید شیر افگن کی بیٹی سے شادی کرنے والا ہے اور بدلے میں اپنی بیٹی کا رشتہ دے رہا ہے اسے۔"

پہلی بات اس نے بے دھیانی سے سنی تھی۔ لیکن دوسری بات نے اسے دہلا دیا تھا۔

"مجھے نورو مصلن نے بتایا ہے کہ فریدہ...."

"نہیں...." اس کی چیخ صرف اس نے خود ہی سنی تھی۔ فریدہ صرف تیرہ سال کی تھی اور شیر افگن جو چودھری فرید کا چچیرا بھائی تھا' عمر میں اس سے بھی بڑا تھا اور پچھلے سال اس کی بیوی ہیضے سے مر گئی تھی اور اس کی بیٹی تیس سال کی تھی یا شاید تھوڑی بڑی۔

کیا کل رات اس نے جو چودھری فرید سے کہا تھا' یہ اس کا ردِعمل تھا یا پھر اس نے پہلے سے ایسا سوچ رکھا تھا؟ کل رات چار راتوں کے بعد وہ ڈیرے سے گھر آیا تھا' تو اس نے چودھری فرید سے کہا تھا۔

"میں تجھے بیٹا نہیں دے سکی۔ صرف بیٹیاں ہی دیں' تو شادی کر لے۔ کسی سے بھی تھورو سے یا میراں سے۔ لیکن اس طرح راتوں کو ڈیرے پہ.... ہماری بیٹیاں بڑی ہو گئی ہیں اور وہ باپ کے رازوں کو جاننا چاہتی ہیں۔"

چودھری فرید نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس سوچتی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

اور اب وہ شیر افگن کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

"میری بیٹی بہت چھوٹی ہے شیر افگن! صرف تیرہ سال کی۔"

"تو؟" شیر افگن مونچھیں مروڑ رہا تھا۔

"یہ ظلم نہ کر..."

"فرید سے کیوں نہیں کہتی؟"

"شنوائی نہیں ہوگی۔ جانتی ہوں۔"

"لیکن میں زبان دے چکا ہوں اور برادری میں سب کو پتا ہے کہ تو فرید کو بیٹا نہیں دے سکی۔ اس لیے وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔"

"تجھے تو اللہ نے بیٹے بھی دیے ہیں اور بیٹیاں بھی تو میری بیٹی کا خیال چھوڑ دے۔ میں تیری بیٹی کو خود دلہن بنا کر لے جاؤں گی۔ اسے سونے کے پلنگ پر بٹھا کر ساری زندگی اس کی چاکری کروں گی۔ پھولوں کی طرح رکھوں گی۔ پر میری بیٹی کو معاف کر دے۔ اس سے شادی کا خیال دل سے نکال دے۔ منع کر دے چودھری فرید کو۔"

اور جب وہ واپس آ رہی تھی تو گاؤں کی گلیوں میں اندھیرا پھیل گیا تھا اور حور عین کا ہاتھ تھامے وہ بمشکل قدم اٹھاتی تھی۔

شیر افگن نے کوئی امید نہیں دلائی تھی۔ بس چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔ مونچھوں کو بل دیتا اور دل ہی دل میں مسکراتا۔

گھر واپس جاتی مریم کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی... اور دارو سائیں پتا نہیں کس گلی سے نکل کر ان کے پیچھے دبے پاؤں چلتا تھا۔

دارو سائیں جو اس کا سگا پھوپھی زاد تھا۔ لیکن وہ جب اس کی طرف دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں میں پہچان کے کوئی رنگ نہ ہوتے تھے۔ اجنبی نظریں۔

پھر بھی مریم کو لگتا تھا کہ داور سائیں اس کے دکھوں پر روتا ہے۔

اور اس روز جب گاؤں کی گلیوں میں اندھیرا اتر آیا داور سائیں اس کے پیچھے پاؤں چلتا تھا اور نورو مصلن ہونٹوں کو سرخی سے رنگے اور چہرے پر پاؤڈر تھوپے وہ لہرا کر مست چال چلتی اس کے پاس سے گزر کر ڈیرے کی طرف جا رہی تھی تو مریم کا دل پاتال میں گرتا تھا اور آنکھیں لہو روتی تھیں۔ پھر بھی وہ چادر اچھی طرح لپیٹے حور عین کا ہاتھ تھامے تیز تیز چلتی حویلی کی سمت جاتی تھی۔ اندر حویلی میں رقیہ بار بار گھڑونچی کی جالیوں میں جھانکتی تھی کہ مریم نے دیر کیوں کر دی۔"

ایک گہری سانس لے کر ایبک نے سوچا۔ پتا نہیں کب مکمل ہوگی یہ کہانی۔

اور پھر صفحے پلٹتے ہوئے اس نے ایک صفحے کو پڑھا۔

یہ 14 جولائی 1099 تھا۔ جب بیت المقدس کے راستوں پر ہر جگہ مسلمانوں کے کٹے ہوئے سروں، ہاتھوں اور پیروں کے انبار لگے تھے اور ہیکل سلیمانی میں لاشیں خون میں تیرتی پھرتی تھیں۔

اور زمین ہچکیاں لے لے کر روتی تھی۔ تم کہتے ہو زمین کو تو رونے کی عادت ہے۔ لیکن زمین کیا کرے۔ جب تم نے اسے صرف آنسوؤں کی سوغات ہی دی ہے۔ اتنے آنسو کہ سدا اس کی آنکھیں بھیگی ہی رہتی ہیں۔

میں نے دیکھا، حور عین کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور وہ اوڑھنی کے پلو سے اپنا گیلا چہرہ پونچھ رہی تھی۔ اور جب سے وہ ملی تھی مجھے۔ میں نے اسے روتے ہی دیکھا تھا۔

"حور عین!" میں نے آہستگی سے اسے بلایا۔

دروازے پر بیل ہو رہی تھی۔

اس نے چونک کر فائل بند کر دی اور اٹھا۔

"شاید انکل شیر دل ہوں یا آنٹی نے کسی کو بھیجا ہو۔ لیکن اگر آنٹی نے بلایا تو میں معذرت کر لوں گا۔" اس نے سوچا۔ اس کا موڈ لکھنے کا بن رہا تھا۔

پڑھتے پڑھتے لفظ اور خیالات اس کے اندر بن اور بگڑ رہے تھے۔

"آج میں ضرور کچھ بہت سارا لکھ لوں گا۔" دروازہ کھولتے ہوئے اس نے سوچا اور دروازہ کھولتے ہی اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"آپ یہاں؟" اور وہ حیرت سے رابیل کو دیکھ رہا تھا۔

رابیل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور وہ اس طرح ایبک کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کی حیرت کو انجوائے کر رہی ہو۔

ایبک نے رابیل کے پیچھے کسی اور کو دیکھنے کی کوشش کی۔

"میں اکیلی آئی ہوں۔" رابیل نے اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بتایا۔

"لیکن کیوں؟ کس لیے؟ خیریت ہے نا؟" ایبک کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ وہ ابھی تک دروازے پر ہی کھڑا تھا اور رابیل دروازے سے باہر۔

"خیریت ہے... اور کیا میں نہیں آ سکتی یہاں؟"

ایبک نے سر ہلا دیا۔ لیکن وہ ابھی تک حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اگر اسے کوئی کام بھی تھا تو وہ ابھی "ملک ہاؤس" سے ہی آ رہا تھا وہ کہہ سکتی تھی۔

"آپ کو غالباً مجھے یہاں دیکھ کر بہت حیرت ہو رہی ہے۔ میری جگہ اگر منیبہ یا حفصہ ہوتیں تو شاید آپ اتنے حیران نہ ہوتے۔"

"شاید۔" ایبک نے آہستگی سے کہا۔ وہ ابھی تک الجھا ہوا تھا اور رابیل کے یہاں آنے کا مقصد سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو چلیں میں آپ کی حیرانی دور کر دیتی ہوں۔ ایکچوئلی میں یہاں آنٹی مسز شیر دل سے ملنے آئی ہوں۔ اسپتال میں دو بار میری ان سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ کسی روز میں ان سے ملنے ان کے گھر آؤں گی اور ان کی بنائی ہوئی پینٹنگ اور پھول وغیرہ دیکھوں گی۔"

ایبک نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اور اندر جانے سے پہلے میں ادھر اس لیے آئی ہوں کہ مجھے آپ کو ایک بات بتانا تھی۔"

"جی...!" ایبک پھر ذرا سا حیران ہوا اور ایک طرف ہو کر اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

"آیئے۔" رابیل نے ایک قدم اندر رکھا اور پھر وہیں رک گئی اور نظریں اٹھا کر ایبک کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"مجھے آپ کو صرف یہ بتانا تھا کہ..." وہ تھوڑا سا رکی۔

"آپ مومی انکل سے کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو ناپسند کرتی ہوں اور اگر میرا بس چلے تو میں آپ کا داخلہ "الریان" میں بند کر دوں... تو ایسا نہیں ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ کو ناپسند نہیں کرتی۔"

"اوہ! تو آپ نے میری بات سن لی تھی۔" اتنی دیر میں پہلی بار ایبک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ لیکن پھر وہ ایک دم چونکا۔

"کیا رابیل نے بابا کی بات بھی سنی تھی اور کیا وہ...؟"

"سوری..." رابیل نے نظریں جھکائیں۔

"میں بابا جان سے ملنے آئی تھی کہ آپ کی بات سن کر وہیں سے ہی پلٹ آئی۔"

ایبک نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا کہ کیا واقعی اس نے صرف اتنی سی ہی بات سنی تھی یا...

"بیٹھیں پلیز۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

رابیل نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں! بس اب چلتی ہوں۔ آنٹی شیر دل انتظار کر رہی ہوں گی۔ آنے سے پہلے میں نے فون کر دیا تھا انہیں۔ دراصل مجھے بہت دکھ ہوا تھا کہ آپ میرے متعلق اتنا غلط سوچتے ہیں۔ میں یہاں سے گزر رہی

تھی تو مجھے خیال آیا کہ حفصہ نے بتایا تھا کہ آپ یہاں انیکسی میں رہتے ہیں۔ عمر بھی اکثر ذکر کرتا رہتا ہے تو بے اختیار میں ادھر آگئی کہ آپ کی غلط فہمی دور کر سکوں۔"

ایبک کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ رابیل کا جو رویہ تھا' وہ صرف اسے ہی نہیں' سب کو محسوس ہوتا تھا۔ عمر نے تو کتنی دفعہ بے حد تاسف سے کہا تھا۔

"پتا نہیں کیا بات ہے۔ رابی آپی آپ سے اتنا چڑتی ہیں۔"

"میں جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی' میری نیچر ہے یہ۔ آپ سے بھی جھجک آتی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔۔۔ کہ میں آپ کو ناپسند کرتی ہوں۔ آپ میرے کزن ہیں۔"

اسے خاموش دیکھ کر رابیل نے وضاحت کی تو ایبک بے اختیار ہنس دیا۔

"اوہ اوکے رابیل! میں نے تو یوں ہی ایک بات کر دی تھی۔ آپ نے اسے اتنا محسوس کیا' سوری۔"

اور یہ ایبک کی ہنسی کیسے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیتی ہے۔ رابیل نے بالکل اریب فاطمہ کی طرح سوچا اور نظریں ایبک کے چہرے سے ہٹا لیں۔

"سوری تو مجھے کرنا چاہیے کہ آپ میرے رویے سے ہرٹ ہوئے اور آپ نے ایسا سوچا۔"

"اب آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں رابیل۔۔۔! اور میں ایسی باتوں سے ہرٹ نہیں ہوتا۔ بے شک میں آپ کا کزن ہوں۔ لیکن آپ کے لیے اجنبی ہی تھا ایک طرح سے۔ ہاں! آپ کے لیے میں اجنبی نہ ہوتا ۔پھر آپ کا رویہ ضرور مجھے ہرٹ کرتا۔"

"میں اب چلوں۔" رابیل نے باہر قدم رکھا۔

"میں آپ کو اندرونی دروازے تک چھوڑ آؤں۔"

"نہیں! میں چلی جاؤں گی۔"

رابیل چلی گئی تو دروازہ بند کر کے وہ واپس آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کمال ہے۔۔۔" وہ بڑبڑایا۔ "یعنی کہ رابیل احسان یہاں میری انیکسی میں صرف یہ بتانے آئی ہے کہ وہ مجھے ناپسند نہیں کرتی۔

شاید رابیل کے اندر یہ تبدیلی اس لیے آئی ہے کہ میں نے اسے بلڈ دیا تھا۔" اس نے سوچا لیکن اندر کہیں ایک چبھن سی تھی۔

اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کھلی ہوئی فائل کے صفحے پر نظر دوڑائی۔

"تو اس روز فصیلوں اور برجوں پر ان کے لوگ موجود تھے اور بیت المقدس کے راستوں میں مسلمانوں کے کٹے ہوئے ہاتھوں' پیروں اور سروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔"

اس نے ایک ساتھ کئی صفحات الٹ دیے تھے اور اب آخری لکھے گئے صفحے کو دیکھ رہا تھا۔

"اور اس رات حورعین کو لگا۔ جیسے وہ ایک دم بڑی ہو گئی ہو۔ جیسے وہ گیارہ سال کی معصوم بچی نہ ہو۔ بلکہ ایک میچور عمر کی لڑکی ہو اور وہ گیارہ سالہ حورعین ماں کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی تھی اور اپنے سامنے کھڑے چودھری فرید کی آنکھوں میں دیکھتی تھی۔"

اس نے قلم اٹھایا اور کافی دیر یوں ہی قلم ہاتھ میں تھامے خالی صفحے کو دیکھتا رہا۔ پتا نہیں' وہ کیا لکھنا چاہتا تھا۔ اس روز اس نے یہاں تک ہی لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔

اب کتنے دنوں بعد اس نے یہ فائل اٹھائی تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے اس کے ذہن میں کہانی کے واقعات بن اور سنور رہے تھے۔ لیکن اب ذہن بالکل خالی تھا۔ کہیں کوئی ایک لفظ کوئی ایک جملہ ذہن میں نہیں آرہا تھا یقیناً" رابیل کی اس اچانک آمد نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

اس نے فائل بند کر دی۔

اور ہاتھ بڑھا کر میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا۔ تاکہ کسی خبر کو اپنے کالم کا موضوع بنا سکے۔

بہرحال اسے ہر صورت کالم تو لکھنا تھا۔

اسے اپنے مطلب کی خبر مل گئی تھی۔ وہ کچھ دیر اخبار ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر رائٹنگ ٹیبل کے پاس آیا اور اب وہ کالم لکھ رہا تھا۔ اس کا قلم بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ کالم لکھ کر وہ اٹھا اور اس نے سوچا کہ باتھ لے کر وہ کچھ دیر کے لیے سو جائے۔

سونے اور باتھ لینے سے یقیناً" وہ فریش ہو جائے گا تو شاید کچھ مزید لکھ سکے اپنی کہانی۔ کم از کم وہ کچھ جو اس نے ادھورا سا چھوڑ دیا تھا۔ پتا نہیں وہ اس وقت کیا لکھنا چاہ رہا تھا۔ حورعین کیوں مریم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی تھی۔ کیا تھا اس کے ذہن میں۔

وہ سوچتا ہوا سو گیا۔ جانے کتنی دیر سویا تھا وہ۔ اس کی آنکھ پھر فون کی آواز سے ہی کھلی تھی وہ بے دھیانی سے فون کی آواز سنتا رہا۔ فون بج بج کر خاموش ہو گیا تھا۔

"اریب فاطمہ!" اس کے لبوں سے نکلا۔

اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور آنکھوں کے سامنے اریب فاطمہ کا سراپا لہرایا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ اریب فاطمہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں کسی دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھے تھے۔ سامنے برف سے ڈھکے پہاڑ تھے۔ تیز ہوا چلتی تھی اور اریب فاطمہ کا بڑا سا دوپٹا تیز ہوا سے اڑ اڑ کر اس کے چہرے سے ٹکراتا تھا اور جیسے اس کے مشام جاں کو معطر کر جاتا تھا۔

"اریب فاطمہ۔" اس کے اڑتے دوپٹے کے پلو کو دونوں مٹھیوں میں بھینچتے ہوئے اور اس کی خوشبو سونگھتے ہوئے وہ بڑے جذب سے کہہ رہا تھا۔

"اریب فاطمہ! مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا۔"

"میں بھلا آپ کو کیوں چھوڑ کر جاؤں گی۔ میں تو۔" اریب فاطمہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اریب فاطمہ کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبا جاتا تھا۔

"اریب فاطمہ! تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں اور ان میں کتنا سحر ہے۔ پتا ہے' مجھے پہلے تمہاری آنکھوں نے ہی اسیر کیا تھا۔"

اریب فاطمہ کے رخسار شفق رنگ ہو گئے تھے اور لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ آن کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ جب رابیل نے اس کے کندھے پر آکر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ رابیل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"اٹھو آپی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ حیران سا رابیل احسان کو دیکھتا تھا اور اریب فاطمہ کی آنکھوں کے کٹورے پانیوں سے بھرتے جاتے تھے۔ وہ اریب فاطمہ کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے کٹوروں سے چھلک جانے والے پانیوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا۔ وہ رابیل کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے اس کے ساتھ نہیں جانا۔ بلکہ وہ یہاں اریب کے ساتھ بیٹھنا اور اسے دیکھنا چاہتا ہے کہ فون کی بیل سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"پتا نہیں کس کا فون تھا۔" اس نے آنکھیں کھول کر تکیے کے پاس پڑے اپنے سیل فون کو دیکھا۔ اجنبی نمبر تھا۔ شاید رانگ نمبر ہو اور کتنا اچھا ہوتا اگر بیل نہ ہوتی۔

"اگر تم جان لو اریب فاطمہ! کہ میں تمہارے متعلق کتنے خواب دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاؤ۔ جب تم ملو گی تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا کہ میں ہر رات تمہیں خواب میں دیکھتا ہوں۔۔۔ اور آج تو دن میں بھی تم میرے خوابوں میں چلی آئی ہو۔"

"رابیل۔۔۔ یہ آج رابیل کہاں اس کے خواب میں چلی آئی تھی۔"

اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

اور یہ غالباً" اس کی آج کی آمد کا نتیجہ ہے۔ میں سونے سے پہلے اسے ہی سوچ رہا تھا اس لیے وہ خواب میں چلی آئی۔

اس نے سامنے کلاک پر نظر ڈالی۔ چھ بج رہے تھے۔

اس نے فون نیچے رکھا ہی تھا کہ بیل پھر ہونے لگی۔

وہی نمبر تھا۔ اس نے فون آن کیا۔

"ہیلو۔۔۔!"

"السلام علیکم! آپ ایبک ہیں نا؟"

"جی!" وہ چونکا۔ اسے اپنے کانوں پر شبہ ہوا۔

"میں اریب ہوں۔۔۔ اریب فاطمہ!"

"اریب فاطمہ۔۔۔ آپ کیسی ہیں؟ خیریت ہے نا؟ سب ٹھیک ہے نا؟ آپ نے کیسے فون کیا؟"

"جی! سب ٹھیک ہے۔ میں یہاں اپنے دوست کے گھر آئی ہوئی تھی۔ وہ ادھر کام کرتی ہے ایک این جی او میں۔ انہوں نے اسے سیل فون دے رکھا ہے۔ اس کے فون سے بات کر رہی ہوں۔ میں نے سوچا آپ کو بتا دوں، میں خیریت سے پہنچ گئی ہوں اور یہاں سب ٹھیک ہیں۔ اماں ابا بھائی سب۔"

"تھینک یو۔۔۔ تھینک یو اریب فاطمہ۔" ایبک بے حد خوش ہوا تھا۔

"یقین کریں! میں کس قدر بے چین تھا جاننے کے لیے کہ آپ وہاں خیریت سے پہنچ گئی ہیں۔ لیکن آپ نے تو اس طرح کی کوئی امید نہیں دلائی تھی کہ۔۔۔"

"مجھے خود نہیں پتا تھا کہ میں آپ کو فون کر سکوں گی یا نہیں۔ زینب آپا سے ملنے آئی۔ ان سے کہا میں نے ایک فون کرنا ہے اور انہوں نے اجازت دے دی۔ اتفاق سے آپ کا کارڈ بھی جو اس روز آپ نے دیا تھا۔ میرے پرس میں ہی تھا یوں بات ہو گئی۔ زینب آپا میری دوست ہیں۔"

"تھینک یو۔۔۔ ایبک کا جی چاہ رہا تھا وہ اس سے بہت دیر باتیں کرے۔ اسے بتائے کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسے ہی خواب میں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں کتنی حسین وادی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ کسی کا فون استعمال کر رہی ہے۔

"سنیں اریب فاطمہ! آپ فون بند کریں۔ میں فون کرتا ہوں آپ کو۔۔۔ آپ کی فرینڈ کا بیلنس ختم ہو جائے گا اور۔۔۔"

"نہیں! بیلنس کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اسے ا کی این جی او والے بیلنس کروا کے دیتے ہیں۔ ا اس نے مجھے اجازت دی ہے کہ جتنی مرضی با کر لوں۔ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ لیکن میں اب بند کر ہوں۔ وہ چائے بنانے گئی ہے۔ آ رہی ہو گی۔"

"آپ کی آواز میں کتنا سحر ہے اریب فاطمہ! مجھے لگتا ہے میں آپ کی آواز سے جی اٹھا ہوں۔"

وہ ہولے سے ہنسی۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"سچ کہہ رہا ہوں اریب فاطمہ!" ایبک کی آواز بوجھل ہو گئی۔

"آپ نہیں جانتیں اریب فاطمہ! آپ میرے لیے کیا ہیں۔ میری زندگی۔۔۔ میری حیات کی روشنی"

وہ پھر ہنسی تھی۔ مدھر مدھر سی ہنسی۔

"آپ کی ہنسی بھی بہت خوب صورت ہے اریب فاطمہ!" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

"میں نے پہلے کبھی آپ کی ہنسی کی آواز نہیں سنی۔۔۔ ہمیشہ آپ کی آنکھوں میں نمی دیکھی ہے۔ کاش! اس وقت میں آپ کے قریب ہوتا اور اس ہنسی کو آپ کے لبوں پر بکھرتے اور چہرے کو روشن کرتے دیکھتا۔"

"پلیز! اب اجازت دیں۔ زینب آپا آ رہی ہیں۔" وہ اتنی دور سے بھی اس کی آواز میں گھبراہٹ محسوس کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً" شرما بھی رہی ہو گی اور اس کی لانبی پلکوں کا سایہ اس کے رخساروں پر لرز رہا ہو گا۔

"اریب فاطمہ! یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کب تک آ رہی ہیں؟"

"ابھی تو آئی ہوں۔ کم از کم ایک ہفتہ اور رہوں گی۔ اماں بہت کمزور ہو رہی ہیں۔ مجھے ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔"

اس کی کھلکھلاتی آواز میں اداسی کی خزاں اتر آئی۔ وہ بے چین ہو گیا۔

"کیا ہوا ہے اماں کو؟"

"کچھ نہیں.... وہ بیمار نہیں ہیں۔ معمول کے مطابق سب کام کر رہی ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے' وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہیں' وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں اریب فاطمہ! اور کسی ڈاکٹر سے چیک اپ کروالیں ان کا.... تسلی ہو جائے گی۔ اگر صرف ویک نیس ہے تو آپ ان کی خوراک کا خیال رکھیے گا۔"

"جی....!"

"پھر کب فون کریں گی؟" اس نے پوچھا۔

"پتا نہیں.... شاید کروں.... شاید نہ کر سکوں۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

فون بند ہو گیا تھا۔ لیکن ایبک ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھ رہا تھا۔

"تھینک یو اریب فاطمہ۔" اس نے آہستگی سے کہا اور فون رکھ دیا۔

"آپ کو کیا خبر اریب فاطمہ! آپ سے بات کرنا.... آپ کا انتظار کرنا اور آس رکھنا ملن کی۔ اتنا ہی خوب صورت ہے۔ جتنا کسی خوب صورتی کا خوب صورت ہونا اور خوب صورت تر ہوتے چلے جانا۔"

وہ اٹھا تو اس کے لبوں پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی۔ اریب فاطمہ سے بات کر کے وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ وہ گنگناتے ہوئے تیار ہوا تھا۔ اسے "الریان" جانا تھا۔ لیکن جانے سے پہلے وہ کچھ دیر تک انکل شیر دل کے پاس رکا تھا۔ وہ اپنی نگرانی میں فلک شاہ کے لیے گیسٹ روم تیار کروا رہے تھے اور بے حد خوش تھے۔

"تم کہاں جا رہے ہو آپی؟" ایک تنقیدی نظر گیسٹ روم پر ڈال کر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔

"پہلے اخبار کے دفتر میں جاؤں گا۔ پھر بابا کی طرف۔"

"انتظار نہیں ہو رہا یار! اسے رات میں ہی لے آنا۔"

ایبک مسکرا دیا۔

"کہوں گا ان سے.... یہ آنٹی کہاں ہیں۔ ان سے مل لوں۔"

"پڑوس میں گئی ہیں۔ ویسے تمہاری آنٹی کمال کی عورت ہیں یار۔ انہیں موی کی پسند ناپسند سب یاد ہے۔ اس وقت سے کچن میں گھسی' ابھی باہر نکلی ہیں۔ تمہاری کزن کو بھی کچن میں ہی بٹھا لیا تھا۔"

ایبک نے سر ہلا دیا۔

"جب وہ انکل شیر دل کے پاس سے اٹھا تو باہر اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور جب وہ ملک ہاؤس پہنچا تو روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ ملک ہاؤس میں خاموشی تھی۔ ورنہ جب سے فلک شاہ اور عمارہ آئے تھے' ہر وقت رونق لگی رہتی تھی۔

"ارے! سب کہاں ہیں؟" اس نے لاؤنج میں بیٹھی عمارہ سے پوچھا' جو بے حد انہماک سے احمد حسن کا پروگرام دیکھ رہی تھی۔

"الریان میں۔" عمارہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ایبک کو لگا جیسے وہ بہت افسردہ اور خاموش ہوں۔

"کیا ہوا ماما؟" ایبک نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے ٹی وی کی آواز بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں۔"

"نہیں! کچھ تو ہے۔ آپ اداس لگ رہی ہیں۔" ایبک نے عمارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پریشانی سے انہیں دیکھا۔

"اور سب لوگ "الریان" کیوں چلے گئے؟ کیا کوئی بات ہوئی ہے؟"

"ارے نہیں۔" عمارہ ہولے سے ہنسیں۔ "میں نے خود کہا تھا ثنا بھابی سے کہ آج وہ لوگ "الریان" میں ہی رہیں اور جو ہلا گلا کرنا ہے۔ ادھر ہی کریں۔ تمہاری مائرہ مامی بہت محسوس کر رہی تھیں کہ وہ ان رونقوں کو انجوائے نہیں کر پا رہیں۔ جبکہ ان کا حق ہے کہ وہ بھی اس رونق کا حصہ بنیں۔"

"تو کیا ان کے پاؤں میں مہندی لگی ہے؟ جب سب ادھر آ سکتے ہیں تو وہ کیوں نہیں آ سکتیں؟"

"ان کی مرضی آپی....!" عمارہ کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

"آپ اداس نہ ہوں ماما پلیز۔" ایبک نے اپنے ہاتھ میں دبے ان کے ہاتھ کو ہولے سے دبایا۔

"کچھ دکھ ان کانٹوں کی طرح ہوتے ہیں آپی! جو گوشت میں دور تک اتر جاتے ہیں۔ ان کانٹوں کو نکال بھی دو تو کسک باقی رہتی ہے۔ میں کبھی "الریان" میں قدم نہیں رکھ سکتی.... یہ کانٹا تو ہمیشہ گوشت کے اندر گہرائی میں موجود چبھتا رہے گا اور اس سب سے بڑھ کر شانی کی ناراضی اور خفگی.... تمہارے بابا اندر ہی اندر گھل رہے ہیں آپی.... اتنا تو انہوں نے شانی بھائی کو وہاں بھی یاد نہیں کیا تھا۔ جتنا یہاں آ کر کرنے لگے ہیں۔ اس کی ایک ایک بات دس دس بار دہراتے ہیں۔"

عمارہ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور ان کی نم آنکھوں نے ایبک کو تڑپا دیا۔

"ماما! پلیز اس طرح دل چھوٹا مت کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ.... مجھے یقین ہے ایک دن احسان انکل خود بابا کے پاس آئیں گے۔ وقت بھی بہت بڑا منصف ہوتا ہے۔ ایک دن دیکھیے گا' سب سچ سامنے آ جائے گا۔"

عمارہ نے سر ہلا دیا۔

اور یہ انجی کہاں ہے؟"

"مسوی ساتھ ہی لے گئی تھی اسے۔"

"اور بابا کیا کر رہے ہیں؟"

"بابا جان کے ساتھ سیاست پر بحث کر رہے ہیں۔" عمارہ مسکرائیں۔

"بابا جان کو سیاست سے نفرت تھی۔ لیکن آج کل ہر وقت تمہارے بابا کے ساتھ سیاست پر ہی گفتگو کر رہے ہوتے ہیں یا پھر ملکی حالات پر۔"

"آپ اکیلی بیٹھی ہیں۔ انجی کو روک لیتیں۔"

"ارے نہیں بیٹا! میں نے خود انجی کو بھیجا تھا.... اور سچی بات ہے کہ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔ رانی نے گلہ کیا کہ یہ رونقیں ادھر ہوتیں "الریان" میں تو انجی بھی وہاں آتی۔ اب تو الریان والے بھی حفصہ کی شادی انجوائے نہیں کر پا رہے۔" ایبک نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"اوہ! تو اس لیے آپ نے ثنا مامی کو ادھر بھیجا۔"

"دراصل مجھے پہلے ہی خیال کر لینا چاہیے تھا۔ ان سب نے تو پکے ڈیرے ادھر ہی جما لیے تھے۔ مائرہ بھابی نے بہت محسوس کیا۔"

ایبک بنا کچھ کہے کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے! آپ اپنا پروگرام دیکھیں۔ میں بابا کے پاس جا رہا ہوں۔"

"ان سے مل کر "الریان" چلے جانا۔ ہمدان بہت تاکید کر کے گیا تھا کہ جیسے ہی تم آؤ' تمہیں بھیج دوں۔"

"ٹھیک ہے۔" ایبک نے سر ہلایا اور بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ عمارہ نے ٹی وی کی آواز کھولی تھی۔ احمد حسن کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے ایبک نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس شخص کی گفتگو اور شخصیت میں اثر تھا۔ لیکن پچھلے ایک دو پروگراموں میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں۔ جس پر ایک دو صحافیوں نے کڑی تنقید کی تھی۔ لیکن ایبک نے خود اس کا پروگرام نہیں دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا۔ کچھ دیر رک کر اس کا پروگرام دیکھے اور اندازہ کرلے کہ آیا صحافیوں نے صحیح تنقید کی تھی یا محض اس کی شہرت سے خائف ہو کر اس کے خلاف لکھا تھا۔ عجیب دور تھا۔ ہر ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنے کے چکر میں تھا۔

"پھر کبھی آرام سے دیکھوں گا یہ پروگرام۔" اس نے ہولے سے سر کو جھٹکا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ملک شاہ اور عبدالرحمٰن شاہ کوئی ٹاک شو دیکھ رہے

تھے۔ موضوع گفتگو۔ "اسامہ بن لادن اور القاعدہ" تھا۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا اور انہیں کرنل شیر دل کا پیغام دیا۔

"نہیں یار! صبح ہی چلیں گے۔ تم آج ادھر ہی رک جانا۔" ان کا دھیان ٹی وی کی طرف تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ انہیں الریان جانے کا بتا کر باہر آ گیا۔

☼ ☼ ☼

"الریان" کے لاؤنج میں سب ہی خواتین جمع تھیں اور حفصہ کے کپڑے استری کر کے پیک کیے جا رہے تھے۔ ایبک نے دروازے پر رک کر سب پر نظر دوڑائی۔ مائدہ دائیں طرف نیچے کارپٹ پر بیٹھی مرتضیٰ شاہ کی بیوی سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔ جبکہ رابیل منیبہ سے کپڑے لے کر اٹیچی میں رکھ رہی تھی۔ حسب معمول سب سے پہلے منیبہ نے ہی اسے دیکھا تھا۔

"ارے ایبک بھائی! آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟ اندر آجائیں نا۔"

وہ ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ایبک کیا ہوا جوڑا انجی کو پکڑا دیا اور خود کھڑی ہو گئی۔

"آجائیے نا..... یہ ہم حفصہ کے کپڑے ٹانک رہے ہیں۔ کچھ کپڑے ہینگ کردیے ہیں۔ دکھاؤں۔" بے اختیار انجی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بھلا آپی کو خواتین کے کپڑوں سے کیا دلچسپی۔"

"یہ خواتین کے نہیں، حفصہ آپی کے کپڑے ہیں۔" عاشی کو غالباً" انجی کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنی ناک سکیڑتے ہوئے کہا تو سب کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایبک نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"بالکل بچہ! حفصہ کے کپڑے میں ضرور دیکھوں گا۔ لیکن اس وقت میں ہمدان کی طرف جا رہا ہوں۔ اپنے کمرے میں ہو گا۔"

ایبک مڑا۔

"تو ہومی کو بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔" منیبہ نے پھر اسے روکا۔

"نہیں بھئی! اس خالص خواتین کی محفل میں ہمارا کیا کام۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ہمدان کا کمرا فرسٹ فلور پر تھا۔

"تم بھی حد کرتی ہو مونی۔ اب بھلا یہاں ایبک کا کیا کام۔" ایبک نے جاتے جاتے سنا۔ مائدہ کہہ رہی تھی۔

"ایبک کوئی غیر تو نہیں ہے مما۔"

یہ رابیل کی آواز تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ رابیل اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ ایبک کے مڑ کر دیکھنے پر اس نے نظریں جھکا لیں۔ ایبک سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ہمدان آنکھیں موندے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب دستک دے کر ایبک اندر داخل ہوا۔ ہمدان ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اب آئے ہو آپی! کہا بھی تھا' جلدی آنا۔"

"میں سو گیا تھا۔ کوئی خاص کام تھا کیا؟"

"نہیں تو بس یوں ہی بہت دن ہو گئے تھے جی بھر کر باتیں کیے۔ سوچا تھا' کہیں باہر چلیں گے۔"

"تو اب چلتے ہیں۔" ایبک ابھی تک کھڑا تھا۔

"ٹھیک ہے! میں تیار ہوتا ہوں۔ تم بیٹھو۔"

ہمدان اٹھ کھڑا ہوا تو ایبک بیٹھ گیا اور بیڈ پر پڑا میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک صفحہ پلٹتے ہوئے وہ چونکا۔

آدھے خالی صفحے پر جگہ جگہ "سمیرا" لکھا ہوا تھا۔ مختلف انداز میں کہیں پھولوں کے اندر' کہیں کسی اسٹائل میں۔ ہمدان شرٹ چینج کر کے واش روم سے نکلا تو ایبک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے میگزین اس کے سامنے کیا۔

"یہ کیا حماقت ہے ہمدان؟" ہمدان نے جھک کر دیکھا اور بے حد شرمندہ ہوا۔

"سوری! یوں ہی اکیلا بیٹھا اسے سوچ رہا تھا تو لکھتا

چلا گیا۔"

"تم کوئی ٹین ایجر لڑکے نہیں ہو ہومی!" ایبک بے حد سنجیدہ تھا۔

"یہ میگزین کسی اور کے ہاتھ بھی لگ سکتا تھا۔ وہ کیا سوچتا..... سمیرا کی عزت اور وقار کا خیال رکھنا چاہیے تمہیں۔"

"دراصل وہ..... تم نہیں جان سکتے آپی! کہ میری محبت کی شدت ہر گزرتے دن کے ساتھ کتنی زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ تم نے اگر کسی سے محبت کی بھی ہے تو اتنی شدت سے نہیں۔" ایبک نے میگزین کا وہ صفحہ میگزین سے نکال لیا۔

"محبت محبت ہوتی ہے۔ اس کی شدت کم یا زیادہ نہیں ہوا کرتی میری جان! کسی بھی دور میں یہ جب واقع ہو جائے تو اس کی شدت روز اول سے اتنی ہی ہوتی ہے' جتنی روز آخر۔ ہاں! کبھی کبھار مختلف جگہوں سے پردہ ہٹ جانے پر اس کا روئے جمال عیاں ہو جاتا ہے۔ دھیان رکھنا کہ یہ اس طرح عیاں نہ ہو کہ محبت کا فخر اور مان باقی نہ رہے۔" وہ نکالے گئے میگزین کے ورق کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔

ہمدان نے اسے باریک باریک ٹکڑے کرتے اور پھر رومال میں لپیٹ کر جیب میں ڈالتے دیکھا اور ڈریسنگ کے سامنے جا کر برش کرنے لگا۔

"تم نے شامامی سے بات کی سمیرا کے متعلق؟"

"میں شادی کے بعد کروں گا۔"

"وش یو گڈ لک!" اب ایبک مسکرا رہا تھا۔

"یعنی عادل کے بعد تمہارے سہرے کے پھول کھلنے والے ہیں۔"

"وہ پڑھ رہی ہے ابھی۔" ہمدان نے کچھ اس لہجے میں کہا کہ ایبک بے اختیار ہنس دیا۔

"شو مت..... پہلے تو تمہاری باری آنے والی ہے۔"

"اچھا! نئی خبر ہے۔" ایبک مسکرا رہا تھا۔

"اچھا! یہ بتاؤ۔ تمہیں رابیل کیسی لگتی ہے؟"

برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر ہمدان اس کی طرف مڑا۔

"کیا مطلب کیسی لگتی ہے؟" ایبک چونکا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اسے پسند کرتے ہو۔"

"ان معنوں میں نہیں جن میں تم کہہ رہے ہو۔" ایبک سنجیدہ ہو گیا۔

"وہ میرے لیے صرف احسان ماموں کی بیٹی ہے۔"

"اچھا..... اپنے اندازے پر ہمدان کو حیرت ہوئی۔

"پتا نہیں' مجھے ایک دو بار لگا کہ شاید تم....."

"تمہیں غلط لگا تھا۔" ایبک نے فوراً" اس کی بات کاٹی۔

"کل مرتضیٰ انکل عثمان انکل سے کہہ رہے تھے کہ اگر ایبک اور رابیل کا رشتہ ہو جائے تو شاید مومی انکل اور شانی انکل میں جو ناراضی چل رہی ہے' وہ ختم ہو جائے۔" ہمدان اصل حقیقت سے بے خبر تھا اور مرتضیٰ شاہ اور احسان شاہ بھی۔

"یہ ناراضی ایسے ختم نہیں ہو سکتی ہمدان۔" ایبک کھڑا ہو گیا۔ "لیکن یہ ناراضی ختم ہو جائے گی ضرور مجھے یقین ہے۔"

ہمدان نے اس کی بات سمجھے بغیر سر ہلایا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

ان کی واپسی کافی دیر سے ہوئی تھی۔ وہ پہلے ملک ہاؤس گئے تھے۔ مرتضیٰ شاہ' عثمان شاہ اور مصطفیٰ شاہ بھی عبدالرحمٰن شاہ اور فلک شاہ کے ساتھ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ کھانا تقریباً" وہ کھا چکے تھے۔ عمارہ شاہ انہیں آتے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"آجاؤ بھئی! میں نوازش سے کہتی ہوں' گرم گرم نان لے آئے۔"

"نہیں پھپھو! ہم کھانا کھا کر آئے ہیں۔" ہمدان شاہ نے بتایا۔

"کیا کھا لیا بھائی؟" مرتضیٰ شاہ نے پوچھا۔

"ایک دوست مل گیا تھا' وہ زبردستی کے ایف سی لے گیا تھا۔"

"قہوہ تو پیو گے نا؟"
"ضرور۔۔۔" وہ دونوں لاؤنج میں آ گئے۔
نوازش نے قہوہ پیش کیا تو قہوہ پی کر سب ہی اٹھ گئے۔
"مصطفیٰ۔۔۔! عبدالرحمٰن شاہ نے انہیں آواز دی تو وہ لاؤنج سے نکلتے نکلتے رک گئے جبکہ مرتضیٰ شاہ اور عثمان شاہ باہر نکل گئے۔
"جی بابا جان!" وہ ان کے قریب آئے۔
"شانی کیسا ہے؟"
"الحمدللہ ٹھیک ہے بابا جان۔ آج وہ چیک اپ کے لیے بھی گیا تھا ڈاکٹر کی طرف۔ کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔"
"اللہ کا شکر ہے۔ آج دوپہر آنکھ لگی تو خواب میں اسے بیمار دیکھا۔ تب سے دل پریشان ہے۔"
"دوپہر میں آپ یاد کر رہے تھے نا اسے۔ اس لیے خواب میں دیکھا۔" مصطفیٰ شاہ مسکرائے۔
"وہ اتنا ظالم تو نہیں تھا مصطفیٰ! پھر ایسا کیوں ہو گیا ہے؟"
مصطفیٰ شاہ کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔
"ٹھیک ہے بابا جان! اب میں چلتا ہوں۔ بہت تھکن ہو رہی ہے۔" انہوں نے مڑ کر ہمدان کی طرف دیکھا۔
"ہمدان بیٹا! ذرا مجھے کمرے تک تو چھوڑ آؤ۔"
ہمدان عبدالرحمٰن شاہ کے ساتھ لاؤنج سے نکل گیا تھا۔ اب وہاں صرف فلک شاہ اور ایبک تھے۔ ایبک نے بغور فلک شاہ کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔
"کیا سوچ رہے ہیں بابا؟" ایبک نے پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔
"کچھ نہیں۔۔۔ تم آج ادھر ہی رک رہے ہو نا؟"
"جی بابا! رات ہمدان کے کمرے میں ہی سوؤں گا۔"
"ٹھیک ہے! انجی ادھر ہی ہے "الریان" میں۔ تم جاؤ تو خود چھوڑ کر ادھر جانا۔ میں نے اس سے کہا تھا، اکیلے مت آئے۔ اتنا بڑا لان ہے "الریان" کا۔ پتا نہیں کیوں وہم ستاتے ہیں۔ عجیب سا خوف دل کے اندر بیٹھ گیا ہے۔ اگلے اتوار کو بارات ہے نا۔ ولیمہ کے دوسرے دن کے لیے سیٹیں بک کروا لینا۔"
"جی بابا!" ایبک نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کی وہیل چیئر کی پشت پر آ کر تھوڑا سا ان کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔
"پتا ہے بابا! آج جب میں آپ کو بتا رہا تھا۔ رابیل مجھے پسند نہیں کرتی تو اس نے سن لیا تھا۔۔۔ اور۔۔۔"
"کیا؟" فلک شاہ نے تیزی سے رخ اس کی طرف موڑا "کیا تمہیں رابیل نے بتایا کب؟"
اور ایبک سے ساری تفصیل سن کر فلک شاہ ازحد پریشان ہو گئے تھے۔
"کیا مائرہ اب رابیل کے ذریعے کوئی گیم کھیلنا چاہتی ہے؟ کیا وہ ایبک۔۔۔؟" انہیں اس کی دھمکی یاد آئی۔
"نہیں۔۔۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "وہ اپنی بیٹی کو کم از کم اس گیم کا حصہ نہیں بنا سکتی۔"
انہوں نے خود کو یقین دلایا۔ لیکن وہ بے حد مضطرب سے ہو گئے۔
"آپ! تم ادھر ہی سو جاؤ بیٹا۔"
"بابا جان! میں نے ہمدان سے وعدہ کیا تھا لیکن۔۔۔" اس نے ان کے اضطراب اور بے چینی کو دیکھا۔
"میں ادھر ہی رک جاتا ہوں۔ مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ہمدان کو بتا دیتا ہوں۔"
ان کے اضطراب میں ذرا سی کمی ہوئی تھی۔
"ٹھیک ہے۔ تم جا کر انجی کو لے آؤ۔"
وہ لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ ملک ہاؤس کے لان سے گزر کر وہ دروازہ کھول کر "الریان" کے لان میں آیا تھا۔ لان میں روشنی تھی۔ سامنے برآمدے میں اور پورچ میں لائٹیں جل رہی تھیں اور اس روشنی میں

اس نے دیکھا لان میں کوئی ٹہل رہا تھا۔
"اس وقت؟ اتنی رات گئے؟"
وہ چونکا اور چند قدم چلنے کے بعد اس نے پہچان لیا۔ وہ رابیل تھی۔
"رابیل! آپ اس وقت یہاں؟"
رابیل نے اس کی طرف دیکھا۔ ایبک کو لگا۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں نمی تھی۔
"کیا ہوا رابی؟" وہ ایک دم گھبرا گیا۔
"احسان انکل تو ٹھیک ہیں نا۔"
اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔
"میں۔۔۔ میرا دل ایک دم گھبرانے لگا تھا اندر تو میں تازہ ہوا کے لیے باہر آ گئی۔"
"اوہ!" ایبک نے اطمینان کا سانس لیا۔
"لیکن اس وقت یہاں ٹہلنا مناسب نہیں ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے بھی نہیں۔ آپ ٹیرس پر چلی جائیں۔"
وہ مسکرایا تو رابیل کی نظریں ایک لمحہ کو اس کے چہرے پر ٹھہر گئی تھیں۔
"آپ چلیں۔ میں آتی ہوں۔"
"اوکے۔۔۔!" وہ لان سے نکل کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ رابیل وہیں کھڑی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل بھرا رہا تھا۔ آنسو اندر کہیں حلق کو نمکین کرتے جا رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ سب کھانے کے بعد حفصہ کے کمرے میں اکٹھے ہوئے تھے۔ منیبہ کے ہونے والے سسرال اور منگیتر پر تبصرے کیے جا رہے تھے۔
"منی! تمہارا منگیتر تصویر میں کچھ موٹا لگ رہا ہے۔" حفصہ نے تبصرہ کیا۔
"ابھی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی۔" منیبہ نے برا مانا تھا۔
"ہو جائے گی۔" حفصہ نے لاپروائی سے کہا۔
"بس! تم ایسا کرنا۔ اسے منگنی سے پہلے کوئی جم جوائن کرنے کا مشورہ دے دو۔ پھر جوڑی پرفیکٹ ہو گی۔"
"اور مرینہ اور زبیر کی جوڑی تو ٹھیک ہے۔ بس ذرا زبیر کو چاہیے کہ ایک عینکوں کی دکان کھول لے۔ کیونکہ جس تیزی سے مرینہ کی عینکیں ٹوٹتی ہیں اس حساب سے ذاتی دکان کا ہونا ضروری ہے۔" یہ منیبہ تھی۔
مرینہ نے کچھ اس انداز میں منیبہ کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "بروٹس تم بھی۔"
مرینہ اور سمیرا کو وہ زبردستی کھینچ لائی تھیں۔ انجی ہنس رہی تھی۔ یہ نوک جھونک اسے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ ان سارے پیارے رشتوں سے کتنا عرصہ محروم رہی تھی۔ ابھی بھی وہ ان سب سے اتنی بے تکلف نہیں ہو سکی تھی، جتنی وہ سب تھیں۔
"اور کیا آپی بھائی کی جوڑی بھی پرفیکٹ ہے انجی آپا؟ آپ نے ان کو دیکھا ہے؟" عاشی نے انجی کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
"کن کو؟" انجی چونکی۔
"وہی جن سے ایبک بھائی کی شادی ہو گی اور جن کے لیے آپی بھائی نے گفٹ لیا ہے۔ پنک اور فیروزی ڈریس۔ میں نے دیکھا تھا آپ کے بیڈ پر پڑا۔"
"ہاں!" بے دھیانی میں انجی کے لبوں سے نکلا تھا اور وہ کچھ حیران سی عاشی کو دیکھنے لگی۔
"سچ؟ کیسی ہیں وہ؟"
عاشی اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ باقی سب لڑکیاں بھی انجی کو دیکھ رہی تھیں اور رابیل کے اندر دل میں کسی گہرے زیاں نے چٹکی بھری تھی۔
کون ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟" مرینہ اور منیبہ ایک ساتھ بولی تھیں۔
"نہیں تو۔۔۔ میرا مطلب ہے میں نے نہیں دیکھا۔" انجی سٹپٹا گئی۔ "ایبک بھائی کا ارادہ فی الحال دو سال تک شادی کرنے کا نہیں ہے۔"
"جھوٹ؟" عاشی دل میں آئی بات فوراً کہہ دیتی تھی۔
"آپ کو پتا ہے وہ کون ہے۔ لیکن آپ بتانا نہیں چاہتیں۔" عاشی خطرناک حد تک ذہین تھی۔

"ارے نہیں۔ بھلا کیوں بتانا نہیں چاہوں گی؟" انجی نے اس کے گال پر چٹکی لی۔

"پتا نہیں۔۔۔" عاشی نے کندھے اچکائے اور رابیل ایک دم ہی اٹھ کر باہر چلی آئی تھی۔ کوئی احساس زیاں تھا' جو دل میں چٹکی بھرتا تھا اور آنسو تھے' جو اندر گرتے تھے۔

"کیوں بھلا کس لیے؟" اس نے لان میں بچھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے گہرے گہرے سانس لیے۔

دل بے حد گھبرا رہا تھا اور رونے کو چاہ رہا تھا۔

"کیا میں ایبک سے؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کی تھی۔ لیکن دل نے چپکے سے اعتراف کیا تھا۔

"ہاں رابیل احسان شاہ! تم ایبک فلک شاہ سے محبت کرنے لگی ہو۔ وہی ایبک فلک شاہ جس کا تم مذاق اڑاتی تھیں۔ جب منیبہ شاہ اس کی وکالت کرتی تھی اور عمر احسان شاہ عقیدت میں ڈوبا اس کی تعریف کرتا تھا۔"

کب ایسا ہوا تھا کہ ایبک فلک شاہ نے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی' وہ اندازہ نہیں کرپا رہی تھی۔ لیکن بہت سارے دنوں سے وہ اسے سوچنے لگی تھی۔

"اور اس کا انجام کیا ہوگا رابیل احسان شاہ۔۔۔ کیا کبھی وہ جان پائے گا کہ میں رابیل احسان شاہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہوں۔۔۔ اور اگر جان بھی لیا تو کیا۔۔۔ شاید وہ کسی کو پسند کرچکا ہے۔۔۔ وہ یا پھپھو اور انجی۔۔۔ اور عاشی کہہ رہی تھی' انجی ابھی بتانا نہیں چاہ رہی۔۔۔"

وہ جو کوئی بھی تھی۔ کم از کم الریان سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اور "الریان" میں تھا ہی کون اب سوائے اس کے۔

آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے نکل پڑے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی کرسی پر بیٹھی روتی رہی اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ جب ایبک نے اسے اس وقت لان میں ٹہلتے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا تو دل مچل اٹھا تھا۔

"کہہ دو رابیل احسان شاہ! وہ سب جو تمہارے دل میں ہے۔ بتادو اسے کہ کس طرح اس کی محبت نے تمہارے دل پر شب خون مارا ہے۔"

لیکن وہ رابیل احسان شاہ تھی۔ مائرہ حسن نہیں۔ وہ ایبک سے کچھ نہیں کہہ سکی اور ایبک اندر چلا گیا۔

اس نے ہاتھوں کی پشت سے بھیگی پلکیں صاف کیں اور برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر لاؤنج میں آئی۔ حفصہ کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ لیکن وہ حفصہ کے کمرے کی طرف جانے کے بجائے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی اور پھر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ٹیرس کا دروازہ کھول کر ٹیرس پر آ گئی۔ اب ٹیرس پر پڑی پلاسٹک کی چیئر پر بیٹھی رات کے تقریباً" ایک بجے وہ ایبک کے متعلق سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اریب فاطمہ آنکھیں موندے اماں کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ یکایک اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اماں! اسفند بھائی سے کہیں' مجھے کل صبح لاہور چھوڑ آئیں۔"

"دو تین دن اور رک جاتیں اریب! کالج تو تم نے بتایا تھا سنڈے سے شروع ہوگا۔"

"جی اماں! لیکن مجھے حفصہ کی شادی میں بھی تو شرکت کرنا ہے۔ وہ سب بہت ناراض ہوں گے اگر میں شادی میں نہ گئی تو۔۔۔ حفصہ تو مجھ سے بات ہی نہیں کرے گی۔"

"اچھا! میں اسفند سے کہوں گی' وہ تمہیں صبح چھوڑ آئے گا۔"

"اور اگر وہ نہ چھوڑنے گئے تو؟" اس نے پریشانی سے انہیں دیکھا۔

"اچھا تھا نا میں پرسوں چلی جاتی' صبا کے ساتھ۔ آپ نے منع کردیا۔"

"پتا نہیں کیوں' جی ہی نہیں بھرا تھا تجھے دیکھ کر۔" ان کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اماں۔۔۔ جی تو میرا بھی نہیں بھرا تھا اور میں کب جانا چاہتی تھی وہاں اتنی دور۔۔۔ آپ نے خود ہی تو مجھے خود سے دور کیا تھا۔" وہ شکوہ کر بیٹھی۔

"تمہاری تعلیم میں میں اپنے سپنے دیکھتی ہوں اریب۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر بکھر آنے والے بالوں کو محبت سے سمیٹ کر پیچھے کیا۔

"اچھا یہ بتا' وہاں سب تیرے ساتھ اچھے تو ہیں نا؟"

کئی بار کی پوچھی ہوئی بات کو وہ پھر پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں اماں! سب اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ پیار کرتے ہیں۔ بس مائرہ آنٹی ذرا الٹا سیدھا بول جاتی ہیں کبھی کبھی۔"

"کیا۔۔۔ مائرہ کیا کہتی ہے؟" انہوں نے تڑپ کر پوچھا۔

"اماں۔۔۔!" اریب فاطمہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"مائرہ آنٹی آپ کے متعلق بات کرتی ہیں۔" اماں کا رنگ ایک دم زرد ہوا تھا۔

"کیا۔۔۔ کیا بات؟" ان کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

"اماں۔۔۔!" اریب فاطمہ نے وہ سب کچھ کہہ دیا۔ جو جب سے وہ آئی تھی' کہنا چاہ رہی تھی' لیکن حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔

"اماں۔۔۔ مائرہ آنٹی ایسا کیوں کہتی ہیں؟ کیا دشمنی ہے ان کو آپ سے؟"

اماں ساکت سی بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ ابھی تک اریب فاطمہ کے ہاتھ میں تھے۔

"آپ پریشان ہو گئی ہیں اماں! چلیں' کچھ نہ بتائیں۔ مجھے کچھ جاننا بھی نہیں ہے۔ لیکن آپ اس طرح پریشان نہ ہوں۔ مجھے لگتا ہے مائرہ آنٹی کو مروہ ماسی سے چڑ ہے تو میں چونکہ مروہ آنٹی کے حوالے سے "الریان" میں گئی ہوں نا تو اس لیے وہ ایسا کہتی ہیں۔"

"نہیں! یہ بات نہیں ہے اریب۔" انہوں نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑائے۔ "مجھے یہ بات تمہیں بہت پہلے بتادینا چاہیے تھی۔ میں نے سوچا بھی تھا' جب تم لاہور جارہی تھیں۔ لیکن مجھے موقع ہی نہیں ملا۔"

"کیا بات اماں!" اریب فاطمہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم جانتی ہو اریب! میں تمہیں ہمیشہ کہتی تھی کہ تمہیں بہت سارا پڑھنا ہے۔ ڈاکٹر بننا ہے۔ جانتی ہو کیوں۔۔۔ اس لیے کہ میرے ابا مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور میں ڈاکٹر نہیں بن سکی تھی۔ لیکن جب تم پیدا ہوئیں تو میں نے سوچا میں تمہیں ڈاکٹر بناؤں گی۔ حالانکہ مجھے پتا تھا' یہ بہت مشکل ہے۔ میں تو چاہتی تھی عظمت اور اسفند بھی پڑھیں۔ لیکن۔۔۔"

"سوری اماں!" اریب فاطمہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "میں ڈاکٹر نہیں بن سکی۔۔۔ میں کبھی بھی ڈاکٹر نہیں بننا چاہتی تھی۔۔۔ مجھے دوائیوں کی بو اچھی نہیں لگتی تھی۔۔۔ میں تو چاہتی تھی' بس جلدی جلدی تعلیم مکمل کرکے آپ کے پاس آجاؤں۔"

"جانتی ہوں۔" انہوں نے اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

"لیکن اماں! آپ تو ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں۔ پھر آپ کیوں نہیں ڈاکٹر بن سکیں؟"

"ہاں! میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔۔۔ اور یہ میرے ابا کی بھی خواہش تھی۔ وہ گورنمنٹ آفیسر تھے گریڈ سترہ کے اور لاہور میں رہتے تھے۔ لیکن ہم کبھی کبھار کسی غمی' خوشی میں رحیم یار خان آتے تھے۔ رحیم یار خان میں میرے ددھیال' ننھیال دونوں تھے۔ میرے دادا' دادی' تایا' پھوپھیاں سب رحیم یار خان میں ہی رہتے تھے مدتوں سے۔ ابا کی دو بہنیں اور ایک بڑا بھائی تھا۔ اماں اکلوتی تھیں۔ نانا جان کا انتقال ہوچکا تھا' نانی بھی رحیم یار خان میں ہی رہتی تھیں۔ میں نے ایف۔ ایس۔ سی کینیرڈ کالج سے کیا تھا اور ٹاپ کیا تھا۔ مجھے بہت آسانی سے کے۔ ای میں ایڈمیشن مل گیا تھا۔ میرے ایڈمیشن کی خوشی میں ابا نے بہت بڑی دعوت کی تھی۔

رحیم یار خان سے سب ہی آئے تھے اور پہلی بار مجھے پتا لگا تھا کہ تایا جان اور پھوپھیاں خوش نہیں ہیں۔ تایا جان نے ابا سے میری پڑھائی کے متعلق بحث بھی کی تھی۔ لیکن ابا نے کہا۔

"مجھے اپنی بیٹی پر اعتبار ہے اور میں اسے ضرور ڈاکٹر بناؤں گا۔"

لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا اریب! کہ آدمی کے سارے ارادے دھرے رہ جاتے ہیں اور سارے خواب آنکھوں میں ہی مر جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے صرف چھ دن بعد ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک بار پھر وہ سب ہمارے گھر اکٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب چاہتے تھے کہ اماں اور میں ان کے ساتھ رحیم یار خان چل کر رہیں اور یہ گھر فروخت کر دیں۔ ہمارا گھر بہت زیادہ بڑا نہیں تھا، لیکن اپنا تھا۔ اماں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تایا نے سمجھایا۔

"اکیلی عورت کا جوان بچی کے ساتھ تنہا رہنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔" لیکن اماں ابا کی خواہش پوری کرنا چاہتی تھیں۔

"پاس پڑوس میں سب اچھے لوگ ہیں۔ خیال رکھیں گے۔ مجھے یہیں رہنا ہے۔"

"یہ اماں کا فیصلہ تھا۔ نانی ہمارے پاس ہی رہ گئی تھیں۔ باقی سب مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں ہر وقت ابا کو یاد کر کے روتی رہتی تھی۔ اماں نے مجھے حوصلہ دیا۔ سمجھایا کہ مجھے پڑھنا ہے اور ابا کی خواہش پوری کرنا ہے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور سب کچھ بھلا کر پڑھائی میں جت گئی۔"

وہ ہولے ہولے ماضی کے اوراق پلٹ رہی تھیں۔

"مجھے نہیں پتا چلا، وہ کب میرے پیچھے پڑا۔ کب اس نے مجھے دیکھا۔ میں تو اپنے دھیان میں مگن رہتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے روک لیا۔ اس روز میں اپنے اسٹاپ پر اتر کر ادھر ادھر دیکھے بغیر گھر کی طرف جا رہی تھی۔ گلی سنسان تھی اور وہ میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ مجھے اس سے بالکل خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بہت مہذب لگ رہا تھا۔

"مس! ایک منٹ کے لیے میری بات سن لیں پلیز۔"

"کیا بات ہے۔ میرا راستہ چھوڑ دیں۔"

وہ ایک طرف ہوا تھا اور تیز تیز بول رہا تھا۔

"میں بہت دنوں سے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ پہلے آپ مجھے اچھی لگیں۔ پھر مجھے لگا جیسے مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔"

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر سائیڈ سے نکل کر اپنی گلی میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد وہ میرے پیچھے ہی پڑ گیا۔ کوئی امیر زادہ تھا، کسی بڑے زمین دار کا بیٹا۔ میں نے کبھی اس سے بات نہیں کی۔ کبھی اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ مجھے پتا نہیں چلتا تھا کہ اس نے کب، کب اور کہاں، کہاں میرا پیچھا کیا۔ کبھی کبھی مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن میں نے توجہ نہیں دی۔ نہ ہی اس نے پھر کبھی بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس روز وہ پھر گھر کے دروازے تک آ گیا۔ ایک روز کے بعد ابا کی پہلی برسی تھی اور رحیم یار خان سے سب آئے ہوئے تھے۔۔۔ اور جب صبح میں کالج جا رہی تھی تو سب نے ہی ایک بار پھر میری پڑھائی پر اعتراض کیا تھا۔ اماں اور نانی خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی تھیں اور پھر آخر میں اماں نے حتمی بات کی تھی۔

"ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ پڑھے گی اور ڈاکٹر بنے گی۔ میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا۔ آج اس کا پیپر ہے۔ کل چھٹی کر لے گی۔"

تب اماں نہیں جانتی تھیں کہ کل کے بعد ہمیشہ کے لیے میری چھٹی ہو جائے گی۔ اس نے گھر کے بالکل سامنے مجھے روک لیا تھا۔

"سنیں مس۔" میں مڑ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"میں اپنے والدین کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو کل ہی۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ بہت زبردست پرسنالٹی کا مالک تھا۔

"مجھے ابھی پڑھنا ہے۔ میرے ابا کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ ہاں! چار سال بعد آپ اپنے والدین کو بھیج سکتے ہیں۔ لیکن فیصلہ میری امی کریں گی اور اگر آپ ان کے معیار پر پورا نہ اترے تو آئی ایم سوری۔"

وہ ایک دم ہی ہنس پڑا۔

"یعنی میں چار سال بغیر کسی امید کے گزار دوں؟ بہرحال مجھے یقین ہے کہ آپ کی والدہ کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہو گا اور میں اس یقین کے سہارے یہ وقت کاٹ لوں گا۔"

وہ بہت پراعتماد تھا۔ مجھے اس کے اعتماد پر حیرت ہوئی۔ لیکن شاید اسے اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ ضرور اس میں ایسی خوبیاں ہوں گی کہ اسے رد نہیں کیا جا سکتا ہو گا۔ ظاہری خوبیاں تو نظر آتی تھیں، لیکن شاید باطنی خوبیاں بھی ہوں گی۔ تب ہی تو۔

"لیکن آپ بھی وعدہ کریں کہ آپ چار سال سے پہلے کسی اور سے شادی نہیں کریں گی۔ ہاں! اگر آپ کی والدہ نے ریجیکٹ کر دیا تو آپ کو اختیار ہے۔"

"ٹھیک ہے! لیکن آپ بھی میرا پیچھا نہیں کریں گے۔ جیسے ایک سال سے کر رہے ہیں۔"

"پرامس! چار سال تک میں آپ کو دکھائی بھی نہیں دوں گا۔" وہ واپس مڑ گیا۔

میں نے وہاں اپنے گھر کے سامنے گلی میں کھڑے ہو کر اس سے باتیں کی تھیں۔ میں نے اس بات کی پروا تک نہیں کی تھی کہ کوئی مجھے ایک اجنبی سے بات کرتا دیکھ کر کیا سوچے گا۔ میرے من میں کھوٹ نہیں تھا۔ لیکن دوسروں کے من میں تو کھوٹ ہو سکتا ہے نا۔ ہر بندہ اپنی نظر سے دوسروں کو دیکھتا ہے اور اسے ایسا ہی دیکھتا ہے۔ جیسا وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ میں بہت مطمئن سی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا، وہ شخص جیسا کہہ رہا ہے، ویسا ہی کرے گا اور وہ مجھے اب چار سال تک نظر نہیں آئے گا۔ غیر ارادی طور پر میں نے گھر میں قدم رکھنے کے بعد پیچھے مڑ کر کھلے دروازے سے باہر دیکھا تھا۔ تایا گلی میں دروازے کے عین سامنے کھڑے تھے۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ انہوں نے مجھے اس سے بات کرتے دیکھا ہو گا۔ لیکن میرا گمان غلط تھا۔ میرے اندر آتے ہی وہ زور سے دروازے کو پاؤں کی ٹھوکر سے کھولتے ہوئے اندر آئے تھے اور اندر آتے ہی انہوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"کون تھا وہ جس کے ساتھ گلی میں کھڑی ہو کر باتیں کر رہی تھیں؟"

"میں نہیں جانتی، کون تھا۔"

"بکواس کرتی ہے۔" تایا کا تھپڑ میرے رخسار پر پڑا۔

اماں کچن سے باہر آئیں اور گھبرا کر پوچھنے لگیں۔

"کیا ہوا۔۔۔ کیا ہوا؟"

کسی نے میری بات نہیں سنی تھی۔ کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ اماں اور نانی نے بھی نہیں۔

اماں کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا اور میں بھی تو ہوش میں نہیں تھی۔۔۔ اور ابا کی برسی سے اگلے دن میرا نکاح تمہارے ابا سے کر دیا گیا۔ وہ تایا کے سسرالی عزیز تھے۔ پتا نہیں، وہ وہیں تھے یا انہیں بلوایا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ ایک سال پہلے ابا کی زندگی میں تائی نے ان کا رشتہ ڈالا تھا۔ لیکن ابا نے انکار کر دیا تھا۔

اماں بالکل چپ ہو گئی تھیں اور سارے اختیار تایا نے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ انہوں نے گھر فروخت کر دیا اور ہم سب کو لے کر رحیم یار خان آ گئے۔ چند ماہ بعد مجھے رخصت کر دیا گیا۔ اس سارے عرصہ میں نہ تو انہوں نے مجھ سے بات کی۔ نہ میں نے۔ تائی اور پھوپھیوں نے ہی سب تیاری کی۔ چار سالوں میں اماں صرف دو بار چک 151 آئیں، ایک بار اسفند کی پیدائش پر۔ ایک بار میری بیماری پر۔۔۔

عجیب سرپھرا شخص تھا۔ وعدے کے مطابق چار سال تک نہ تو وہ میرے کالج تک آیا۔ نہ میری گلی میں۔۔۔ اور چار سال بعد جب وہ والدین کے ساتھ میرے

گھر گیا تو اسے پتا چلا کہ ہم تو چار سال پہلے ہی گھر چھوڑ کر رحیم یار خان جا چکے ہیں۔
پڑوسیوں سے پتا لے کر وہ اماں کے پاس آیا تھا۔ اس کے والدین اس کے ساتھ تھے۔ اماں سے ساری بات سن کر اس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر میری شرافت کی گواہی دی تھی کہ میری حیا اور پاکیزگی نے ہی تو اسے متاثر کیا تھا۔ اس نے اماں سے کہا۔ وہ اس بات کے لیے ساری زندگی شرمندہ رہے گا اور خود کو معاف نہیں کر سکے گا کہ اس کی وجہ سے ابا کا خواب تعبیر نہیں پا سکا ۔تب اماں چار سال بعد میرے پاس آئی تھیں اور مجھے گلے لگا کر دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں اور مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی ایک اعلا سید خاندان کا تھا اور اس کے والدین بڑے اعلا ظرف اور شفیق تھے۔ وہ اس قصور کی معافی مانگ رہے تھے جو انہوں نے کیا ہی نہیں تھا۔
تایا بھی شرمندہ تھے۔ لیکن اب کیا فائدہ تھا۔ میرا خواب تو مٹی میں مل گیا تھا نا۔"
اماں نے گاؤں سے واپس جا کر دادا جان کا گھر چھوڑ دیا تھا اور نانی کے پاس چلی گئی تھیں۔
"اماں!" اریب فاطمہ ان سے لپٹ کر رونے لگی۔
"جب سب ظاہر ہو گیا تھا تو پھر۔ پھر مائرہ آنٹی ایسا کیوں کہتی ہیں۔ انہیں نہیں کہنا چاہیے یہ سب۔ وہ جانتی تو ہوں گی نا سب؟ ان کو اگر یہ بتایا گیا تھا تو پھر وہ بھی بتایا گیا ہو گا۔"
"ہاں! مائرہ کی امی اماں کی کزن ہیں اور سب جانتی ہیں وہ۔"
انہوں نے اسے تھپکا اور پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔
"لڑکیوں کو بہت محتاط ہو کر بہت پھونک پھونک کر زندگی گزارنا چاہیے۔"
"جی اماں! میں بہت محتاط رہتی ہوں۔"
"مائرہ کو اس کا موقع مت دو کہ وہ پھر کوئی بات کرے۔" اریب نے سر ہلایا تھا اور ہاتھوں کی پشت سے اپنے گیلے رخسار پونچھے۔
اس نے سوچا وہ اماں کو ایبک کے متعلق بتائے۔

ایبک بھی تو اس شخص کی طرح اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ والدین کو اس کے گھر بھیجنا چاہتا تھا اور اس نے بھی اماں کی طرح اسے انتظار کرنے کو کہا تھا۔ کہیں اماں کی طرح اس کا انتظار بھی لاحاصل نہ رہ جائے۔
اس نے جھرجھری سی لی۔
"نہیں... اماں کو تو شاید اس سے محبت نہیں تھی۔ لیکن وہ تو اس سے محبت کرتی تھی۔"
اس کا دل خوش گوار انداز میں دھڑکا۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا۔
"کیا نام تھا ان کا؟"
"پتا نہیں... نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ اماں نے بھی پھر کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ کون تھا کہاں کا رہنے والا تھا۔ بس اتنا بتایا تھا کہ تایا اس کے خاندان کو تھوڑا بہت جانتے تھے۔"
"اماں! کیا آپ کو کبھی وہ یاد آئے؟"
پتا نہیں کس خیال کے تحت اس نے پوچھا۔ لیکن اماں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ بس ایک نظر اس پر ڈال کر نگاہیں جھکائی تھیں۔ تب ہی شہریار اندر آیا۔
"اماں... اماں! وہ آئے ہیں۔" وہ کچھ بوکھلایا ہوا تھا۔
"کیا ہوا شیری؟" وہ گھبرا گئیں۔
"اماں! اسفند بھائی کے ساتھ وہ آئے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز۔ بیٹھک میں بٹھایا ہے بھائی نے انہیں اور کہہ رہے ہیں کہ چائے بھیج دیں اور آپ کو بھی بلایا ہے۔"
"مجھے کس لیے؟" وہ حیران ہوئیں۔
"آپ سے ہی تو ملنے آئے ہیں وہ اور ساتھ اتنا کچھ سامان لائے ہیں... پتا نہیں کیا کیا۔"
شہریار بتا کر باہر بھاگ گیا تو اماں نے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔
"تیرے بھائی اور ابا بہت تعریف کرتے ہیں شیخ صاحب کی۔"
"ہاں! زینب آپا بھی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ بتا

رہی تھیں کہ وہ یہاں کی عورتوں کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں۔" اریب فاطمہ نے بھی تائید کی۔
اماں اٹھ کر باہر چلی گئیں تو اریب فاطمہ ایبک کے متعلق سوچنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اماں کو ایبک کے متعلق بتائے یا نہ بتائے۔
"اگلی بار سہی۔ پھر جب آؤں گی تو اماں کو ضرور بتا دوں گی۔"
وہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی تو اٹھ کر بیگ میں اپنا سامان رکھنے لگی۔
کتابیں اور کپڑے بیگ میں رکھ کر اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور چیک کیا۔ چیک کرتے ہوئے ایبک کا کارڈ نظر آیا تو اس کا جی چاہا وہ آج پھر ایبک سے بات کرے۔ اس روز کے بعد اس نے ایبک سے بات نہیں کی تھی۔ "چلو! شام کو زینب آپا سے ملنے جاؤں گی تو بات کر لوں گی۔" اس نے ہینڈ بیگ کی زپ بند کی اور چارپائی پر پڑی شہریار کی پریکٹیکل کی کاپیاں دیکھنے لگی۔ اس کی ڈرائنگ اچھی تھی اور شہریار نے اسے ڈایاگرام بنانے کے لیے کہا تھا۔ شہریار پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور اماں کا خواب پورا کرے گا۔
اس نے بیالوجی کی کاپی کھولی۔ کل اسے چلے جانا تھا تو اسے آج ہی یہ کاپیاں مکمل کر دینا چاہئیں۔
وہ بے حد مصروف تھی جب اماں اسفندیار کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی اندر آئی تھیں۔
"یہ سب بہت زیادہ ہے اسفندیار! تمہیں منع کرنا چاہیے تھا۔" وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھیں۔
"مجھے کیا پتا تھا اماں! وہ اتنا کچھ لے کر آرہے ہیں۔" اسفندیار دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔
اریب نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
"دو ٹوکرے فروٹ کے۔ مٹھائی کا یہ بڑا ڈبا اور سب کے لیے تحفے۔ سچ میں میرا تو دل گھبرا گیا اتنا کچھ دیکھ کر۔"
انہوں نے تفصیل بتائی تو اسفندیار مسکرایا۔
"اماں! وہ تو ایسے ہی ہیں۔ بڑے دل والے ہیں۔

دیکھا نہیں انہوں نے بھائی کو گاڑی دی؟ اتنا بڑا دل ہے ان کا۔"
"لیکن عظمت تو کہہ رہا تھا کام کے لیے دی ہے۔"
اماں حیران ہوئیں۔
"ہاں۔" اسفند سٹپٹایا۔
"دی تو کام کے لیے ہی ہے، لیکن دی تو ہے نا۔ ہر وقت بھائی کے پاس ہی رہتی ہے۔"
"لیکن اس طرح تو ہم زیر بار ہو جائیں گے۔ ایسا کرو ان کے گفٹ تو واپس کر دو۔"
"ارے! ایسے کیسے واپس کروں اماں! وہ ناراض ہو جائیں گے۔ یہ عرب شیخ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اللہ جانے کیا لائے ہیں۔ میں لے کے آتا ہوں۔"
اسفند وہاں سے واپس مڑ گیا۔ اماں الجھی الجھی نظروں سے خالی دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔
"پتا نہیں کیوں، میرا دل پریشان ہو گیا ہے اریب۔ بلاوجہ ہی اتنا التفات اور محبت۔"
"اماں! پریشان نہ ہوں۔ اسفند صحیح کہتا ہے۔ اس طرح اب گفٹ واپس کرنے پر وہ برا مان جائیں گے۔ آپ ایسا کریں ایک دو روز تک اسفند کے ساتھ ان کی فیملی سے ملنے چلی جائیں اور اتنی ہی قیمت کے گفٹ لے جائیں اور رہی گاڑی کی بات تو جب بھائی کا کام ختم ہو گا تو گاڑی تو واپس دینی ہی ہو گی۔ ویسے وہ کام کیا کرتے ہیں؟"
"پتا نہیں۔" اماں کو صرف اتنا پتا تھا کہ اسفند اور عظمت شیخ عبدالعزیز کے لیے کام کرنے لگے ہیں جس کی انہیں تنخواہ ملے گی اور زمینوں کی دیکھ بھال کے کام میں بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔
تب ہی اسفند تحفوں کے شاپرز اٹھائے آگیا اور دوسری چارپائی پر بیٹھ کر کھولنے لگا۔ اماں کے لیے قیمتی چکن کا سوٹ ابا کے لیے گھڑی۔ غرض سب کے لیے کچھ نہ کچھ تھا۔
اماں پُرسوچ نظروں سے اسفند کو شاپرز میں سے پیکٹ نکالتے اور کھولتے دیکھ رہی تھیں۔
"اسفند بیٹا! کل صبح اریب کو لاہور چھوڑ آنا۔"

"لیکن کل تو شیخ صاحب نے دعوت پہ بلایا ہے، ہم سب کو۔"

"کیسی دعوت؟" اماں نے حیرت سے پوچھا۔

"پتا نہیں، لیکن انہوں نے ہم سب کو بلایا ہے۔ بہت تاکید کی ہے کہ سب آئیں۔۔۔ اریب بھی۔"

"اریب کو تو کل ہر صورت لاہور جانا ہے۔"

"اماں! آپ بھی خوامخواہ اس کی پڑھائی کے پیچھے پڑی ہیں۔ کیا کرنا ہے اس نے پڑھ کر؟ آخر تو شادی کے بعد ہانڈی روٹی ہی تو کرنا ہے نا اسے۔"

"تم سے میں نے مشورہ نہیں مانگا اسفندیار۔ تمہیں دعوت میں جانا ہے، جاؤ۔ میں عظمت یا تمہارے ابا سے کہتی ہوں، وہ چھوڑ آئیں گے اسے۔"

اماں اس کی پڑھائی کے معاملے میں ہمیشہ بہادر بن جاتی تھیں۔

"اماں۔۔۔!" اسفند نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"اماں! آپ پتا نہیں کیوں، ہمیشہ اس کی پڑھائی کو مسئلہ بنا لیتی ہیں۔ آپ کو اس کی شادی کرنا ہے آخر۔۔۔ شادی سے پہلے یہ اگر یہاں آجائے اور وہاں سینٹر میں نگرانی کا کام کرلے تو اس میں کیا حرج ہے؟ بیس پچیس ہزار سے کم تنخواہ تو نہیں دیں گے شیخ صاحب۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم بیٹی کی کمائی کھائیں؟"

"میں یہ کب کہہ رہا ہوں اماں۔ اس کے اپنے پیسے ہوں گے۔ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرواتی رہے گی۔ ہم ایک دھیلا بھی نہیں لیں گے اس سے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ اپنا کام کرو۔" اماں نے اس کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

"عظمت بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ بہت پڑھ لیا ہے اریب فاطمہ نے۔۔۔ اب مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اسفند کھڑا ہو گیا۔

اماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"یہ نہیں جائے گی لاہور اب۔" اسفند نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا تو اماں نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ تجھے اٹھا کر لے جاؤ اسفندیار! لگتا ہے تمہارا شیخ رشوت لے کر آیا تھا کہ بہن کو نوکری دلوا دو اس کے سینٹر میں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں اماں! انہوں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔ یہ تو میں خود کہہ رہا ہوں۔ زینب آپا بھی تو وہاں کام کر رہی ہیں۔۔۔ اور لڑکیاں بھی ہیں۔"

"تو یوں کہہ۔ تیرے اندر کا لالچ ہے یہ۔"

"اماں! آپ بھی نا بس۔۔۔ لیکن ایک بات سن لیں۔ ابا اور عظمت بھی اس کی مزید پڑھائی کے حق میں نہیں ہیں۔ یہ نہ آتی تو وہ خود جا کر لے آتے۔"

وہ زور سے دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اریب فاطمہ پریشان سی بیٹھی تھی۔ اماں نے اس کی طرف دیکھا۔

"پریشان نہ ہو بیٹی! اپنی تیاری کر لے اور ہاں! تجھے حفصہ کو کچھ گفٹ بھی تو دینا ہو گا۔ کیا دے گی؟"

"وہاں جا کر کچھ لے لوں گی۔ پیسے ہیں میرے اکاؤنٹ میں۔ مروہ ماہی نے کافی سارے بھیجے تھے۔ میں نے ایک بار بھی نہیں نکلوائے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں نے تمہارے لیے ایک بیڈ شیٹ سیٹ تیار کیا تھا۔ وہ بھی دے دینا۔"

وہ اٹھیں اور انہوں نے الماری کھول کر پیک شدہ بیڈ شیٹ نکالیں۔

"یہ دیکھو! یہ میں نے خود کڑھائی کی تھی۔ تمہارے لیے اور بنا لوں گی۔"

"اماں! یہ بہت خوب صورت ہیں، لیکن عظمت اور اسفند بھائی نے مجھے جانے نہ دیا تو؟"

اریب فاطمہ کو ان کے اطمینان پر حیرت ہو رہی تھی۔

"تم فکر مت کرو۔ ہاں! یہ بتاؤ، تمہارا امتحان کب تک ہے؟"

"چھ سات ماہ تو ہیں ابھی۔"

"ٹھیک ہے! تم اب چھ سات ماہ مت آنا اور میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑی بہت کمزوری تو عمر کے ساتھ ہو جاتی ہے نا۔ تم بی اے

کر لو تو پھر سوچوں گی، کیا کرنا ہے۔ ممکن ہوا تو تمہیں کہیں ہاسٹل میں داخل کروا دوں گی۔ کہیں نزدیک یا پھر پرائیویٹ ایم اے کر لینا کسی آسان مضمون میں۔"

وہ ساتھ ساتھ بیڈ شیٹ کی پیکنگ دوبارہ سے کر رہی تھیں۔

"میں نہیں چاہتی کہ تم "الریان" میں زیادہ رہو۔ ہائنہ نے تم سے جو کچھ کہا ہے۔ وہ پھر بھی کہہ سکتی ہے۔ کسی نے سن لیا تو کیا سمجھیں گے۔ یہ سات آٹھ ماہ جو تمہیں رہنا ہے۔ بہت محتاط ہو کر رہنا ہے۔"

"جی اماں! لیکن باقی سب تو بہت اچھے ہیں۔ خیال رکھنے والے محبت کرنے والے۔"

"جانتی ہوں مروہ بھابی کے خاندان کے لوگ یقیناً ایسے ہی ہوں گے۔۔۔ مروہ جیسے اعلا ظرف، بڑے دل کے، میری طرف سے بہت دعائیں کہنا حفصہ اور عادل کو۔ میں نے ان بچوں کو دیکھا نہیں، لیکن تمہاری باتوں سے میں نے انہیں جان لیا ہے۔"

انہوں نے پیک شدہ بیڈ شیٹس اس کی طرف بڑھائیں۔

"یہ اپنے بیگ میں رکھ لو۔" اریب فاطمہ نے بیڈ شیٹس لے کر بیگ میں رکھ لیں اور اماں باہر چلی گئیں۔ اریب فاطمہ نے بیگ کی زپ بند کی اور کچھ دیر یوں ہی بیگ کو دیکھتی رہی۔

"اور اگر ابا، اسفندیار، عظمت یار کسی نے نہ جانے دیا تو۔"

اس نے زپ پھر کھول دی اور بیڈ شیٹس نکال کر انہیں پھر کچھ چیزیں آگے پیچھے کر کے رکھا۔

"۔۔۔ تو پھر کیا وہ کبھی ایبک سے نہیں مل سکے گی اور ایبک اس کی زندگی سے ایسے ہی نکل جائے گا جیسے ابھی شخص اماں کی زندگی سے نکل گیا تھا؟"

زپ بند کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں لرزش تھی۔ دل جیسے نیچے ہی نیچے ڈوبتا جا رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ اماں اس سے صرف دو بار ملی تھیں، چند لمحوں کے لیے۔ اماں اس سے محبت نہیں کرتی تھیں لیکن میں۔۔۔ میں ایبک سے محبت کرتی ہوں۔

میں۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔ اس نے ہاتھوں کی پشت سے بھیگی پلکیں صاف کیں اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

اماں باہر صحن میں بنے چولہے پر مٹی کی ہانڈی میں ساگ پکا رہی تھیں۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی ان کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اماں نے لکڑی کی ڈوئی ہانڈی میں ہلائی اور پھر ہانڈی پر ڈھکن رکھ کر دو لکڑیاں کھینچ کر چولہے سے نکال لیں۔ اور انہیں ایک طرف رکھ کر پانی کا چھینٹا مارا۔ اب ایک لکڑی مدھم مدھم سی جل رہی تھی۔ لکڑی کی مدد سے ہی انہوں نے کچھ جلتے ہوئے انگارے آگے پیچھے کیے اور مڑ کر اسے دیکھا اور اس پر سے ہوتی ہوئی ان کی نظر برآمدے میں پڑے پھلوں کے ٹوکروں پر پڑی۔ برآمدے میں تخت پوش کے پاس دونوں ٹوکرے پڑے تھے اور تخت پوش پر مٹھائی کا ڈبا تھا۔

"خوامخواہ انہیں دیکھ کر گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھیں اور اسفندیار کو آواز دینے لگیں۔ اسفند نے بیٹھک کے دروازے میں سے جھانک کر انہیں دیکھا۔

"کیا ہے اماں؟"

"اٹھواؤ انہیں اور اسٹور میں رکھوا دو۔۔۔ یا جو کرنا ہے کرو۔"

اریبہ چپ کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"فکر کیوں کرتی ہے۔۔۔ میں ہوں نا۔ جا! اندر جا کے آرام کر۔ پیکنگ کر لی ہے نا۔"

"ہاں!" اس نے سر ہلایا۔

"ابا ناراض تو نہیں ہوں گے نا۔ وہ بھائیوں کی بات بہت مانتے ہیں۔"

"تو؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میری بھی مانی ہو گی۔" وہ ذرا سا مسکرائیں۔

"اماں۔۔۔!" اریب نے بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔

اماں نے بے اختیار اسے گلے لگالیا اور جانے کتنی دیر کے رکے آنسو ان کے رخساروں پر پھسل آئے تھے اور برآمدے میں ٹوکرا اٹھاتا اسفندیار انہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

احمد رضا اپنے بیڈ روم میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا اس سی ڈی کو دیکھ رہا تھا' جو رچی نے اسے بھیجی تھی۔ پہلے کسی کوٹھی کا بیرونی منظر تھا۔ آس پاس کافی فاصلے تک کوئی اور عمارت نظر نہیں آرہی تھی۔ کوٹھی کے سیاہ رنگ کے بڑے سے گیٹ کے باہر تین چار مسلح افراد کھڑے تھے' جو غالباً "سیکورٹی گارڈز" تھے۔ پھر منظر بدلا۔ اب گھر کے اندر کا منظر تھا۔ ایک بڑے ہال نما کمرے میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ کچھ کھڑے تھے۔ کچھ بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک کرسی پر کوئی شخص بیٹھا تھا۔ لوگ باری باری اس کے ہاتھ چوم رہے تھے۔ احمد رضا نے محسوس کیا کہ لوگوں میں بہت بے چینی پائی جاتی تھی۔ جیسے ہر شخص پہلے یہ سعادت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ کیمرے نے کرسی پر بیٹھے شخص کا کلوزاپ دکھایا۔ وہ یقیناً "طیب خان" تھا۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں تھا اور لوگ پروانوں کی طرح اس پر نثار ہو رہے تھے۔ ہال میں جھنجلاہٹ تھی۔ لوگ کچھ کہہ رہے تھے۔

احمد رضا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان کے چہروں کے تاثرات سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ پھر طیب خان نے دایاں ہاتھ ذرا سا بلند کیا۔ پورے ہال میں خاموشی چھاگئی تھی۔

منظر پھر بدلا اور ایک بار پھر کوٹھی کا بیرونی منظر تھا۔ لیکن اب فرق یہ تھا کہ کوٹھی کے باہر سینکڑوں کی تعداد میں لوگ کھڑے نعرے لگا رہے تھے۔ وہ حیران سا دیکھ رہا تھا' جب پاس پڑے فون کی بیل ہوئی تھی۔ دوسری طرف رچی تھا۔

"تم نے دیکھا؟"

"ہاں...!" احمد رضا نے دھیرے سے کہا۔

"یہ لوگ طیب خان کے عقیدت مند ہیں اور ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں' ہزاروں میں ہے۔"

"لیکن ابھی چند دن پہلے وہاں چک نمبر 151 میں جو کلپس تم نے مجھے دکھائے تھے وہ... ان میں تو طیب خان کسی کوٹھی کے گیراج میں..."

"ہاں! ابتدا وہیں سے ہوئی تھی۔" رچی نے اس کی بات کاٹی۔

"اور وہ کلپس تقریباً" ڈیڑھ سال پرانے تھے۔"

احمد رضا کو لگا جیسے رچی دوسری طرف مسکرا رہا ہو۔

احمد رضا کو وہ کلپس یاد آئے۔ ان میں طیب خان کے چہرے پر کتنی عاجزی اور انکساری تھی اور وہ اتنی عاجزی اور انکساری سے ہی فرش پر بیٹھا تھا' لیکن اس طیب خان کے چہرے پر رعونت اور تکبر تھا۔ گو ماتھے پر محراب تھا اور ہاتھوں میں تسبیح۔ بظاہر وہ عاجزی سے بات کرتا نظر آرہا تھا۔ کمپیوٹر کی اسکرین پر اس کوٹھی کے مختلف مناظر نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک بیڈ روم میں کارپٹ پر ایک عورت کو بھی بیٹھے دیکھا۔ وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے طیب خان کے جوتوں کے تسمے کھول رہی تھی۔

سی ڈی ایک دم ختم ہوگئی تھی۔

"کمپیوٹر آف کرو احمد رضا! اور دھیان سے میری بات سنو۔"

احمد رضا کو لگا جیسے وہ اتنی دور بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کمپیوٹر آف کردیا۔

"سنو... اپنے آرٹیکل میں جو چند جملے تم نے طیب خان کے متعلق لکھے ہیں' وہ اسکرپٹ میں نہیں تھے۔ آئندہ ایسی کوئی بات لکھنے سے پرہیز کرنا اور وہی لکھنا' جو پوائنٹ تمہیں بتائے جائیں۔ ادھر ادھر ایک لفظ بھی نہیں۔ ورنہ اس کے دیوانے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ طیب خان چاہے تو انہیں خودکش جیکٹ پہنا کر خودکش حملہ کرنے کے لیے کہہ دے۔ چاہے تو انہیں اپنے ہی ہاتھوں سے گلا کاٹنے کا کہہ

دے اور وہ یہ سب کر گزریں گے۔ اتنے ہی شیدائی ہیں اس کے۔"

"لوگ کس قدر پاگل اور بے وقوف ہیں۔" اس نے سوچا۔

"طیب خان بھلا ہے ہی کیا... جہاد افغانستان میں شرکت کی جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر وہ لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا تھا' جب وہ اسماعیل خان کے پاس آتا تھا تو ایک بار ابو بتا کے منہ سے نکل گیا تھا۔ "یہ افغانستان میں تھا تو۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ یہ جہاد میں بھی شامل تھا یا نہیں۔"

"تم لوگ ایسے ہی کمزور عقیدے کے ہو احمد رضا!" رچی دوسری طرف ہنسا تھا۔

"ایسا نہیں ہے۔" احمد رضا نے کمزور سا احتجاج کیا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا احتجاج فضول ہے۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے اتنے پڑھے لکھے لوگوں کو اسماعیل کے سامنے گھٹنے ٹیکتے اور (نعوذ باللہ) اسے اللہ کا ایک معتبر اور مقرب بندہ سمجھتے اور مانتے دیکھا تھا۔ خود وہ بھی تو یہ ہی سمجھنے لگا تھا کہ اسماعیل کو اللہ سے خاص قرب حاصل ہے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ وحی الٰہی کا سلسلہ ختم ہوچکا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آخری نبی ہیں۔

"ایسا ہی ہے میری جان!" رچی کا قہقہہ بلند ہوا۔ "میں کسی روز دکھاؤں گا تمہیں' تمہارے ایمان کی کمزوری کے مناظر۔ اس وقت میری بات سمجھ لو۔ تمہارے اگلے پروگرام کے مہمانوں کی لسٹ تمہیں مل گئی ہے؟"

"ہاں...!"

"ان میں "طیب خان" کا نام بھی ہے نا؟"

"تم جانتے ہو رچی! پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ جھنجلایا۔

"کنفرم کر رہا تھا۔ جو سوال تمہیں کرنے ہیں۔ وہ تمہیں مل جائیں گے۔ ان سوالوں کے علاوہ کوئی اور سوال نہیں... سمجھے۔" رچی کے لہجے میں سفاکی در آئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" احمد رضا نے ایک گہری سانس لی۔

"کیا طیب خان بھی ایک دن نبوت..."

"آہاہا!" رچی پھر ہنسا۔

"یہ سوال تم پہلے بھی کرچکے ہو؟"

"ہاں! شاید۔" احمد رضا نے آہستہ سے کہا۔

"تو... میری جان! ایسا نہیں ہے۔ تب ہم غلط تھے۔ اب ہم صحیح ٹریک پر چل رہے ہیں۔"

رچی پچھلے کئی دنوں سے بہت کھل کر باتیں کر رہا تھا۔ جیسے وہ چاہتا ہو کہ احمد رضا جان لے کہ وہ کون ہے۔

اس نے مزید کوئی بات کیے بغیر فون رکھ دیا تھا۔

رچی در حقیقت کون تھا۔

طیب خان نے اسے ایک بار "لارنس آف عریبیا" کہا تھا... کون تھا لارنس آف عریبیا۔

مسلم امہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والا جس کا اصل نام ٹامس ڈیوڈ لارنس تھا۔

"تو کیا رچی بھی ایسا ہی کچھ کرنا چاہتا ہے؟" آج وہ ایک نئے انداز میں سوچ رہا تھا۔

"اور میں یہ سب کرنے میں رچی کی مدد کر رہا ہوں۔"

اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اس نے اس روز سے لے کر جب وہ ابراہیم کے ساتھ اسماعیل کے پاس گیا تھا۔ آج تک کی ہر بات سوچ لی تھی۔ سینمائی اسکرین کی طرح سارے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"رچی کہتا ہے ہم لوگوں کا ایمان اور عقیدہ کمزور ہے۔ کوئی شعبدہ دیکھ کر متزلزل ہوجاتا ہے ہمارا یقین اور ایمان۔ لیکن میرے جیسے لوگوں کا... ہم میں سینکڑوں' ہزاروں' بلکہ کروڑوں ایسے ہوں گے جن کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوتا' جو دین اور نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حرمت پر مٹ جانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں... اور سینکڑوں لوگ ابو جیسے بھی

ہوتے ہیں۔۔۔ جو نہ ولی ہوتے ہیں اور نہ عالم۔ لیکن ان کو حوصلہ اور صبر ولیوں جیسا ہی عطا ہوتا ہے۔"

کتنے صبر حوصلے اور خاموشی کے ساتھ حسن رضا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو۔۔۔ جس کے لیے اس نے ایک عمر خواب کاشت کیے تھے اور جب ان خوابوں کی فصل تیار ہو کر لہلہانے لگی تو اپنے ہاتھوں سے اس کھیتی کو آگ لگا دی۔ اس نے تصور میں خود کو اپنے باپ کے قدموں میں جھکا ہوا دیکھا۔ اس کے ہاتھ حسن رضا کے پاؤں پر رکھے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا' وہ ان قدموں سے لپٹ جائے۔ وہ آج تک دل ہی دل میں اپنے ابو سے ناراض تھا۔ وہ سمجھتا تھا۔ انہوں نے اس کے ساتھ غلط کیا۔

اتنی سی بات پر کوئی بھلا اپنے اکلوتے بیٹے کو ہاتھ سے پکڑ کر یوں گھر سے نکال دیتا ہے۔

لیکن یہ اتنی سی بات نہیں تھی۔

یہ عشق کی محبت کی بات تھی اور اسے صرف عاشق ہی جان سکتے ہیں۔

حسن رضا نے کبھی عشق کا دعوا نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ عشق ان کے اندر دل کے نہاں خانوں میں موجود تھا اور جب محبوب سے آگے کسی نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو دل تڑپ اٹھا۔

عشق نے صرف محبوب کا جلوہ دکھایا۔

اس جلوے میں نہ بیٹا نظر آیا۔ نہ عمر بھر کے خواب۔ وہ نہ ولی تھا۔ نہ عالم۔ ایک عام آدمی تھا۔ پھر بھی ساری زندگی کے خوابوں کی پونجی گلی میں پھینک کر وہ شخص کتنے اطمینان سے تخت پوش پر خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی سماعتیں بند کرلی تھیں اور آنکھیں میچ لی تھیں۔۔۔ اس نے کتنی آوازیں دی تھیں۔ کتنا پکارا تھا۔

آج تک وہ خود کو مظلوم سمجھتا تھا اور حسن رضا کو ظالم۔ لیکن آج یکایک دل کی کایا کیسے پلٹ گئی تھی کہ وہ تصور ہی تصور میں عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو چومتا آنکھوں سے لگاتا اور قدموں سے لپٹتا تھا۔ کیا یہ سب ابھی ابھی چند لمحوں میں ہوا تھا۔

نہیں۔۔۔ یہ چند لمحوں کی بات نہیں تھی۔ پچھلے چند دنوں سے اندر اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

کہیں کچھ بدل رہا تھا۔۔۔ سوچ۔ احساس۔

وہ بھولا تو کبھی کسی کو نہ تھا۔

نہ سمیرا' نہ امی نہ ابو۔

لیکن وہ خود ترسی میں مبتلا رہتا تھا۔ اسے حسن رضا سے شکایت تھی۔۔۔ اسے ان سے بے حساب گلے تھے۔۔۔ کوئی یوں بھی کرتا ہے۔

کوئی ایسے بھی۔۔۔ یہ جملے اکثر اس کے اندر چکراتے رہتے تھے اور اسے اپنا آپ مظلوم لگتا۔۔۔ وہ ذہین تھا' سمجھ دار تھا۔ لیکن اس نے کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔۔۔

نہ رجی کو۔ نہ الوینا۔۔۔ نہ رباب حیدر نہ طیب خان۔۔۔ لیکن بدلاؤ کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ تب ہی تو اس کے قلم سے طیب خان کے متعلق وہ جملے نکل گئے تھے' جو لکھنے کے لیے نہیں کہا گیا تھا۔۔۔

یہ بدلاؤ کب شروع ہوا تھا۔۔۔ شاید تب سے جب سے اس نے حاجی صاحب کے پاس جانا شروع کیا تھا۔ حاجی صاحب ساتھ والے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے بیٹے' پوتے پوتیاں تھیں۔ اور ان کی عمر نوے برس سے بھی شاید زیادہ ہی تھی۔ وہ اکثر صبح صبح اپنے لان میں بیٹھے نظر آتے تھے۔ اس کی پہلی ملاقات ان کے گیٹ پر ہوئی تھی۔ وہ گیٹ کے باہر کھڑے تھے۔ اس نے بزرگ سمجھتے ہوئے سلام کیا تو وہ مسکرائے تھے۔ اس کے پروگرام کی تعریف کی اور دعا دی۔ پھر دو تین بار کھلے گیٹ سے انہیں لان میں بیٹھے دیکھ کر وہ ان کے پاس چلا گیا تھا۔ ان کی باتیں اسے اچھی لگی تھیں۔ ان کے پاس بہت علم تھا۔ وہ اکثر اسے پڑھتے ہوئے ہی نظر آتے تھے۔ ان کے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی تھی۔ وہ بہت زیادہ بار ان سے نہیں ملا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے اندر بدلاؤ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔

اسے لگ رہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی اس کے اندر تبدیلی آئی ہے۔ ابھی کایا پلٹ ہوئی ہے۔ ابھی اس نے جانا ہے کہ وہ مظلوم نہیں ہے۔

لیکن یہ حاجی صاحب تھے جنہوں نے غیر محسوس انداز میں اس کے اندر بدلاؤ پیدا کیا تھا۔ اس روز موضوع گفتگو "توہین رسالت قانون" تھا۔ اپنے پروگرام میں اس نے مبہم الفاظ میں اس کی مخالفت کی تھی۔ حاجی صاحب اسے بتا رہے تھے کہ ہندوستان میں BLASPHAMY کا قانون تھا۔ جس کے تحت حضرت عیسیٰ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کے لیے سزا مقرر تھی۔ 1894 میں اس میں دفعہ A-124 کا اضافہ کر کے اسے تعزیرات ہند کا نام دیا گیا تھا۔ پھر اس میں A-153 دفعہ شامل کر دی۔ جس کے تحت راج پال گستاخ کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا۔ پھر 1932ء میں نتھو رام نے "ہسٹری آف اسلام" کے نام سے کتاب شائع کی۔ مقدمہ چلا اور اسے ایک سال کی سزا اور برائے نام جرمانہ ہوا تھا۔ عبدالقیوم ولد عبداللہ نے غازی بن کے آکر مقدمہ کی کارروائی کے دوران چھرا مارا تھا' جو اس نے جونا مارکیٹ سے خریدا تھا۔"

اس روز وہ تھوڑی دیر کے لیے حاجی صاحب کے پاس رکا تھا۔ موضوع گفتگو یہ ہی قانون تھا۔

حاجی صاحب کے لہجے اور گفتگو میں جذبے بول رہے تھے۔۔۔ انہیں مسلمانوں کی بے حسی پر افسوس تھا۔

"یہ ایک تہذیب یافتہ معاشرہ ہے۔ یہاں اب پہلے زمانے کی طرح نہیں ہو سکتا حاجی صاحب!" اس نے کہا۔

"عشق۔۔۔ اور وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق تمہارے اس تہذیب یافتہ معاشرے کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ بیٹھو! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ایسے ہی ایک عاشق دیوانے کے متعلق۔ جن سے میں خود ملا تھا۔ شاید کتابوں میں ان کے متعلق بہت کم لکھا گیا یا پتا نہیں لکھا گیا ہو۔ لیکن میں نے نہیں پڑھا۔ سین کمپنی کلکتہ کے مالک نے کتاب چھپوائی تھی حضرت جھوان۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق۔۔۔ لاہور سے امیر احمد اور عبداللہ گئے تھے اسے مارنے۔"

"لیکن کیوں؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"یہ عشق کی باتیں ہیں احمد حسن! غور سے سنو۔ ان میں جواز نہیں ہوتا۔ دلیل نہیں ہوتی۔ وہ دونوں رات سیٹھ موسیٰ کے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے۔ صبح اٹھ کر گل شاہی کی دکان پر بیٹھے رہے اور کالج اسٹریٹ کا پتا پوچھا وہاں سے۔۔۔ اور پھر جا کر تینوں کو مار دیا۔ پبلشر' مصنف اور کاتب۔ مار کر چلے گئے۔۔۔ آٹھ گھنٹے بعد دونوں یہ دیکھنے کے لیے واپس آئے کہ زندہ ہیں یا نہیں۔ میں ملنے گیا تھا انہیں سینٹرل جیل کلکتہ میں۔ اس روز امیر احمد کی ماں اور بہن اور عبداللہ کا باپ آیا ہوا تھا۔ امیر احمد نے مجھے گلے لگایا تو میری ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں۔ کہنے لگا۔ جیل میں آکر پچپن پونڈ وزن بڑھ گیا ہے۔"

امیر احمد کی ماں اور عبداللہ کے باپ نے کہا۔

"ہم رہائی کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"سب بے کار ہے۔" امیر احمد کے چہرے پر انوکھی چمک تھی۔

"رات خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تھے۔ فرما رہے تھے' جلدی آؤ۔ انتظار کر رہے ہیں۔"

امیر احمد کے لبوں کی مسکان اور آنکھوں کی چمک مجھے نہیں بھولتی احمد حسن۔"

"پھر کیا ہوا تھا؟" احمد رضا نے کورس کے علاوہ بہت کم پڑھا تھا۔

"ولایت تک مقدمہ لڑا گیا تھا۔ لیکن پھانسی ہو گئی۔ مشینیں گنیں رات کو ہی مسلمانوں کے محلوں میں لگا دی گئی تھیں۔ صبح فجر کے ٹائم پھانسی دی گئی تھی۔ چالیس ہزار آدمی جنازے میں تھے۔ اقبال نے امیر احمد کے متعلق ہی کہا تھا۔ ترکھانوں کا منڈا سبقت لے گیا۔"

حاجی صاحب اپنی یادیں اس کے ساتھ شیئر

(Share) کررہے تھے۔

"غازی عبدالرشید کابل سے آیا تھا اور اس نے دلی میں آکر شردھانند کو مارا تھا۔ جس نے اسلام کے خلاف کتاب لکھی تھی۔"

اس رات جب وہ اپنے بستر پر لیٹا تھا تو اس نے خود سے وہ سوال نہیں پوچھا تھا' جو اکثر پوچھا کرتا تھا کہ ابو نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا اور اکثر ہی خود ترسی اور مظلومیت میں مبتلا ہو کر سوتا تھا۔ آج اس نے خود سے سوال نہیں کیا تھا۔ لیکن جیسے اس سوال کا جواب معلوم نہ ہوتے ہوئے بھی کہیں لاشعور کے کسی کونے میں لکھا جاچکا تھا۔ جس کا ادراک اسے ابھی ابھی ہوا تھا۔

اس کے ابو ایک بڑے آدمی تھے۔ عام آدمی ہوتے ہوئے بھی بڑے آدمی۔

اور وہ کیا تھا۔ بہت پہلے شاید ساتویں یا آٹھویں میں اس نے اپنی نصاب کی کتاب میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ کہانی تو اسے یاد نہیں تھی۔ لیکن اس کا ایک جملہ اس وقت پتا نہیں کیوں اسے یاد آگیا تھا۔

"اور اس نے محض چند سکوں کے عوض اپنی روح شیطان کے پاس گروی رکھ دی تھی۔"

تو کیا اس نے بھی محض چند سکوں کے عوض۔۔۔

وہ بے چین ہوا اور مضطرب ہو کر ایک بار پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ تب ہی ثمینہ حیدر نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا۔

"جنید علی آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے! میں آتا ہوں۔" اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

وہ اس وقت جنید علی سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس سے ملنے سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے وہ ثمینہ حیدر کے پیچھے ہی اپنے کمرے سے نکل آیا۔

جنید علی بہت آرام دہ انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ ٹانگیں تھوڑی سی پھیلائے اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

احمد رضا کے اندر آنے کے بعد بھی اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"خیریت ہے جنید علی! کیسے آنا ہوا؟" احمد رضا اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے مصنوعی حیرت سے اسے دیکھا۔

"مجھے یہاں آنے کے لیے کیا کسی خاص ریزن کی ضرورت ہے احمد رضا؟"

"شاید نہیں۔" احمد رضا کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"آج کل تم بہت سنجیدہ اور خاموش لگتے ہو۔"

"وہم ہے تمہارا۔" احمد رضا کے چہرے کے تاثرات ہنوز ایسے ہی تھے۔

"چلو خیر' وہم ہی سہی۔" جنید علی مسکرایا۔

"لیکن تمہاری اس اداسی اور سنجیدگی کے علاج کے لیے رچی نے یہ کچھ بھیجا ہے۔" اس نے صوفے پر اپنے پاس پڑے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

احمد رضا نے ایک نظر بریف کیس کی طرف دیکھا۔ رچی کی طرف سے ہمیشہ کیش ہی ملتا تھا۔ جب بھی رچی کی طرف سے اس طرح کا کوئی گفٹ ملتا تھا تو بظاہر کوئی تاثر نہ ہوتے ہوئے بھی اندر کہیں ایک خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی تھی۔

وہ ایک امیر آدمی تھا۔

اس کا بینک بیلنس کروڑ کے ہندسوں کو عبور کرچکا تھا۔

وہ اگر انجینئر بن بھی جاتا تو اتنے کم عرصے میں وہ اتنے بینک بیلنس کا مالک نہیں بن سکتا تھا۔ اگر ابو اسے گھر سے دور نہ کرتے تو سمیرا اور اماں۔۔۔ اور خوشی کی لہروں میں غم کے کنکر بھی آگرتے۔ جو اپنے نوک دار کونے اسے ۔ چبھتے اور تکلیف دیتے۔ یہ سب اس کے اندر چلتا رہتا تھا۔ لیکن آج اندر بھی دور دور تک کوئی خوشی کی رمق تک نہ تھی۔ یہاں سے وہاں تک سناٹا پھیلا تھا۔ اس نے سپاٹ نظروں سے بریف کیس کی طرف دیکھا۔ جنید علی بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"رچی کا خیال ہے' کچھ دنوں کے لیے تم کہیں گھوم پھر آؤ۔ مری' بھوربن' کاغان کہیں بھی۔۔۔ تم بہت تھکے تھکے لگ رہے ہو۔ "سیمل" پر تمہارا اس سلسلے کا یہ آخری پروگرام ہے۔ پروگرام ختم کے بعد چاہو تو دبئی چلتے ہیں۔"

"کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟" احمد رضا کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ جنید علی نے دانت نکال دیے۔

"محض تمہاری دوسراہٹ کے خیال سے۔۔۔ اکیلے کوئی کیسے انجوائے کرسکتا ہے۔"

اب کے احمد رضا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

"ہاں! اگر تم اکیلے ہی انجوائے کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ اکیلے چلے جاؤ۔ لیکن یار! پروگرام ضرور بناؤ کہیں جانے کا فریش ہوجاؤ گے۔" اس نے پھر اپنی بات دہرائی تھی۔

احمد رضا نے اب بھی سرہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" جنید علی نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"جنید علی! ایک ذاتی کام کے سلسلے میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کیا میں امید رکھوں کہ تم میری مدد کروگے؟"

"کیوں نہیں احمد رضا۔۔۔ میرے خیال میں ہم دوست ہیں اور اگر میں تمہارے لیے کچھ کرسکا تو ضرور کروں گا۔" اس نے احمد رضا کے چہرے پر نظر ڈالی' جو کچھ متذبذب نظر آرہا تھا۔

"کم از کم میری حد تک تو میں خود کو تمہارا دوست ہی سمجھتا ہوں۔ ہاں! تم شاید مجھے دوست نہیں سمجھتے۔"

"میں اپنے والدین کی تلاش میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔" جنید علی رضا نے ایک گہری سانس لی اور اس کی طرف دیکھا۔

"رچی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں ڈھونڈنے گا۔ لیکن ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔"

"او کے! میں پوری کوشش کروں گا احمد رضا۔ تم مجھے ان کے متعلق کچھ بتاؤ۔"

احمد رضا کو پہلی بار اس کے لہجے میں خلوص کی جھلک نظر آئی۔

وہ ہولے ہولے اسے ابو کے متعلق بتانے لگا۔ وہ کہاں رہتے تھے' کہاں کام کرتے تھے۔ جنید علی کے متعلق اس کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ اسے سب بتا رہا تھا۔ اسماعیل کے پاس جانے سے لے کر اب تک کی ہربات اس نے کہہ دی تھی۔

جنید علی نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"احمد رضا۔۔۔ وہ تمہارے لیے کیسے تڑپتے ہوں گے۔ میں اس کا اندازہ کرسکتا ہوں۔ تمہاری ماں اور تمہاری بہن کی تڑپ تمہاری تڑپ سے ہزار گنا زیادہ ہوگی۔ تمہارے لیے نہ سہی احمد رضا! لیکن میں تمہاری ماں کے لیے انہیں پورے خلوص سے تلاش کروں گا۔ میں نے اپنی ماں کی تڑپ دیکھی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے ایسے تڑپتی ہے جیسے بن پانی کے مچھلی۔۔۔ سولہ سال پہلے میرا سب سے بڑا بھائی رزق کی تلاش میں گھر سے ڈالرز کمانے نکلا تھا۔ پتا نہیں اس

تلاش میں کہاں کھو گیا۔ شاید میں تمہارے والدین کو تلاش کروں تو اس صدقے میں مری ماں کو اس کا کھویا ہوا بیٹا مل جائے۔"

جنید علی کی آنکھوں میں نمی تھی۔ احمد رضا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس سے پہلے جنید علی کا یہ روپ نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اسے انتہائی مکار اور چالاک لگتا تھا۔

"اوکے! میں چلتا ہوں اب۔" جنید علی کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو! رچی سے اس بات کا ذکر نہ کرنا کہ تم نے مجھے اپنے والدین کی تلاش کا کہا ہے۔ اگر اس نے مجھے منع کر دیا تو پھر میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ میں اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوں۔"

"بھلا رچی کیوں منع کرے گا؟" احمد رضا نے سوچا ضرور تھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

"یہ رقم سنبھال لو احمد رضا! اور وہ سب باتیں یاد رکھنا، جو رچی نے تم سے کہی ہیں۔ شام تک کچھ اور ہدایات مل جائیں گی۔"

احمد رضا نے سر ہلا دیا۔

جنید علی چلا گیا، لیکن وہ وہیں بیٹھا رہا۔ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے وہ ایک بار پھر اپنے سمن آباد والے گھر میں پہنچ گیا تھا۔ سمیرا پرندوں سے ڈرتی تھی۔ چاہے وہ مرغی ہو کبوتر ہو یا چڑیا۔

پڑوس سے منے کا کبوتر اڑ کر ان کے گھر آ گیا تھا۔ وہ کبوتر ہاتھ میں پکڑے سمیرا کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور سمیرا چیخیں مارتی ہوئی پورے گھر میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ تصور میں آنے والے اس منظر نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ تب ہی ثمینہ حیدر نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"سر! دو لڑکیاں آئی ہیں ملنے۔" اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"کون؟"

"پتا نہیں سر۔ آپ کی کوئی فین ہیں۔ آپ کے پروگرام کے متعلق بات کر رہی تھیں۔"

"ٹھیک ہے! لیکن تم نے انہیں بتایا نہیں کہ سنڈے کو سب اکٹھے ہوتے ہیں یہاں اور ملکی مسائل پر بحث ہوتی ہے، اسی روز وہ بھی آجائیں؟"

"ٹھیک ہے! میں کہہ دیتی ہوں۔" ثمینہ حیدر باہر چلی گئی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

کم از کم آج کے دن وہ کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ذہن و دل اس وقت عجیب سی کیفیت کے زیر اثر تھے۔ دل میں امیدوں کے بھنور بن اور ٹوٹ رہے تھے۔ کبھی اسے لگتا جیسے ابھی جنید کا فون آئے گا اور وہ کہے گا۔ "احمد رضا! مجھے تمہارے والد کا پتا چل گیا۔" جیسے اس کے پاس جادو کی کوئی چھڑی تھی، جسے وہ گھمائے گا اور۔۔۔

وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی اسے وہ ڈاکومنٹس دیکھنے تھے، جو رچی نے اسے فیکس کیے تھے۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے اس نے ثمینہ حیدر کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"سوری! آج حسن صاحب نہیں مل سکیں گے۔ انہیں ایک اہم میٹنگ میں جانا ہے۔ آپ اتوار کو آجایئے گا۔ اس روز اور طالب علم بھی آتے ہیں۔" آواز لیونگ روم سے آرہی تھی۔ غالباً" لڑکیاں لیونگ روم میں بیٹھی تھیں۔ لیونگ روم کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لحہ کو اس کے قدم سست ہوئے تھے۔

"آج بھی ہم بہت مشکل سے وقت نکال کر آئے تھے۔ دراصل ہماری کزن کی شادی ہے۔ آج بھی مہندی ہے۔ سنڈے کو تو بارات ہے۔ ہم نہ آسکیں گے۔"

"تو کسی اور دن آجایئے گا۔ اگلے سنڈے کو سہی۔" یہ ثمینہ حیدر کی آواز تھی۔

"اگلے سنڈے کو۔ لیکن اگلے سنڈے میں تو بہت دن ہیں۔"

یہ آواز بہت آہستہ تھی۔ لیکن اس کی سماعتوں نے

اسے کیچ کیا تھا۔ اسے لگا۔ جیسے یہ آواز اس نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ بہت جانی پہچانی آواز تھی۔

"کیا اس سے پہلے۔۔۔ میرا مطلب ہے کل نہیں آسکتے ہم؟"

وہی پہلی آواز۔

"میں سر سے پوچھوں گی۔ اگر وہ کل مصروف نہیں ہیں تو کل آجایئے گا۔ میرا نمبر محفوظ کر لیں اور شام میں کسی وقت پوچھ لیجیے گا۔"

"شکریہ تمیم۔" وہی آواز۔

اس نے قدم آگے بڑھائے۔

یہ ثمینہ حیدر بھی۔۔۔ اب بھلا ان کو اپنا نمبر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ پتا نہیں کون لڑکیاں ہیں۔ صاف کہہ دینا چاہیے تھا سنڈے کو ہی آئیں۔

وہ لیونگ روم کے پاس سے گزر کر لاؤنج میں آگیا۔ لیونگ روم کا ایک دروازہ ڈائریکٹ باہر کھلتا تھا برآمدے میں۔۔۔ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر پورچ تھا اور پھر آگے گیٹ تھا۔ دائیں طرف لان تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھلتا تھا۔ یہاں دو بیڈ روم تھے۔ دو بیڈ روم فرسٹ فلور پر تھے۔ وہ اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے جاتے مڑا اور ٹی وی لاؤنج کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کھڑکی سے لان اور گیٹ نظر آتا تھا اور پورچ میں کھڑی گاڑی کا کچھ حصہ۔ وہ یوں ہی بے دھیانی سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا، جب اس نے گیٹ کے قریب پہنچتی لڑکیوں کو دیکھا۔ ایک لڑکی نے عبایا یا گاؤن پہن رکھا تھا۔ جبکہ دوسری نے سیاہ چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ سیاہ چادر جس کی خوب صورت نفیس سی کڑھائی کے اندر ننھے ننھے شیشے دمکتے تھے۔

عبایا والی لڑکی۔ وہ چونکا۔

یہ وہ لڑکی تو نہیں۔۔۔ وہ ہی۔۔۔ کے ای والی ڈاکٹر لڑکی جس کے ساتھ عینک والی لڑکی تھی جو بہت تیز تیز بولتی تھی۔ لیکن جو بالکل سمیرا کی طرح خود کو متعصب پاکستانی کہتی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"مجھے ان سے مل لینا چاہیے تھا۔"

اسے افسوس ہوا اور یاد آیا کہ اس نے ان سے کہا تھا کہ اپنی ٹائم وہ اس سے مل سکتی ہیں۔

چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔

سیاہ چادر والی لڑکی نے غیر ارادی طور پر مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔

"اریب فاطمہ۔۔۔!" اس کے لبوں سے نکلا۔ یہ تو اریب فاطمہ تھی اسفندیار اور عظمت یار کی بہن۔

"وہ یہاں۔۔۔ کیا وہ بھی کے ای میں پڑھتی ہے، لیکن نہیں اسفند نے بتایا تو تھا وہ بی اے کر رہی ہے۔"

لڑکیاں گیٹ کھول کر باہر نکل چکی تھیں۔ جب وہ تقریباً" دوڑتا ہوا اندرونی دروازہ کھولتا گیٹ تک آیا تھا۔ چوکیدار نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ روڈ کراس کر کے سامنے روڈ کے کنارے کھڑی تھیں۔ عبایا والی لڑکی نے آج بھی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ جبکہ اریب فاطمہ دائیں طرف روڈ پر دیکھ رہی تھی۔ شاید کسی ویگن یا بس کو۔ وہ اریب فاطمہ تھی اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ وہ روڈ کراس کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک بڑے ٹرک نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا اور جب تک وہ روڈ کراس کر کے ان تک پہنچا، وہ ایک رکشہ روک کر اس میں بیٹھ چکی تھیں۔

"اریب فاطمہ۔۔۔!" اس نے پکارا۔

اور شاید اریب فاطمہ نے اس کی پکار سن بھی لی تھی۔ کیونکہ اس نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے تھوڑا سا آگے جھک کر اسے دیکھا تھا۔

"اریب فاطمہ۔۔۔!"

اس نے پھر بلایا تھا۔ لیکن رکشہ فراٹے بھرتا آگے نکل گیا اور وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا رکشے کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھ رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

امایہ خان

دستک

بجلی ایک بار پھر زور سے کڑکی تھی۔ حالانکہ بادل تو شام ہی سے گھر آئے تھے مگر رات گئے اس کے چارپائی پر لیٹنے تک کوئی بوند نہیں ٹپکی تھی۔ اب بھی بارش کی آمد سے قبل بادل گرج رہے تھے مگر برسنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ حمیدہ نے کروٹ بدل کر دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ وہی آواز پھر سنائی دی۔

نہیں۔ یہ بادل کی گرج نہیں۔ یہ تو کچھ اور ہی قسم کی آواز تھی۔ مستقل ٹھک ٹھک۔۔۔ ایک سے وقفے کے ساتھ۔۔۔ وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شوہر کے مرنے کے بعد یوں بھی اسے رات کو کم ہی نیند آتی تھی اور جو تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگتی بھی تو ہلکی سی آہٹ ذرا سے کھٹکے پر دوبارہ کھل جاتی تھی۔ بہت بیدار نیند سویا کرتی تھی وہ ہر دم چوکس اور خبردار۔

امین دنیا سے جاتے ہوئے اس کی پرسکون میٹھی نیند بھی ساتھ لے گیا تھا۔ پندرہ سال پہلے بیوہ ہوئی تھی وہ۔۔۔ کیا وقت تھا وہ بھی۔۔۔ اس نے اپنی شب بیداری کی وجوہات کا لاشعوری طور پر تجزیہ کرنا شروع کردیا۔

یوں فی الوقت آنکھ کھلنے کی اہم وجہ پس منظر میں چلی گئی۔

زیادہ دیر گم صم بیٹھے نہیں گزری تھی کہ بجلی دوبارہ کڑکی، پھر کھٹکا ہوا۔ اس نے کان لگائے۔ سیڑھیوں سے اترتے دبے پاؤں ٹھوکر کھا کر ڈگمگائے، پھر سنبھلے اور پنجوں کے بل دوبارہ ہلکی سی دھمک کے ساتھ صحن میں کود گئے۔

"کون ہے؟" اپنی پاٹ دار آواز میں حمیدہ نے سوال نہیں کیا، للکارا تھا۔

"میں ہوں اماں! ڈیوٹی سے واپس آگیا ہوں۔"

"اوہ۔ اچھا اچھا آجا۔۔۔ دروازہ کھولتی ہوں۔۔۔"

حمیدہ نے اوڑھا ہوا کھیس ہاتھ سے پرے کیا اور چارپائی سے پاؤں اتار کر دروازے کی کنڈی کھولنے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیٹے کے پاس گھر کے بیرونی دروازے کی چابی ہوتی تھی پر اپنا کمرا وہ مقفل رکھتی اور اس کے آنے پر خود ہی کھولا کرتی تھی۔

"ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔۔۔" کچھ دیر قبل سنائی دیتے بے نام کھٹکے بوڑھے ذہن کی خرافات سمجھ کر جھٹک دیے اس نے۔ بیٹا گھر آگیا تھا، اب وہ قدرے اطمینان محسوس کررہی تھی۔ جلد ہی وہ دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ مگر وہی سوتی جاگتی رات۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔

☼ ☼ ☼
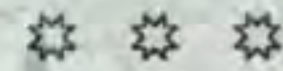
اگلی رات بارش نہیں ہوئی، بجلی بھی نہیں کڑکی۔ حمیدہ نے دروازے بھی اچھی طرح بند کرلیے اور کھڑکیاں بھی۔ پھر صحن سے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے آخری نظر چھت والے کمرے پر ڈالی، جہاں خاموشی کا راج تھا۔ بس دروازے کے عین اوپر زرد مدقوق روشنی دیتا بلب تار سے لٹکا ہلکی ہوا سے جھول رہا تھا۔

حمیدہ نے آج صبح اس کا ٹین والا شیڈ اتار دیا تھا۔

اسے شک تھا گزشتہ رات تیز ہوا کے باعث ہو سکتا ہے یہی شیڈ بار بار دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرا رہا ہو۔ زرینہ کی نیند پر تو کسی قسم کی بھی آواز کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ کل بھی سرشام سو گئی تھی اور آج بھی حمیدہ اسے اپنے سامنے کھانا کھلا کر نیند کی گولی دے کر سلانے کے بعد نیچے آئی تھی۔ پچھلے ہفتے سے یہی اس کا معمول تھا۔ جب سے اسے پتا چلا تھا کہ زرینہ رات بھر جاگتی ہے اور روتی رہتی ہے۔

اس بدقسمت لڑکی کا کوئی بھی نہیں تھا۔ سوائے منصور کے اور جو مرچکا تھا۔

دو ماہ پہلے حمیدہ نے اس نئے شادی شدہ جوڑے کو چھت پر بنے کمرے میں کرائے دار رکھا تھا۔ زرینہ اور منصور ایک یتیم خانے میں ساتھ پلے بڑھے تھے۔ پسند کی شادی کے بعد دونوں اپنی زندگی کی شروعات کرنے ایک گھر کی تلاش میں اس تک پہنچے۔ حمیدہ نے بڑی مہربانی کی تھی اور برائے نام کرایہ مقرر کیا تھا۔ منصور نے یتیم خانے میں رہتے ہوئے گاڑیاں مرمت کرنے کا کام سیکھا تھا۔

وہ بہت محنتی انسان تھا اور زرینہ کے لیے تو کل کائنات تھا۔ جسے لوٹنے والوں نے پندرہ سو کا موبائل حوالے نہ کرنے پر بیس روپے کی گولی مار کر ہلاک کردیا تھا اور کھلی سڑک پر مرتا چھوڑ کر موبائل لے کر بھاگ گئے۔ منصور اپنی بے وقت جان دے کر بھی کچھ نہ بچا پایا۔ اس دنیا سے منہ موڑتے ہوئے اسے اپنی نئی نویلی دلہن کا خیال یقیناً" آیا ہوگا۔

زرینہ بھی بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی بالکل اس کی طرح۔ حمیدہ بند دروازوں کا اطمینان کرکے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ذہن میں ابھی تک انہی دونوں کا خیال بسا ہوا تھا۔

بے چاری زرینہ ابھی عدت میں تھی۔ اس کے شوہر کے قتل ہوجانے کے بعد حمیدہ کو کرایہ ملنے کی امید نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھی۔

اسے زرینہ میں اپنا عکس دکھائی دیتا تھا۔

جوان، خوبصورت اور غریب بیوہ۔۔۔ جس کے دروازے پر ہر راہ چلتا دستک دے کر گزرتا۔ ان دنوں محلے کی سب عورتیں جانے کہاں مرگئی تھیں، سوائے مردوں کے۔ کسی کو اس کی تنہائی اور اکیلے پن کا احساس نہ تھا۔ اس کی فالج زدہ ساس کو وہ شاید زندوں میں شمار نہ کرتے تھے اور بیٹا جو محض آٹھ برس کا تھا، بھلا وہ ماں کا سہارا کیا بنے گا۔ اس کی ساس تو خود اس کی محتاج تھی۔ بستر پر پڑی رہتی۔ اک دن یوں ہی مر بھی گئی۔ اس کے دنیا سے جاتے ہی سب کو اس کی فکر پڑ گئی۔ آتے جاتے ہر شخص رک کر اس کی خیریت دریافت کرنا چاہتا۔ سب مردوں کے ہاتھ اس کے دروازے سے بندھ گئے تھے اور تمام عورتوں کی آنکھیں چوبیس گھنٹے پہرے داری کرتیں۔

عدت کے بعد جب پہلی بار اس نے گھر سے باہر قدم نکالا، باوجود شدید سردی کے وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گئی۔ لرزتے کانپتے وجود کو بمشکل سنبھالتی، نظریں ڈگمگاتے قدموں پر جمائے، دس پندرہ قدم کے فاصلے پر موجود کریانہ اسٹور تک پہنچنے میں جیسے صدیاں

بیت گئیں۔ ہر مرد کی نظر جیسے اسی پر ٹکی تھی۔ لباس کے آرپار ہوتی بے باک نگاہیں۔

ہر ایک یوں فرصت سے گھور رہا تھا جیسے دنیا کے بازار میں وہ بدقسمت کچھ خریدنے نہیں' اپنا سب کچھ بیچنے نکلی ہو۔ سیاہ لمبی چادر اس کے پورے وجود کو سر سے پاؤں تک ڈھانپنے کے باوجود اسے تحفظ کا احساس دینے سے بھی قاصر تھی۔ اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا جو نگاہیں اس کے در سے گرد بن کر چمٹی رہتی ہیں' باہر نکلنے پر یوں اپنی گرفت میں لیں گی۔

جس شخص نے بھی اسے گھر سے باہر دیکھا' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ جیسے شکار سامنے دیکھ کر بھیڑیے کی آنکھیں چمکتی ہیں۔ ان ہوس زدہ آنکھوں میں ایسی لپک ہوتی ہے' جو شکار کے حواس معطل کردے۔ ہاتھ پیروں سے جان نکال دے۔ وہ بھی چندھیائی آنکھوں سے منظر پہچاننے کی تگ و دو میں مصروف تھی' پر راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا' ہر طرف چمک ہی چمک تھی۔

یہ حال تو مردوں کا تھا... کیا کنوارے' کیا بچوں والے شادی شدہ مرد۔ بہتی گنگا میں سب ہی ہاتھ دھونے کھڑے تھے۔

رہی عورتیں' تو وہ شاید خفا تھیں۔ انہیں اعتراض تھا وہ گھر سے باہر نکلی کیوں؟ خواہ مخواہ ان کے شوہر۔ بیٹوں' بھائیوں کی بے راہ روی کا سامان کرنے... پڑی رہتی اپنے گھر کے کسی کونے میں... پہلے بھی تو اس کا بیٹا سودا سلف لا رہا تھا... اب بھی لے آتا۔

بھلے انہوں نے اسے صبح سویرے اسکول کے لیے نکلتے دیکھا ہو... مگر پھر بھی... اعتراض کرنے میں کسی کا کیا جاتا ہے؟

اس کا مرحوم شوہر امین کسی بیگم صاحبہ کا ڈرائیور ہوا کرتا تھا۔ وہ خداترس عورت اس کے مرنے کے بعد بھی پوری تنخواہ اس کی بیوہ کو بھجوایا کرتی تھی۔ احسان تھا اس کا۔ آرام سے گزارہ ہو جاتا' بیٹے کی اسکول فیس بھی نکل آتی۔ گھر اپنی ملکیت تھا' سو چھت کے چھن جانے کا ڈر بھی نہیں تھا۔ بس ایک خوف سب سے بڑھ کر لاحق ہو چکا تھا... عزت کا... وہ اپنا وجود ان حریص نگاہوں سے کس طرح محفوظ رکھ سکتی تھی؟

بہت کوشش کر کے وہ کم سے کم گھر سے باہر نکلتی... انتہائی اہم ضرورت پڑنے پر... اس کے باوجود کوئی نہ کوئی فقرہ سرراہ ایسا سننے کو مل جاتا کہ اگلے چار دن وہ ڈری سہمی گھر میں دبک کر بیٹھی رہتی۔

پر چاہنے والے اس کی عدم موجودگی بے حد محسوس کیا کرتے تھے۔ تب ہی انہیں یکایک یاد آیا کہ حمیدہ کے گھر میں دو دروازے ہیں اور اس کا پچھلا دروازہ دوسری گلی میں کھلتا ہے۔

چلو یہ تو اچھا ہے۔ اس طرح سہولت رہے گی... اور لوگ کم وقت کا بہانہ بنا کر اس کے گھر کے بیچ سے گزرنے لگے۔

دستک کے جواب میں اس کے پاس کوئی عذر نہ ہوتا' پرانی محلے داری تھی۔

"یہ تو نیکی کا کام ہے نا... تمہاری بدولت ہم جلدی گھر کو پہنچ جائیں گے..." آنے جانے والوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ اور وہ اپنے ہی گھر سے باہر نکل کر کھڑی ہو جاتی۔ مبادا کہیں آنے جانے میں کوئی چھوتا ہوا گزرے۔

اور اس بیوہ سے مس ہونا تو جیسے ذریعہ ثواب تھا... ہمسائیگی کا فرض تھا...

احمد کریانے والا سودے کا تھیلا پکڑاتے' کنڈیکٹر کرایہ لیتے' بقایا دیتے ہوئے اور بینک والا بل وصول کرتے ضرور اس کا ہاتھ سہلایا کرتا تو راہ چلتے منچلے کیوں پیچھے رہتے۔ بھئی جب گلی تنگ ہے تو گزرتے ہوئے ٹکرا جانا کچھ ایسا معیوب بھی نہیں...

حمیدہ اپنے کڑے وقت کو یاد کرتی نہ کرتی... وہ بھولنے والا نہیں تھا۔

اب زرینہ کی صورت ایک بار پھر وہی سارے خوف دل کو لاحق تھے۔

یہ اکیلی کیا کرے گی...؟

حمیدہ پر تو ایک حادثے نے گزر کر اس کی ساری مشکلوں کو گزار دیا۔ جب چہرے اور دونوں ہاتھوں کی جلد جھلس گئی تھی۔ آئینہ دیکھ کر خود سے بھی ڈر لگنے لگا۔

پر جیسے ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے... اس کی بھی ہر مشکل اب آسان ہو گئی۔ جب وہ خود پر نظر ڈالنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی تو کوئی اور کیسے کرتا۔ چلو جان چھوٹی سارے ہمدردوں سے... اب کسی کو ہوش نہیں ہوتا تھا حمیدہ کب گھر سے نکلی' گلی میں آئی کب واپس گھر پہنچی۔ کسی کو اسے ہاتھ لگانے میں دلچسپی نہیں رہی یہاں تک کہ لوگ اس کے گھر کا راستہ ہی بھول گئے۔

بڑے دن گزر گئے تھے رات میں کسی انجان کھٹکے کو سنے ہوئے... پر اب یہ پراسرار سی دستک...؟

کل رات پھر وہی ہوا تھا' جو پندرہ سال پہلے ہوتا تھا۔

اپنے ماضی کے جھروکوں سے تاکا جھانکی کرتی وہ یوں ہی چارپائی سے اٹھ کر دروازے کی جھری میں آنکھ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ صحن تک چھت پر جلتے بلب کی روشنی بڑی دقتوں سے پہنچ پاتی' آدھے رستے میں ہی دم توڑ دیتی تھی۔ اس روشنی کے سائے میں قدرے گہرے سائے نے تیزی سے حرکت کی اور زینہ چڑھنے لگا۔

پھر وہی کھٹکا' سرگوشی اور دستک...

سائل کے مایوس ہونے تک وہ یوں ہی کان لگائے کھڑی رہی۔ اسے مایوس ہونا ہی تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا جس کا در کھٹکھٹا رہا ہے وہ کان لپیٹے سو رہی ہے۔ صبح سے پہلے اس کی آنکھ نہیں کھلنے والی۔

اس کے نیچے اترتے مایوس قدموں کی دھمک سن کر وہ اطمینان سے کنڈی کھول کر واپس اپنی چارپائی پر لیٹ گئی اور آنکھیں موند لیں۔

اسے صبح کا انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

"پتر! میرا ایک کام کر کے ڈیوٹی پر جانا۔" وہ ناشتا کرنے کے بعد جوتے پہن رہا تھا جب حمیدہ چند روپے ہاتھ میں لیے اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔

"ہاں اماں! کہو..." اس نے تسمے باندھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کچھ منگوانا ہے...؟"

"آہو پتر... ایک بوتل تیزاب کی لا دے مجھے..."

اس کے ہاتھ رک گئے' حیرانی سے ماں کی طرف دیکھا۔

"کیوں اماں... تیزاب کا کیا کرے گی...؟"

حمیدہ لجاجت سے گویا ہوئی "زرینہ کو دوں گی..."

"اسے تیزاب سے کیا کام...؟" عجب لے پر دھڑکا تھا اس کا دل... کیا زرینہ دستک کے جواب میں تیزاب پھینکے گی؟ وہ سوچنے سے روک نہ پایا خود کو... اور اسی لمحے حمیدہ کا جواب ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ بھر گیا۔

"اس بدقسمت سے کہوں گی پتر! جیسے میں نے اپنے چہرے اور ہاتھوں پر تیزاب ڈال کر دنیا سے جان چھڑائی تھی... تو بھی یہ ہی کر لے..."

حمیدہ جانتی تھی۔ اس کے عام سے لہجے میں کی گئی بات نے بیٹے کو بولنے کے قابل نہیں چھوڑا۔

وہ گنگ سا ماں کی شکل دیکھے جا رہا تھا۔ حمیدہ پوری دنیا کو نہیں روک سکتی تھی۔ وہ صرف اپنے بیٹے پر اختیار رکھتی تھی۔

ہر عورت اپنے ہی بیٹے کو روک لے تو تیزاب کی خرید و فروخت پر کافی اثر پڑ سکتا ہے۔ اس نے انگلی کی پور سے جھلسے ہوئے چہرے کی کھال رگڑتے ہوئے سوچا۔ پھر بیٹے کی حالت دیکھ کر زیر لب مسکرائی۔

وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھا۔

کچھ نہ بھی کہتا تب بھی حمیدہ جانتی تھی' زرینہ کے دروازے پر اب کبھی رات گئے کوئی دستک نہیں ہو گی۔

عائشہ نصیر احمد

بڑی مامی ہر کام کے لیے میرا نام لیتی تھیں، مجھے ہی پکارتی تھیں اور میں اس بات پر بڑا اتراتی پھرتی تھی کہ مامی جو نہایت کروفر اور ٹھسے والی خاتون تھیں۔ ایک زمین دار گھرانے کی بہو تھیں۔ چار جوان بیٹوں کی ماں تھیں اور ایسے ویسوں کو تو منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کا کوئی کام میرے بغیر نہیں ہوتا تھا مہمانوں کی آمد پر مینیو بنانے سے لے کر سوئی میں دھاگا ڈالنے تک ہر کام کے لیے انہیں میری ضرورت پڑتی تھی۔ ادھر وہ بلاوا بھیجتیں اور ادھر میں چراغ کے جن کی طرح ان کے سامنے حاضر ہو جاتی۔ ان کا گھر ہمارے بالکل پڑوس میں تھا۔ اسی لیے دن میں ان کے گھر میرے زیادہ نہیں تو چار پانچ چکر تو لگتے تھے۔ پھر چاہے امی ڈانٹتیں، دادی لتاڑتیں یا صبا طعنے دے دے کر میرا ناک میں دم کرتی۔ میں کرتی وہی تھی جو میرا دل چاہتا تھا اور میرا دل کیا چاہتا تھا۔۔۔

ہاں! یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ اگر چار جوان بیٹوں کی ماں دن رات کسی لڑکی کے سگھڑاپے کا امتحان لیتی رہے تو کون لڑکی ہوگی، جو اس امتحان میں پاس نہ

مکمل ناول

ہونا چاہیے گی اور ظاہر ہے میں بھی بنا کسی مطلب کے ان کی یہ خدمتیں تو کر نہیں رہی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ ارمان بھیا۔۔۔ ابھی تک وہ بھیا ہی تھے۔ سیاں بننے کا فی الحال کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا' کے لیے لڑکی کی تلاش میں ان کی نظر سب سے پہلے مجھ پر ہی پڑے گی۔ ویسے بھی ان کی دور کی نظر کمزور تھی۔ نزدیک کی تو نہیں۔ دیکھنے میں تو ارمان بھیا بلکہ یہ چاروں بھائی اچھے خاصے تھے۔ یعنی ماں پر نہیں پڑے تھے۔ پڑھے لکھے بھی تھے۔ آفاق تو خیر زیر تعلیم تھا اور معید نوکری کی تلاش میں مگر ارمان اور فرخ تو برسر روزگار بھی ہو چکے تھے۔ مزاج سب ہی کے ساتویں آسمان کو چھوتے تھے مگر میرے لیے وہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے خیال میں لگا میں کس کر پکڑنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دماغ ٹھکانے پر آتے پھر ٹائم نہیں لگتا۔

اس دن بھی میں اپنے چہرے پر انڈے اور شہد کا ماسک لگائے پنکھے کے عین نیچے لیٹی اس کے سوکھنے کا انتظار کر رہی تھی جب مجھے باہر سے آفاق کی آواز سنائی دی۔ وہ صبا سے میرے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔

"صبا! نیلی کہاں ہے؟"

"کیوں۔۔۔؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تمہارے گھر تیلیاں ختم ہو گئی ہیں؟" صبا یقیناً" کانوں میں ایئر فون ٹھونسے بیٹھی تھی۔ اس کے جواب سے آفاق کا تو نہیں پتا' لیکن اندر میں ضرور سلگ گئی تھی۔

"میں تمہاری بہن کی بات کر رہا ہوں۔ تمہاری اس نیلی پیلی بہن کی۔" وہ بھنا کر بولا۔ حالانکہ نہ تو میں نیلی تھی اور نہ پیلی۔ مگر یہ آفاق جب تک میرے نام کا حشر نہ بگاڑ لیتا' اسے چین کہاں آتا تھا۔

"اندر ہو گی۔۔۔ جا کر دیکھ لو۔" صبا نے بے زاری سے جواب دیا۔

میں فوراً" بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر ملحقہ واش روم کی طرف بھاگی۔ اگر آفاق مجھے اس شکل میں دیکھ لیتا تو اس کے گھٹیا مذاق کبھی ختم ہونے والے نہیں تھے۔ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا تھا۔ یقیناً" وہ سمجھ گیا ہو گا کہ میں اس سے چھپی ہوں۔ آئینے میں اس گیلے ماسک کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں آفاق کو خوب کوسا۔ اسے بھی یہی وقت ملا تھا آن مرنے کے لیے۔ رگڑ رگڑ کر منہ دھوتے ہوئے میں نے اس کے آنے کی وجہ سوچی پھر سر جھٹک دیا۔ یقیناً" مامی نے ہی بھیجا ہو گا۔

"تم آفاق سے چھپیں کیوں؟" جیسے ہی میں واش روم سے نکلی۔ سامنے بیٹھی کچر کچر چپس کھاتی صبا نے سوال داغا تھا۔ ماہ رمضان کے علاوہ میری یادداشت میں ایسے دن بہت کم تھے جب میں نے اسے ہمہ وقت کچھ نہ کچھ کھاتے نہ دیکھا ہو۔

"چھپی نہیں تھی۔ میں منہ دھونے گئی تھی۔ کیا وہ چلا گیا۔" تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے میں دروازے کے قریب آکر باہر جھانکنے لگی۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ دادی کے قیلولے کا ٹائم ختم ہوتا' مجھے مامی کے گھر کا ایک چکر لگا لینا چاہیے تھا۔

"ویسے مجھے ایک بات تو بتاؤ نیلی! یہ دن رات مامی کی خدمتیں کر کے تمہیں حاصل کیا ہونے والا ہے؟" ایسا بے تکا اور بھونڈا سوال صرف صبا ہی کر سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"وہی جو تمہیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔"

"اگر تم ان کے بیٹوں کی بات کر رہی ہو تو مجھے ان میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔" بڑی بے نیازی سے چپس کا خالی پیکٹ ایک طرف اچھالا۔ "یہ رشتے دار بڑے خود غرض ہوتے ہیں۔ اپنے خوبرو اور کماؤ پوتوں کے لیے ان کی نظر خاندان کی لڑکیوں پر کبھی نہیں ٹکتی۔ خود بھلے ہی اپنی کالی' پیلی' کانی بھینگی لڑکیاں خاندان میں کھپا دیں۔ بہو ہمیشہ باہر کی ہی لاتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔" میں نے کندھے اچکائے۔ "مگر میں اپنی طرف سے کوشش کر رہی ہوں کیونکہ مجھے انجان لوگوں میں جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ہول اٹھتے ہیں مجھے سوچ کر۔" میں نے اسے اپنی مجبوری بتائی۔

"اچھا! میں جا رہی ہوں اس سے پہلے کہ دادی جاگ جائیں۔" مجھے اچانک ہی خیال آیا اور اس کے منہ کھولنے سے پہلے ہی میں جلدی سے باہر نکل آئی اس نے بلند آواز میں کچھ کہا بھی تھا' مگر میں نے پلٹنے کی حماقت نہیں کی۔

مامی کے گھر پہنچنے میں مجھے بمشکل دو منٹ لگے تھے۔ نیچے کوئی نہیں تھا۔ لاؤنج میں خلاف توقع سب کچھ بہت سمٹا ہوا اور صاف ستھرا تھا۔ مامی اتنی نفیس طبیعت کی مالک تو ہرگز نہیں تھیں اور نہ ہی بقول ان کے اس عمر میں ان سے اتنی صفائیاں ہوتی تھیں۔ ماسی صبح میں صرف ایک بار صفائی کر تی تھی

میں دیگر کاموں کے ساتھ صفائی بھی کر جاتی۔ مگر بہت سگھڑ اور سلیقہ مند تو میں بھی نہیں تھی اور ان کے گھر تو میں اس مقولے پر عمل کرتی تھی "روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔" ظاہر ہے جی جان لگا کر کونا کونا چمکا کے مجھے کون سا ریوارڈ آف پرفارمنس ملنے والا تھا' جو میں خود کو ہلکان کرتی۔ مامی تو سرسری صفائی دیکھ کر بھی خوش ہو جاتی تھیں۔ انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ صاف ستھرا' چمکتا دمکتا' خوشبوؤں میں بسا گھر کیسا ہوتا ہے۔ اب اگر کچرا ڈسٹ بن میں جانے کے بجائے تھری سیٹر صوفے کے نیچے پڑا ہے تو ان کی بلا سے۔ کم از کم کسی کو نظر تو نہیں آرہا نا! اگر گندے برتن دھلنے کے بجائے ایک بڑے سے پتیلے جس میں چاولوں کی تہہ جل کر چپک چکی ہو' کے اندر اوپر ڈھکن رکھ کر چھپائے گئے ہیں تو انہیں کیا پروا' ٹی وی کے اوپر' ٹیبل کے نیچے یا پھر ادھر ادھر لڑھکے ہوئے تو نظر نہیں آرہے جو وہ فکر کریں۔ یہ بھی ان کے لیے شکر کا مقام تھا کہ کوئی تھا' جو آکر ان کے لیے اتنا کام تو کر جاتا تھا' ورنہ اس مہنگائی کے دور میں کون دو دو ملازمائیں افورڈ کر سکتا ہے۔

اور اب لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑی میں اس حیرانی میں ڈوبی تھی کہ اس خالصتاً" زنانہ صفائی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے کہ سامنے معید کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آیا۔ میں چونک گئی۔

"تمہارے گھر میں کوئی آیا ہے کیا؟" اس سے مجھے جواب ملنے کی امید تو نہیں تھی کہ اس کا گھر اور گھریلو معاملات سے تعلق اتنا ہی تھا' جتنا کہ ہمارے حکمرانوں کا ہمارے ملک سے تھا یعنی صرف کھانے کی حد تک۔ پھر بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے پوچھ لیا۔

"ہاں۔۔۔ تم ہی تو آئی ہو۔" دونوں ہاتھوں میں پکڑے چائے کے چھ کپ سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ سادگی سے بولا۔ میں تپ گئی۔

"میرے علاوہ۔"

"ہو سکتا ہے' آیا ہو۔ میں تو ناشتے کے بعد اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلا۔"

"کیوں۔۔۔؟ کوئی چلہ کاٹ رہے تھے؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔ جینز پر بنیان پہنے' بکھرے بالوں کے ساتھ یوں لگ رہا تھا' جیسے وہ ابھی نیند سے جاگا ہو۔ مامی کے چاروں بیٹوں میں اگر کوئی عجیب ترین تھا تو وہ یہی تھا۔ تھا تو بہت ہینڈسم مگر میں نے کبھی اسے ڈھنگ کے حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔ شلوار پر شرٹ پہنتا' ٹراؤزر پر کرتا اور جینز پر لمبی سی قمیص' کالے' ہلکے گھونگھریالے بال یوں بکھرے ہوئے ہوتے جیسے ان میں سالہا سال سے برش نہ پھیرا گیا ہو۔ شیو ایسی ہوتی کہ نہ تو اسے داڑھی کہا جا سکتا تھا' نہ کلین شیو۔ پیروں میں ہمیشہ ہوائی چپل ہوتی۔ اسے دیکھنے کے بعد اگر کوئی ارمان اور فرخ کو دیکھتا تو یقین ہی نہیں کرتا کہ معید ان کا بھائی ہے۔

"نہیں! میں کمپیوٹر پر مصروف تھا۔" وہ ٹی وی آن کرتے ہوئے ریموٹ لے کر صوفے پر آبیٹھا۔

"ویسے تم کیوں پوچھ رہی تھیں؟"

"صفائی دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ اس لیے پوچھا

تھا۔"

"وہ ہاں!" اس نے پہلی بار چونک کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ "شاید آفاق کر گیا ہو۔" ساتھ ہی اپنی رائے بھی پیش کر دی۔ میری ہنسی بے ساختہ تھی۔ وہ مجھے گھورنے لگا۔

"تم ہنس کیوں رہی ہو۔"

"جو لطیفہ تم نے سنایا ہے۔ اس پر میں ہنسنے کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں؟" میں نے اسی سے پوچھ لیا۔ وہ کندھے جھٹکتے ہوئے بولا۔

"آفاق کبھی کبھار کام کر لیتا ہے۔"

"ایسا کام نہیں کرتا ہو گا۔" میں نے جتاتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھائے۔ تب ہی اس نے دوبارہ پکارا۔

"رکو نیلی۔۔۔ بات سنو۔"

"کیا ہے؟" میں تپ کر پلٹی۔

"ایک کپ چائے تو بنا دو پلیز۔" وہ ملتجی لہجے میں درخواست کر رہا تھا۔

"ابھی جو یہ چھ خالی کپ اپنے کمرے سے لائے ہو۔ اس کی چائے کس نے پی؟" مجھے غصہ آنا لازمی تھا اگر میں اس گھر کے کسی فرد کے کام کو "نہ" کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے اپنی ملازمہ ہی سمجھنے لگیں۔

"ارے۔۔۔ اس میں سے آخری کپ بھی میں نے کوئی آدھے گھنٹے پہلے پیا ہے۔ اور تمہیں اندازہ ہے کہ آدھے گھنٹے میں کتنے سیکنڈ ہوتے ہیں۔ تمہارے لیے تو یہ صرف دو منٹ کا کام ہے۔" چائے کے پیچھے معید اتنا ہی پاگل تھا کہ اگر اس کا مقابلہ کسی عادی نشے باز سے کروایا جاتا تو وہ نشے سے توبہ کر لیتا، مگر معید چائے پینا نہ چھوڑتا۔

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔" میں بے زار ہوئی۔ "ابھی میں مامی کی بات سن لوں۔ انہوں نے ہی مجھے بلایا ہے۔ پھر آ کر بنا دیتی ہوں۔"

"پلیز! جلدی آنا۔" اس نے پیچھے سے کہا تھا اور میں سر ہلاتے ہوئے اوپر چلی آئی۔

اوپر بھی نیچے کی طرح تین کمرے تھے۔ ایک ماموں مامی کا اور ایک آفاق اور فرخ کا۔ مگر مجھے کسی کمرے میں جھانکنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ کیونکہ کمروں کے آگے بڑے سے ہال میں مجھے مامی بیٹھی نظر آگئیں۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ وہ اکیلی نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

"السلام علیکم مامی!" میں نے دانستہ آواز اونچی رکھی تاکہ وہ خود ہی میری جانب متوجہ ہو جائیں۔

"آئے لو نیلی۔۔۔ تمہیں اب خیال آیا ہے آنے کا۔ میں نے آفاق کو گھنٹہ بھر پہلے بھیجا تھا۔" انہیں میری شکل دیکھتے ہی یہ شکوہ یاد آیا۔ ان کے ساتھ بیٹھی گلابی کاٹن کے لباس میں ملبوس وہ لڑکی بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگی تھی۔

"اچھا! آفاق مجھے بلانے آیا تھا؟" میں مصنوعی حیرانی سے بولی۔ "مگر اس نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ میرا ہی آنے کا دل ہوا تو میں چلی آئی۔" میں فرائے سے جھوٹ بولتی ان کے پاس والے صوفے پر آ بیٹھی۔ آفاق کو اتنی سزا تو ملنی ہی چاہیے تھی میرا ماسک وقت سے پہلے دھلوانے کی۔

"اور وہ کہہ رہا تھا کہ نیلی اس سے چھپی ہے۔ آنے دو اسے۔ آج تو میں اس کی اچھی خبر لیتی ہوں۔" مامی بے چاری غصے سے بھڑک اٹھیں۔ میں نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اس لڑکی کو دیکھا، جس کے نقوش مجھے کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ مگر ذہن پر زور دینے کے باوجود جب مجھے کچھ یاد نہیں آیا تو میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"کون ہیں آپ؟" یہ ایک ایسا سوال ہے جو کسی اجنبی سے کرتے ہوئے لہجہ کتنا بھی مہذب اور شائستہ کیوں نہ ہو، اسے کسی پتھر کی طرح ہی لگے گا۔ میرا یہ سوال سن کر اس کی آنکھوں میں بھی واضح ناگواری اتر آئی تھی، مگر تڑپنے کا مظاہرہ اس نے نہیں، مامی نے کہا۔

"باؤلی ہوئی ہو نیلی۔۔۔ تم انعمتہ کو نہیں جانتیں' جو یہ سوال کر رہی ہو؟"

"کون انعمتہ؟" میں نے ہکا بکا ہو کر باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔

"میری بھانجی۔" مامی نے ماتھا پیٹا۔

"آپ کی بھانجی۔" میں نے الجھ کر دہرایا۔ "مگر مامی۔۔۔ میں نے تو آپ کی اکلوتی بہن کی دونوں بیٹیوں کو دیکھ رکھا ہے اور کچھ عرصہ پہلے تک تو وہ ایسی بالکل نہیں تھیں۔"

"تم کیا آج گھاس کھا کر آئی ہو نیلی؟" مامی زچ ہوئیں۔ "میں نے کب کہا کہ یہ فاطمہ کی بیٹی ہے۔ یہ میری خالہ زاد بہن نرگس کی بیٹی ہے۔ پہلے یہ لوگ یہیں رہا کرتے تھے اور بچپن میں تو تم اس کے ساتھ کھیلتی بھی رہی ہو۔ کیا اتنی جلدی بھول گئیں؟" انہوں نے وضاحت کی اور ان کی اس وضاحت میں مجھے دو لفظ بے حد پسند آئے تھے اور وہ الفاظ تھے "اتنی جلدی۔" یعنی وہ مانتی تھیں کہ میرا بچپن گزرے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ خیر! اب میری سمجھ میں آگیا تھا کہ اس کی صورت مجھے اتنی جانی پہچانی کیوں لگ رہی تھی۔ میں نے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ سجا کر اسے دیکھا۔

"مجھے اپنی بچپن کی دوست سے مل کر اچھا لگا۔۔۔" یہ صرف ایک رسمی جملہ تھا ورنہ مجھے اپنے اور اس کے بیچ کھیل کود کا وہ عرصہ بالکل یاد نہیں تھا' جو مامی یاد دلا رہی تھیں۔

"مجھے بھی اچھا لگا۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ کافی خاموش طبع لگتی تھی۔

"اچھا مامی! آپ بتائیے' آپ کیوں بلا رہی تھیں۔" میں ان کی جانب متوجہ ہوئی۔ "اور ذرا جلدی کہیے' میں امی سے پانچ منٹ میں آنے کا کہہ کر آئی ہوں۔" میں نے ایک اور جھوٹ بولا' اس لیے نہیں کہ مجھے جھوٹ بولنا پسند ہے' بلکہ اس لیے کہ اگر میں ان سے بات نہ کہتی تو وہ شام تک مجھے یہیں بٹھائے رکھتیں۔

"کیا ضرورت تھی اپنی ماں سے یہ بات کرنے کی؟ اب بھلا میری بات پانچ منٹ میں ہو سکتی ہے۔" ان کی تیوریاں چڑھیں' لہجہ معترض ہوا۔

"خالہ۔۔۔ میں یہ برتن لے جاؤں۔" انعمتہ بول اٹھی۔

"ہاں۔۔۔ لے جاؤ اور نیلی کے لیے ایک کپ چائے بھی لے آنا۔" مامی مہمان داری کی بالکل قائل نہ تھیں۔ ان کے گھر اگر رویتا ملک بھی آجاتی تو وہ اسے بھی اپنے گٹے گوڈوں اور جگر پھیپھڑوں کی نہ جانے کون کون سی بیماریاں گنوا کر کچن میں برتن مانجھنے اور روٹیاں بیلنے پر لگا دیتیں۔

"مامی۔۔۔ یہ کب آئی اور کہاں سے۔۔۔ اچانک؟" اس کے جاتے ہی میں رازدارانہ انداز میں ان سے دریافت کرنے لگی۔

"اچانک نہیں آئی۔ میں نے ہی اسے بلایا ہے۔ یہ بھی مہربانی ہے اس کی ماں کی کہ میرے ایک بار کہنے پر ہی اسے اتنی دور کراچی بھیج دیا۔"

"اتنی دور سے مطلب کیا ہے مامی؟ حیدر آباد سے آئی ہے' ناروے سے نہیں۔" میں بدمزا ہوئی۔ "خیر! یہ بتائیے آپ نے اسے بلایا کیوں؟"

"تم تو یوں پوچھ رہی ہو جیسے تمہیں میری حالت پتا نہ ہو۔ جوڑوں کے درد نے اٹھنا بیٹھنا محال کر دیا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر الگ جان نہیں چھوڑتا اور۔۔۔" وہ پھر سے اپنی بیماریوں کی فہرست گنوانے لگی تھیں' میں زچ ہو گئی۔

"مامی پلیز۔۔۔ جانتی ہوں میں آپ کی یہ تمام بیماریاں۔۔۔ آپ یہ بتائیے آپ نے اسے کیوں بلایا۔"

"بہت بولتی ہو تم نیلی۔۔۔ دوسروں کو تو بولنے ہی نہیں دیتیں۔" وہ میرے بیچ میں بات کاٹ دینے سے خفا ہوئیں۔

"تم سے اچھی تو وہ انعمتہ ہے۔ مجال ہے جو بڑوں کے آگے منہ سے بھاپ بھی نکالے۔"

"مامی۔۔۔" میں تاسف اور تحیر سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ "ابھی اسے آئے دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے اور آپ کے لیے وہ مجھ سے اچھی بھی ہو گئی۔"

"ارے۔۔۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔" وہ یکایک گڑبڑا سی گئیں۔ "ایک تو آج صبح سے ہی میرا دماغ الٹا ہوا ہے۔ تم چھوڑو یہ سب۔ میں تم سے کچھ اور کہنے والی تھی۔ وہ میں نے تمہاری ماں کو کہلوایا تو تھا' لیکن اگر وہ بھول گئی ہو تو تم اسے یاد دلا دینا۔" سٹپٹا کر بات بدلنے کی کوشش میں انہوں نے جو اوٹ پٹانگ سا کہا' وہ میرے سر پر سے گزر گیا اور میں مزید چڑ گئی۔

"ویسے آپ نے امی کو کیا کہلوایا تھا؟" میں نروٹھے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"یہی کہ وقت سے تیار ہو جائے۔ مانا کہ آمنہ میری سہیلی ہے' مگر عین کھانے کے وقت ان کے گھر پہنچنا بالکل مناسب نہیں۔ اس کی تو عادت ہے' پہلے سے اطلاع کرو تو ہر دو منٹ بعد فون کر کے آنے کا وقت پوچھتی ہے۔"

"انہوں نے آپ کو دعوت پہ بلایا ہے؟" میں کافی حیران ہوئی۔ امی نے تو مجھ سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

"نہیں بھئی!" انہوں نے بے زاری سے ہاتھ ہلایا۔ "رشتہ پکا کرنے جا رہے ہیں۔" انہوں نے کہا۔ میں ہونقوں کی طرح منہ کھولے انہیں دیکھتی رہی۔

"کس کا۔۔۔ رشتہ۔۔۔؟" کافی دیر بعد میرے لبوں سے آواز نکلی' بے حد ہلکی سی۔

"ارمان کا' اور کس کا۔۔۔ اور انعمتہ کو بھی میں نے اسی لیے بلایا ہے۔ رشتہ پکا ہو جائے تو منگنی کے سو جھمیلے' سو کام اور میں تو کچھ کرنے جوگی نہیں۔ اب تم اور انعمتہ مل کر سارے کام کر لینا۔" وہ بڑے اطمینان سے بولیں اور اشتعال کے باعث مجھے اپنے کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہوا۔

"جی ضرور۔۔۔ سارے کام میں ہی تو کروں گی ارمان بھیا کی منگنی میں۔" میں اس وقت ضبط کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی' سو وہی کر رہی تھی۔

"ویسے انعمتہ ہے بڑی پھرتیلی۔۔۔ آتے ساتھ ہی سارا گھر چمکا ڈالا۔"

"ہاں۔۔۔ نمبر جو بڑھانے تھے۔" میں کڑھی۔

"ویسے اسے بلانے کا میرا ایک مقصد اور بھی تھا۔" وہ سرگوشیانہ انداز میں بولیں تو میں غصے میں ہونے کے باوجود چونک گئی۔

"کیا۔۔۔؟"

"فرخ کے مزاج کا تو تمہیں پتا ہے۔ اتھرا بیل ہے' نکیل ڈالنے بھی کوئی پاس نہیں جا سکتا اور مجھ سے تو اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ دیکھے بغیر' لڑکی کو جانے بغیر وہ شادی نہیں کرے گا۔۔۔ تو اچھا ہے جب تک یہ یہاں ہے' فرخ بھی اسے جان لے۔ مجھے تو یہ لڑکی شروع سے ہی بہت پسند رہی ہے۔ بس فرخ کو بھی پسند آجائے۔"

اتنا کچھ سننے کے بعد بھی میرا وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز بنتا تھا؟ بالکل نہیں۔ میں تو حیران اس بات پر تھی کہ میں کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ کیوں نہیں پڑی۔

"بس مامی۔۔۔ میرے پانچ منٹ ختم ہوئے۔" میرے ضبط کی حد پار ہو چکی تھی۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا! ٹھیک ہے' مگر اپنی ماں کو یاد دلا دینا کہ وقت سے پہنچنا ہے اور۔۔۔ ارے۔۔۔ لو دیکھو۔" انہوں نے بے اختیار ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "میں نے تمہیں بلایا کس لیے تھا' وہ تو سن لو۔"

"بتائیے۔" کاش! وہ اس وقت میرے دل میں جھانک سکتیں۔

"ہم تو کل وہاں جا رہے ہیں تو تم آکر ان کے لیے کھانا بنا دینا۔ ویسے تو میں ان کو ہوٹل سے منگوانے کا

کہہ دیتی مگر ارمان کو باہر کا کھانا بالکل پسند نہیں اور انعمتہ بھی میرے ساتھ جائے گی تو.....“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ وہ شاید انعمتہ کو ابھی سے اپنی بہو کی حیثیت سے ان سے متعارف کروانا چاہتی تھیں۔ اسی وقت انعمتہ بھی کپ اور تھرماس لیے اوپر چلی آئی۔ وہ بھی میرے پانچ منٹ ختم ہونے کے انتظار میں تھی شاید۔ پھر مامی کے روکنے کے باوجود میں مزید ٹھہرے بنا نیچے آگئی اور ٹھیک اسی وقت جب میں دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی، معید کی تیز آواز نے مجھے اچھلنے پر مجبور کردیا۔

”نیلی کی بچی! تم نے مجھ سے چائے بنانے کا کہا تھا۔ اب کہاں بھاگ رہی ہو چھپتے چھپاتے؟“

”بکواس بند کرو۔“ میں تو جیسے پھٹ ہی پڑی۔ ”میں کوئی چھپتے چھپاتے نہیں بھاگ رہی تھی۔ سمجھے! اتنا ہی مرے جا رہے تھے چائے کے پیچھے تو اپنی اس کزن سے کیوں نہیں کہا، جب وہ نیچے آئی تھی؟“ میں نے دانت پیسے تھے اور وہ آنکھوں میں بے یقینی لیے حق دق سا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے اتنی چھوٹی سی بات پر میرے اتنے شدید رد عمل کا اس نے کب سوچا ہوگا۔

”بھاڑ میں جاؤ اور خبردار..... جو آئندہ مجھ سے چائے بنانے کا کہا تو.....“ میں پیر پٹختی باہر نکل آئی تھی۔ جس غصے کا اظہار میں نے معید کے سامنے کیا تھا، وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اندر سے تو میں جیسے ابل رہی تھی۔ ویسے اچھا تھا۔ معید کو تو تھوڑا سبق سکھا دیا۔ وہ بھی تو مامی کا ہی بیٹا تھا۔ مامی نہ سہی ان کا بیٹا ہی سہی۔

☼ ☼ ☼

”تم جیسی بے وقوف لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔“ میں بستر پر اوندھی پڑی تکیے میں منہ دیے لیٹی تھی اور صبا میرے سامنے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی سرخ رسیلے تربوز سے ہونٹ سرخ اور گریبان تر کرتے ہوئے وقتاً ”فوقتاً“ مختلف جملے میرے کانوں میں انڈیل رہی تھی۔

”کوئی کسی پر اپنی خدمتیں، اپنی خوشامدیں نچھاور کرتا بھی ہے تو اس کے تیور دیکھ کر، مگر تمہاری قسمت تو اس سیلزمین جیسی نکلی جو باچھیں چیر کر بھی، اپنا کوئی پروڈکٹ بیچے بغیر گاہکوں سے لاتیں کھا کر ہی ان کے گھر سے نکلتا ہے۔“ ایسی گھٹیا اور دل جلانے والی مثالیں صرف صبا ہی دے سکتی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر بے زاری سے اسے دیکھا۔

”دفعہ..... تم یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتیں؟“ ایک تو پہلے ہی میں جلتے توے پر بیٹھی تھی اور بجائے وہ مجھ پر پانی ڈالنے کے مزید آگ بھڑکا رہی تھی۔

”میں تو تم سے ہمدردی کرنے آئی تھی۔ آخر بہن ہو میری۔ تمہارے دکھ پر میں دکھی نہیں ہوں گی تو اور کون ہوگا۔“

”میں کوئی دکھی ودکھی نہیں ہوں، سمجھیں؟ اور اللہ نہ کرے کہ میں کبھی دکھی ہوں بھی۔ میں صرف غصہ ہوں، شدید غصہ اور یہ غصہ مجھے خود پر آرہا ہے اور..... اور میرا جی چاہ رہا ہے..... میرا جی چاہ رہا ہے میں خود کو زہر دے دوں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم خود کو زہر نہیں دے سکتیں۔ وہ کام میں کرلوں گی، تم یہ بتاؤ! تربوز کھاؤ گی؟ ٹھنڈا ہے، تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ شاید میری حالت اس وقت کچھ زیادہ ہی قابل رحم ہو رہی تھی، ورنہ صبا سے ایسی فراخی کی امید رکھنا بھی فضول تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر چھیننے کے انداز میں اس سے باؤل لیا۔

”میں نے سوچ لیا ہے۔ آئندہ میں ان کے گھر جھانکوں گی بھی نہیں۔ ان کا کوئی کام کرنا تو بڑی بات ہے اور مامی کی باتیں تو سنو۔ کل وہاں جا کر ان کے لاڈلے سپوتوں کے لیے کھانا بنا دوں۔ ارمان کو باہر کا کھانا پسند نہیں..... نوکر لگی ہوں نا ان کی۔“ شدید طیش میں، میں تربوز کے ٹکڑے ایک کے بعد ایک نگل رہی تھی۔ مگر ٹھنڈے میٹھے تربوز سے بھی میرے غصے کا کچھ نہیں بگڑ رہا تھا۔

”تم نے ہی ان کی عادتیں خراب کی ہیں۔ ان کے ایک بلاوے پر جاتی تھیں نا، بھاگ بھاگ کر۔ اب بھگتو۔“

”اب میں نہیں بھگتوں گی۔ اب انہیں بھگتنا پڑے گا۔ نہیں جاؤں گی میں ان کے گھر۔ چاہے ایک بار بلائیں، چاہے سو بار۔“ باؤل خالی ہو گیا تھا۔ میں نے تربوز کے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈبو دیا۔

”اب انہیں تمہاری ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ ویسے بھی دو، دو بہوئیں آجائیں گی ان کی تو پھر وہ کہاں گھاس ڈالیں گی تمہیں۔“ صبا نے مجھے آئینہ دکھایا، بلکہ میری اوقات بتائی۔

”جب تک نہیں آئیں گی، تب تک تو کام تو پڑے گا نا..... بھول جائیں، اب نیلی کو۔ میں تو اب مر کر بھی ان کا کوئی کام نہیں کروں گی۔“ میں سلگ سلگ کر دھواں ہوئی جا رہی تھی۔

”مامی سے مجھے اس قدر خود غرضی..... بے مروتی اور مفاد پرستی کی امید بالکل نہیں تھی۔ تم بچپن سے ان کے سامنے رہی ہو۔ ان کے کام آئی ہو۔ ان کا گھر سنبھالتی رہی ہو۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک بار بھی تمہارے بارے میں نہیں سوچا۔ چلو! ارمان بھائی کے لیے انہیں اپنی سہیلی کی بیٹی پسند آ بھی گئی تھی تو کم از کم فرخ کے لیے تو تمہارا سوچتیں۔ مگر انہوں نے تو فرخ کے لیے بھی اپنی بھانجی کو یہاں بلوالیا، تاکہ ان کا نور نظر اسے دیکھ سکے۔ اسے انڈر اسٹینڈ کر سکے اور تمہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا۔“ اسی پل فیصل نے اندر جھانکا۔

”نیلی آپی..... آپ کو دادی بلا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں آکر ان کے پیر دبا دیں۔“

”نہیں.....“ مجھ پر یہ سن کر ہی تھکن طاری ہو گئی۔ دادی کو رات سونے سے پہلے یہ عادت میں نے ہی ڈالی تھی۔ مگر آج میرا دل حد سے زیادہ بے زار تھا۔ مجبوراً صبا سے فریاد کی۔

”صبا..... تم چلی جاؤ پلیز..... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

"سوری! مجھ سے تو ہلا بھی نہیں جا رہا اور پھر نیند بھی بہت زوروں کی آ رہی ہے۔ تمہیں بلایا ہے۔ تو تم ہی جاؤ' ویسے بھی بزرگوں کی خدمت کو منع نہیں کرتے۔ گناہ ملتا ہے۔" تو ناچشمی میں اس نے مامی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

"ہلا نہیں جا رہا یا پھنس گئی ہو صوفے میں... کم کھایا کرو' تاکہ وزن کچھ کم ہو' موٹی!" غصے اور جھلاہٹ سے کہتے ہوئے میں نے اٹھ کر سلیپرز میں پیر گھسائے اور دادی کے کمرے میں چلی آئی۔

امی بھی وہیں موجود تھیں اور موضوع گفتگو وہی تھا۔ میری دکھتی بلکہ تڑپتی پھڑکتی رگ۔

"میں کہتی ہوں فاخرہ... تمہارے بھائی کو تمہارا ذرا خیال نہ ہوا۔ ذرا شرم نہ آئی۔ جو اپنی سگی بہن کو چھوڑ کر اپنی پھاپھا کٹنی بیوی کی سہیلی سے رشتے داری جوڑلی؟ زن مرید مرد تو بڑے دیکھے ہیں' مگر تیرے بھائی جیسا نہ دیکھا' نہ سنا۔" دادی کو مامی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں اور اب تو انہیں بولنے کا سنہری موقع مل گیا تھا۔ امی بے چاری جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ کرتی تھیں۔ وہی کر رہی تھیں' یعنی صرف منمنانے کا کام۔ میں دادی کے نرم نرم بستر پر چڑھی' اور ان کے پیر دبانے لگی۔

دادی نے ایک نظر مجھے دیکھا' پھر سے امی کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گئیں۔ ایک تو آج ویسے ہی میرا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ طبیعت مکدر تھی اور اس وقت دادی کے نرم بستر پر اے سی کی خنکی میں مجھے کب نیند کی جھپکیاں آنے لگیں۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا اور میں وہیں لڑھک گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی! رات کے کھانے میں کیا بنانا ہے؟" امی جو اس وقت ہلکے سبز رنگ کے چکن کاٹن کے سوٹ میں بڑی باوقار سی لگ رہی تھیں۔ اپنے سونے کے کڑوں کے کیس کو درازوں میں ڈھونڈتے ہوئے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈال کر بے زاری سے گویا ہوئیں۔

"کچھ بھی بنا لو۔ تمہیں ہی کھانا ہے۔ ہم تو کھا کر آئیں گے۔"

"اچھا امی... جا ہی رہی ہیں تو لڑکی کی تصویر لے کر آیئے گا۔ آخر ہم بھی تو دیکھیں۔ کون ہے مامی کا گوہر مقصود۔"

"کیوں... تم نے آمنہ کو نہیں دیکھا؟" امی ایک دم چونکیں۔

"تو کیا ارمان' بھیا کا رشتہ آمنہ آنٹی سے پکا ہو رہا ہے؟" میں حیران بھی ہوئی اور مشکوک بھی کہ مامی نے اپنی سہیلی کی بیٹی کہا تھا یا اپنی سہیلی۔

"اول فول ہی بکے جانا۔ میرے کہنے کا مطلب تھا آمنہ کی بیٹی بالکل آمنہ پر پڑی ہے۔ وہی ناک نقشہ' وہی لٹھ مار لہجہ' وہی بمشکل کانوں تک آتے بال۔"

"کیا... اتنے چھوٹے بال ہیں۔" میں تو چلا ہی اٹھی۔ "سچ مچ اتنے چھوٹے۔"

"ہاں... مگر اس میں قصور اس بے چاری کا بھی نہیں ہے' یہ گنج پن کی موروثی بیماری ہے۔ بے حد کھردرے' ہلکے بدرنگ سے بال۔ کٹوائیں نہ تو اور کیا کریں۔" امی نے وجہ بتائی اور میں بے اختیار اپنی لمبی موٹی چٹیا کی نزاہٹ محسوس کرنے لگی۔

"لیکن امی! بے چارے ارمان بھیا... انہیں تو لمبے بال پسند ہیں۔" مجھے افسوس ہوا۔

"اس کی پسند کا خیال اس کی ماں کو رکھنا چاہیے تھا۔ تم کیوں فکر کر رہی ہو؟ ویسے بھابھی نے ارمان سے پوچھ کر ہی یہ رشتہ کیا ہوگا۔ اتنا فرماں بردار وہ بھی نہیں ہے کہ ماں کے ایک بار کہنے پر سر جھکا دے۔" امی کچھ غصے سے بڑبڑاتی باہر نکل گئیں۔

صبا اس وقت کوچنگ سینٹر اور فیصل کہیں آوارہ گردیوں میں مشغول تھا۔ میں اپنے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔

"نیلی! کہاں ہو تم؟"

اپنے لیے چائے بنا کر کپ ہاتھ میں لیے جب میں اپنے پسندیدہ ناول کے ایک سنسنی خیز موڑ پر تھی۔ آفاق کی آواز نے سارا موڈ غارت کر دیا۔

"اف کہاں چھپوں۔" میں نے کوفت سے سوچا۔ باہر کا دروازہ میں بند کرنا بھول گئی تھی۔ اسی لیے اب یہ مصیبت تو مجھے جھیلنی ہی تھی۔

"یہ سارا گھر بھائیں بھائیں کیوں کر رہا ہے؟" وہ اندر آیا اور عین میرے سامنے بیٹھ کر حیرانی سے استفسار کرنے لگا۔

"مجھے تو کوئی آواز نہیں آ رہی۔" میں نے چائے کا بڑا سا گھونٹ لیا اور اگلے ہی پل میری زبان بھی جلی اور میرا حلق بھی' دل تو خیر ویسے ہی ان دنوں تپتی بھٹی بنا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" میری آنکھوں میں شاید پانی بھر گیا تھا۔ وہ تشویش کا شکار ہو گیا۔

"کچھ نہیں۔ تم کیوں آئے ہو' وہ پھوٹو۔" اب میں مامی کی فیملی کے کسی بھی فرد کو برداشت کرنے کی روادار نہیں تھی۔ اس کا منہ کچھ حیرت سے کھلا۔ پھر منہ بند ہو گیا۔

"امی کہہ رہی تھیں کھانا تم آکر بناؤں گی۔ اگر تم وہاں آجاتیں تو مجھے پوچھنے کے لیے یہاں نہ آنا پڑتا۔" وہ چوکھٹ سے ٹیک لگائے میری طرف دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔ میرے دل میں ناگواری کی ایک بھرپور لہر اٹھی۔ کیا میں ان کی نوکر تھی۔ صبا ٹھیک کہتی ہے' ہمیں نے ہی ان کی عادتیں خراب کی ہیں۔

"دیکھو! میری بات سنو۔" میں نے چولہے کی آنچ دھیمی کی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر روکھے لہجے میں گویا ہوئی۔ "تم دیکھ رہے ہو' ہمارے گھر میں بھی کوئی نہیں ہے۔ صبا ابھی آ ضرور جائے گی' مگر وہ کوئی کام کرتی نہیں ہے۔ یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو' اسی لیے میری طرف سے مشورہ یہی ہے کہ تم لوگ آج باہر سے کھانا منگوا لو۔ میں اپنا گھر اکیلا چھوڑ کر تمہارے ہاں تمہارا کھانا بنانے نہیں آسکتی۔"

"تو تم نے یہ بات پہلے ہی امی سے کیوں نہیں کی؟ وہ جاتے ہوئے کم از کم ہمارے لیے کھانا تو بنا جاتیں۔" وہ بوکھلایا۔

"نیلی! ایک کپ چائے میرے لیے بھی۔" اسی وقت صبا پھولی سانسوں اور گلابی چہرے کے ساتھ کچن میں داخل ہوئی۔

"ارے! تم کب آئیں۔" میں حیران تھی۔

"سال بھر پہلے۔" وہ تپی۔ "ظاہر ہے' ابھی آئی ہوں اور یہ تم کیا دروازے میں سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو' ہٹو سامنے سے۔" اس نے آفاق کو دیکھ کر منہ بنایا۔

"یہ تم پڑھنے گئی تھیں یا میراتھن ریس میں حصہ لینے۔" اس کی اتھل پتھل سانسوں اور تمتماتے چہرے کو دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"یہ... یہ... سب تمہارے بھائی کی وجہ سے۔" فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے آفاق کے پوچھنے پر وہ یکایک بھڑ گئی۔ "اس نے... نے آج میرا حشر کر دیا۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔" روہانسے لہجے میں کہہ کر اس نے بوتل منہ سے لگائی اور آدھی بوتل ایک سانس میں ہی خالی کر دی۔

"کیا ہوا...؟ کہیں اس بار اس نے تمہارے پیچھے کتے تو نہیں چھوڑ دیے؟" چائے کا کپ آفاق کو پکڑاتے ہوئے میں باہر برآمدے میں آگئی۔ گرمی ان دنوں اپنے جوبن پر تھی۔ کچن میں آگ کے سامنے پانچ منٹ بھی کھڑے رہنا بھی پسینے میں شرابور کر دیتا تھا۔ میں نے دوپٹے سے اپنا چہرہ پونچھا۔

"میں آج کچھ لیٹ ہو گئی تھی۔" وہ بتاتے ہوئے آکر دھم سے سامنے کرسی پر بیٹھی۔

"اور اس نے تمہیں سزا کے طور پر بھاگتے ہوئے علاقے کے دو چار راؤنڈ لگانے کا کہہ دیا۔" آفاق نے اندازہ لگایا۔

"نہیں۔" صبا نے کچھ غصے سے تردید کی۔ "جب میں کلاس میں گئی تو وہ جنگلی مجھ سے پہلے موجود تھا اور پڑھانا شروع کر چکا تھا۔"

"حد ادب لڑکی! وہ تمہارا استاد ہے۔ کیا استادوں کے ادب و احترام کے پڑھے گئے سارے سبق تم بھول گئیں؟" آفاق نے پھر بیچ میں اسے ٹوکا۔ چند لمحے اس کی بات سننے کے انتظار میں' میں وہیں کھڑی رہی' پھر

کچن میں چلی آئی کہ صبا جتنا اونچا بولتی تھی اس کی آواز سات سمندر پار بھی سنی جاسکتی تھی' کچن تو پھر بالکل پاس ہی تھا۔ دوسرے وہ چھوٹی سی چھوٹی بات کو بھی بہت لمبا کردیتی تھی۔ فضول کا سسپنس پھیلاتی' رک رک کر ڈرامائی توقف کرتی۔ ایک جگہ ٹک کر صبرو تحمل سے اس کی الف لیلیٰ داستان سننا بڑے دل گردے کا کام تھا اور میرے پاس نہ ایسا دل تھا اور نہ ایسا گردہ۔

"پہلے تو اس نے میرے "مے آئی کم ان سر!" کے جواب میں میرے لیٹ آنے پر ایک گھنٹہ بکواس کی اور جب کھڑے کھڑے میری ٹانگیں سن ہونے لگیں' میری کمر میں درد ہونے لگا اور پسینے سے میرے سر میں شدید کھجلی ہونے لگی تو اس نے مجھے اندر آنے کو کہا۔" اس نے ایک بار پھر رک کر توقف کیا اور آفاق بے تابی سے پھر بول اٹھا۔

"معید نے تمہیں ایک گھنٹہ کھڑا رکھا؟"

"نہیں۔" صبا نے اس کی بات کے جواب میں پھر "نہیں" کا نعرہ بلند کیا۔ میں اس وقت تھال میں چاول نکال رہی تھی۔ اس "نہیں' نہیں" کی گردان پر مجھے شدید غصہ آیا۔

"یہ لڑکی ایک ہی بار میں ساری بکواس کیوں نہیں کرلیتی۔" میں نے تنگ کر سوچا۔

"جب میں اپنی سیٹ تک آئی تو اس نے مجھے روک دیا اور دوبارہ واپس دروازے تک جانے کا کہا۔"

"ہائیں... وہ کیوں؟" آفاق کے ساتھ ساتھ اندر میں بھی حیران ہوئی۔

"بقول اس کے پاؤں گھسیٹ کر چلتی ہوں۔" اس نے بتاتے ہوئے دانت پیسے گویا معید اس کے دانتوں میں دبا ہو۔ "چپل گھسٹنے کی آواز ذہنی کوفت کا باعث بنتی ہے۔ دھیان بٹتا ہے اور اسٹوڈنٹس ٹھیک سے پڑھ نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ یہ ایک غیر اخلاقی اور غیر شائستہ حرکت ہے۔ مہذب لوگ اور باتہذیب اسٹوڈنٹس اس قسم کی حرکات سے اجتناب کرتے ہیں۔ یہ جاہلیت اور گنوارپن کے مظاہرے نہ کلاس میں زیب دیتے ہیں' نہ کسی پبلک پیلس پر۔" وہ برہمی سے بولتی جارہی تھی۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ یہ کام تو معید نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ صبا کی اس عادت سے تو میں بھی عاجز تھی۔ وہ دس کلو میٹر دور بھی ہوتی تو اس کی چپل کی بھیانک چرچراہٹ مجھ تک پہلے پہنچ جاتی اور یہ آواز جس قدر میرے اعصاب پر گراں گزرتی تھی' میں بتا نہیں سکتی۔ یوں جیسے سیمنٹ کی دیوار پر کوئی ناخنوں سے کھروچیں ڈال رہا ہو۔

"اور جانتے ہو' اس نے ایک نہ دو پورے پندرہ' بیس بار مجھ سے یہ پریڈ کروائی اور کہنے لگا "ہمارا آج کا سبق یہی ہے' پاؤں گھسیٹ کر چلنے کے کیا نقصانات ہیں۔ آپ کے ایک دن کی پڑھائی برباد ہو سکتی ہے۔ آپ کے پیروں پر ورم آسکتا ہے۔ آپ کو سانس لینے میں دقت ہو سکتی ہے۔" وہ یہ سب میری حالت دیکھ کر کہہ رہا تھا اور پتا ہے' سارے اسٹوڈنٹس مجھ پر ہنس رہے تھے۔" وہ رونے کے قریب ہوگئی۔

"اور چھٹی ہونے پر وہ اپنی بائیک چھوڑ کر پیدل میرے ساتھ یہاں تک آیا کہ کہیں میں اپنی چال دوبارہ نہ بدل لوں اور اس کے ڈر سے میں گھر کس طرح پہنچی ہوں' یہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔"

وہ بتارہی تھی اور تب ہی مجھے سمجھ میں آیا کہ اس کے گھر پہنچنے تک میں اس کی آمد سے بے خبر کیسے رہی۔ مجھے بے اختیار اپنی چھوٹی بہن پر پیار سا آگیا۔ خیر... دیکھا جاتا تو قصور سارا معید کا بھی نہیں تھا۔ اتنا سبق تو صبا کو ملنا ہی چاہیے تھا۔ وہی پرجوش ہو رہی تھی' اس اکیڈمی میں ایڈمیشن لینے کے لیے کیونکہ معید ماسٹرز کرنے کے بعد وہاں عارضی طور پر فرسٹ ایر اور سیکنڈ ایر کو انگلش پڑھانے لگا تھا۔ صبا خوش ہو رہی تھی یہ سوچ کر کہ معید اس کی مدد کرے گا۔ اسے نوٹس بنا کردے گا۔ ایگزامز میں اس کے لیے نقل کے پھرے بھی وہی تیار کرے گا اور کلاس روم میں اس تک پہنچائے گا بھی۔ ایک ٹیچر کی کزن ہونے پر جو جو رعایتیں مل سکتی ہیں' وہ سب صبا کے دھیان میں تھیں' مگر سچ تو یہ تھا کہ معید نے اس کا ناک میں دم

کرکے رکھ دیا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا' جب اس کے لبوں پر معید کے خلاف کوئی شکایت نہ ہوتی۔ یوں لگتا تھا جیسے کزن ہونے کی وجہ سے معید نے اسے خاص نشانے پر رکھا تھا اور آج تو اس نے حد ہی کردی۔ میں نے سوچ لیا' معید سے صبا کا بدلہ اب میں لوں گی۔

☆ ☆ ☆

رات کو ماموں اور مامی بھی ہمارے گھر آگئے۔ یعنی لڑکی والوں کے گھر سے سیدھے ہمارے گھر... اور ظاہر ہے ان کے ساتھ انعمتہ بھی تھی۔ اس دن کی نسبت سیاہ رنگ کے لباس میں آج وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ مگر ہمیشہ کی طرح چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ لیے۔ صبا اس سے باتیں کرنے کی کوششیں کررہی تھی۔ کوشش اس لیے کہ میں نے ابھی تک انعمتہ کے ہونٹ ہلتے ہوئے نہیں دیکھے تھے اور صبا کی آواز تھی کہ ڈرائنگ روم کے دوسرے کونے پر باتوں میں مصروف دادی اور ماموں بھی ڈسٹرب ہونے لگے تھے۔

میں چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی آئی۔ تھکن تو بہت تھی مگر صبا مر کر بھی نہیں اٹھے گی' یہ مجھے معلوم تھا۔ مامی اور امی برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ مامی کو ابھی تک پتا ہی نہیں تھا کہ میں ان کی ہدایت نظرانداز کرچکی ہوں۔ اس لیے انہیں مجھ پر کافی پیار آرہا تھا۔

"رہنے دو نیلی! چائے مت بناؤ' پہلے ہی اتنی تھک گئی ہو۔ ویسے بھی ہم تو وہاں سے پی کر آرہے ہیں۔" انہوں نے مجھے کچن کی طرف آتے دیکھ کر کہا تھا۔

"کوئی بات نہیں مامی! دوبارہ پی لیجیے گا۔ آپ کو پسند ہے نا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اثبات میں سرہلا کر رہ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد انہیں چائے دے کر میں اپنا کپ لیے اپنے کمرے میں آگئی بھی تو بے مروتی' مگر سچ تو یہ تھا میرا وہاں بیٹھنے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ صبا تو موجود تھی ہی انعمتہ کو کمپنی دینے کے لیے۔ اسی لیے بھی میں نے زیادہ پروا نہیں کی اور اس وقت جب میں اپنی سوچوں میں غرق تھی۔ معید کی آواز میرے بالکل قریب گونجی۔

"ہائے!" میں بے تحاشا اچھل پڑی اور اس پر نظر پڑتے ہی میرے لب ناگواری سے بھنچ گئے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟"

"کیا...؟" اس نے استفہامی انداز میں بھنویں اچکائیں۔ جینز پر براؤن کرتا پہنے آستین چڑھائے اپنے مسلز کی نمائش کرتا' دھیرے سے مسکراتا وہ میرا تاؤ بڑھانے لگا تھا۔ بال ہمیشہ کی طرح ماتھے پر بکھرے تھے۔ سرمئی سی گہری آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی بکھری تھی۔ رنگت تمتما رہی تھی۔ وہ شاید ابھی سو کر اٹھا تھا۔ اس کی بے ترتیب شخصیت کی طرح اس کے معمولات بھی بے ترتیب اور الٹے پلٹے تھے۔ نہ کھانے کا کوئی وقت مقرر تھا اور نہ سونے جاگنے کا۔

"تم یہاں کیا کررہے ہو؟" میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو تم کررہی ہو' چائے پینے آیا تھا۔ ہوں نا بڑا ڈھیٹ۔ اس دن ایک کپ چائے کے لیے تم سے اتنی باتیں سننے کے بعد آج تمہارے ہی گھر میں تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پی رہا ہوں۔" اس نے اپنا کپ دکھا کر مجھے جتایا۔

"تمہیں اپنی بھابھی کیسی لگی؟" میں نے اس کا سوال گول کردیا۔ اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو حیرانی ابھری۔ پھر وہ کندھے اچکاتے ہوئے اپنے مخصوص لاپروا انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہی ہوگی' وہ ایک بار ہی ہمارے گھر آئی ہے اور تب بھی میں گھر پر نہیں تھا۔"

"تو تمہیں کوئی اشتیاق نہیں ہے اپنی ہونے والی بھابھی کو دیکھنے کا؟" مجھے اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔

"نہیں... اسے آخر کار ہمارے ہی گھر آنا ہے اور مجھے اکثر اسے دیکھتے ہی رہنا ہے تو اشتیاق کیسا؟" وہ ایسا ہی تھا۔ ٹھس' بے حس اور بے نیاز۔

"اور تمہاری یہ والی کزن کیسی ہے؟" میں نے انعمتہ کے بارے میں اس کی رائے جاننی چاہی۔

"کون انعم؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میں شاکڈ رہ گئی۔

"تو ایک ہی دن میں وہ تمہارے لیے انعم بھی ہوگئی؟" میرے منہ سے بے اختیار یہ نکلا۔

"اس کا نام کافی لمبا ہے، مجھ سے نہیں لیا جاتا اور۔۔۔ تمہیں بھی تو میں نیلی ہی بلاتا ہوں نا۔" اس نے وضاحت دی۔

"مجھے سب ہی نیلی بلاتے ہیں، اگر صرف تم بلاتے تو میں کب کا تم پر بین لگا چکی ہوتی۔۔۔ اور دوسری بات وہ میری جیسی نہیں ہے۔" میں تڑخ گئی۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔ جسے اس نے فوراً" ہی چھپالیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر وہ قدرے جھکتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"وہ واقعی تمہارے جیسی نہیں ہے۔" دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے انداز ایسا تھا جیسے مجھ سے کوئی راز شیئر کررہا ہے۔ "وہ تم سے زیادہ اچھی ہے۔"

مجھے بس چند ہی لمحے لگے تھے غور کرنے میں کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اگلے ہی پل میں کھڑی ہوئی۔ مجھے نہیں پتا اس وقت میرے تاثرات کیسے تھے۔ مگر یقیناً" بہت خوف ناک ہی ہوں گے، تب ہی تو وہ اس قدر گھبرا گیا تھا۔

"نیلی! میری بات سنو۔" میں نے جھپٹنے کے انداز میں ٹیبل پر رکھے وہ دونوں کپ اٹھائے۔ اس کا کپ تو خالی تھا۔ مگر اپنی چائے سے تو میں ایک گھونٹ بھی نہیں لے پائی تھی اور اب میرے غصے سے وہی چائے کپ سے اچھل کر پہلے ٹیبل اور پھر فرش کو داغ دار کرگئی۔ میں تیزی سے کمرے سے نکلی تھی اور وہ بوکھلایا ہوا میرے پیچھے۔

"نیلی! کیا ہوگیا ہے یار! میں تو مذاق کررہا تھا، آئم سوری۔"

اسی وقت جانے کے لیے مامی اور انعمتہ بھی امی اور صبا کے ہمراہ اس طرف کو آئیں اور یہ صورت حال دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"کیا ہوا؟" مامی نے حیرت سے بیٹے کی سمت دیکھا۔ وہ شرمندہ سا ٹھہر گیا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ میں نے چھوٹا سا مذاق کیا اور نیلی ناراض ہوگئی۔" وہ الجھا ہوا سا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"حد کردی ہے معید! مذاق بھی موقع اور اگلے کا موڈ دیکھ کر کرتے ہیں۔ نیلی کو نہیں پسند تو کیوں کیا ایسا مذاق۔" مامی نے اسے گھرک دیا اور امی مجھے گھورنے لگی تھیں گویا سارا قصور میرا ہو۔

میں نظر انداز کرکے کچن میں آگئی اور سنک میں پڑے برتنوں پر نل پوری قوت سے کھول دیا، تاکہ باہر کی کوئی آواز میرے کانوں تک رسائی حاصل نہ کرپائے۔ ایک تو مجھے غصہ آتا جلدی تھا اور جب آتا تھا تو اتنا شدید ہوتا تھا کہ پھر میں ہر قسم کا لحاظ بھول جاتی تھی۔

"آئم سوری نیلی۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا تم اتنا ری ایکٹ کروگی۔" وہ میرے پیچھے ہی کچن میں چلا آیا۔ میں اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ ہتھیلی نل کی تیز دھار کے نیچے کیے میں سلگتے ہوئے لہجے میں بول اٹھی۔

"مجھ پر اپنا ٹائم کیوں ویسٹ کررہے ہو۔ جاکر اپنی سوئٹ کزن کو کمپنی کیوں نہیں دیتے جو مجھ سے زیادہ اچھی ہے۔" پانی کی دھار میری ہتھیلی سے ٹکرا کر چھینٹے میرے لباس اور چہرے پر اڑا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نل بند کردیا۔

"میری سوئٹ کزن تو تم ہو اور تم جیسی کوئی نہیں۔ اس پوری دنیا میں تم جیسی کوئی نہیں۔" ایک ہاتھ سلیب پر جمائے وہ میری طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہنے لگا۔

"اچھا۔" میں نے استہزائیہ انداز میں مسکرا کر اسے دیکھا۔ "اس میں ایک جملہ اور بھی ایڈ کرلو، مجھ جیسی جل ککڑی، جھگڑالو اور حاسد لڑکی۔ دل میں تو یہی سوچ رہے ہوگے نا۔" وہ ہنس پڑا۔

"میں دل میں آئی سوچ زیادہ دیر دل میں نہیں رکھتا۔ اسی لیے۔۔۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ تم صرف تم ہو، تم جیسا دوسرا کوئی نہیں ہوسکتا۔" اس کا لہجہ

بپ تھا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور باہر نکل گیا۔ میں ساکت کھڑی رہ گئی۔ رخسار میں جیسے انگارے دہک اٹھے اور میری نم ہتھیلی میرے رخسار پر بکھر گئی تھی۔

"تم نے معید سے بات کی؟"

میں اپنے بیڈ پر نیم دراز کچھ غائب دماغی کے عالم میں میگزین کی ورق گردانی کررہی تھی، جب صبا نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کس بارے میں؟" میں چونکی۔

"نیلی! تم کتنی گھٹیا ہو، تم نے مجھ سے کہا تھا، تم اسے ٹھیک ٹھاک سنانے والی ہو۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"ہاں۔۔۔ کہنے والی تھی، لیکن اس نے میرے سامنے جو بکواس کی، اس سے میرا دماغ گھوم گیا اور میں نے مزید اس سے کوئی بات نہیں کی۔" یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں اس کے کچھ دیر پہلے کا طرز عمل سوئیاں چبھو رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ وہ میرا وہم تھا اور کچھ نہیں۔" میں نے یہ سوچ کر اپنی بے چینی کم کرنی چاہی۔ معید کے بارے میں، میں ایسا کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی، سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔

"اچھا! ہاں۔۔۔ کیا کہا تھا اس نے؟" وہ فوراً" اپنا دکھڑا بھول کر متجسس ہوگئی۔

"میں نے اس سے انعمتہ کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا، وہ مجھ سے زیادہ اچھی ہے۔ اس دن مامی نے بھی یہی کہا تھا۔ بس مجھے غصہ آگیا۔" میں نے میگزین تکیے کے نیچے گھسایا۔ نیند میری آنکھوں میں اترنے لگی تھی۔

"تو اس میں بھڑکنے والی کون سی بات تھی۔ سچ ہی تو کہا اس نے۔ انعمتہ واقعی بہت اچھی ہے، تم نے خوامخواہ اس بے چاری سے بیر باندھ لیا ہے۔" صبا کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ میں اسے گھورنے لگی۔

"اس سے پہلے کہ میں تم پر بھڑکوں۔۔۔ دفع ہوجاؤ یہاں سے۔"

"تم اس سے جیلس کیوں ہو نیلی! ابھی تو مامی نے فرخ سے اس کا رشتہ پکا بھی نہیں کیا۔ تمہارا چانس ابھی بھی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بھی میرا جی جلانے سے باز نہیں آئی۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں اس پر بھی اور فرخ پر بھی۔" میری آواز بلند ہوئی۔ وہ ہنستے ہوئے اپنے بستر پر گری تھی اور پھر کافی دیر تک ہنستی رہی۔ میں نے تکیے میں منہ چھپالیا۔

☼ ☼ ☼

اس دن شام کو میں نے فیصل کو زبردستی پڑھنے بٹھایا تھا۔ میں بھی یہ کام امی کی گھرکیاں اور جھڑکیاں کھانے کے بعد بادل نخواستہ کررہی تھی اور وہ بھی رسیاں تڑانے کی فکر میں تھا۔ پڑھائی کے معاملے میں وہ بالکل صبا پر گیا تھا۔ ہر سال وہ بمشکل پاس ہوتا اور ماہانہ ٹیسٹوں میں تو اس نے فیل ہونے کا ریکارڈ بنا ڈالا تھا۔

اکلوتے بیٹے کی یہ نالائقی جہاں امی کے لیے لمحہ فکریہ تھی، وہیں ابو بھی ملائیشیا میں بیٹھے دن رات اسی فکر میں گھلتے رہتے۔ فون کرتے تو ان کی آدھی باتیں فیصل اور اس کی پڑھائی سے متعلق ہوتیں۔ پیسے بھیجتے تو علیحدہ سے ایک بڑی رقم اس کے مہنگے اسکول اور ٹیوشن سینٹر کی فیسوں کے لیے ہوتی۔ کچھ ماہ پہلے علاقے کے سب سے مہنگے کوچنگ سینٹر میں اس کا ایڈمیشن کروایا تھا۔ مگر جب اس کا ذرہ برابر اثر بھی اس کی تعلیمی کارکردگی پر نہیں پڑا تو امی کو تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے آفاق کو اس پر نظر رکھنے کو کہا۔

دوسرے دن ہی وہ اسے ٹیوشن سینٹر کے بجائے ویڈیو گیم شاپ سے پکڑ لایا اور اس سے اگلے روز کرکٹ کے گراؤنڈ سے۔ اب امی نے اس کی ذمہ داری مجھے سونپ دی تھی کہ میں بڑی بہن ہوں اور میرے رعب میں بھی ہے تو شاید مجھ سے پڑھ لے۔ اس وقت میں نے اسے ایک مضمون یاد کرنے کو دیا ہوا تھا۔ اسے یاد کرنے کا کہہ کر میں دادی کے لیے چائے

لے کر ان کے کمرے میں چلی آئی۔ امی بھی وہیں موجود تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے انہیں کچھ یاد آیا۔

"نیلی! تم پرسوں بھابھی کے ہاں کیوں نہیں گئیں؟ بھابھی کافی ناراض لگ رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا میں نے تمہیں منع کیا ہے۔"

"تو اچھا کیا نا' نہیں گئی۔ اسے تو مفت کی نوکرانی مل گئی ہے۔ جب جی میں آتا ہے 'بلاوا بھیج دیتی ہے' مگر تم تو کچھ شرم کرلو۔ یہ بیٹیاں کیا تم نے اپنی بھابھی کی خدمت کے لیے پیدا کی تھیں؟"

دادی نے برہمی سے امی کو لتاڑ ڈالا۔

"تمہاری وہ چہیتی بھابھی۔۔۔ بیٹے کا رشتہ کرتے ہوئے تو اسے نیلی یاد نہیں آئی۔ کام پڑتا ہے تو سب سے پہلی پکار نیلی کے نام کی پڑتی ہے۔ میرا بیٹا وہاں پردیس میں اپنی جان اس لیے ہلکان کررہا ہے کہ اس کی بیٹیاں یہاں دوسروں کا جھاڑو پونچھا کرتی پھریں؟" میں نے کن اکھیوں سے امی کی طرف دیکھا۔ ان کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے' کچھ جز بز سی ہو کر بولیں۔

"اماں! بات وہ نہیں ہے۔ بھابھی کہہ رہی تھیں۔ نیلی نے ہامی بھری تھی آنے کے لیے۔ مگر پھر نا معلوم کس وجہ سے نہیں آئی۔ انہیں تو یہی تاثر ملا تا کہ میں نے اسے منع کیا ہوگا۔ صبح و شام تو ان کے گھر پائی جاتی ہے' اس دن بھی چلی جاتی تو کیا ہو جاتا۔"

"میرے سر میں درد تھا امی! اسی لیے نہیں گئی اور آفاق کو میں نے بتا دیا تھا۔" میں دھیرے سے کہہ کر باہر آگئی اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے وجہ پوچھتیں پچھلے دو دن سے وہاں نہ جانے کی۔ ویسے حیرت تھی کہ مامی کے ہاں سے بھی ان دو دنوں میں کوئی بلاوا نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اب تک ارمان بھیا کی منگنی کی تاریخ بھی پکی ہوگئی تھی یا شاید اب ان کے پاس انعمتہ تھی' اس لیے انہیں میری ضرورت نہ رہی تھی۔ خیر! جو بھی تھا میں تو بہت خوش تھی۔ جب میں باہر آئی تو فیصل کو سیل فون پر گیم کھیلتے دیکھ کر میری جان جل گئی۔

"فیصل۔۔۔" میں نے چلا کر اس کے ہاتھ سے سیل چھینا اور ایک زوردار ہاتھ اس کی گدی پر جما دیا۔

"استغفار۔۔۔" اندر داخل ہوتے آفاق نے یہ منظر دیکھ لیا اور اب تاسف سے سر ہلانے لگا۔ "مجھے نہیں پتا تھا' تم اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہو۔ اس معصوم پھول جیسے بچے کو ایسی بے رحمانہ مار۔"

اس کی بکواس پر مجھے غصہ تو بہت آیا۔ مگر میں نظر انداز کر کے فیصل کی جانب متوجہ ہوئی جو گھٹنوں میں سر چھپا کر رونے کا ڈراما کرنے لگا تھا۔ "فیصل! یاد کرو۔۔۔ فیصل۔" اسے سر نہ اٹھاتے دیکھ کر میں نے جھلاتے ہوئے اس کی کمر پر مزید ایک دھپ لگائی۔

"تھینک گاڈ! میں تمہارا بھائی نہیں ہوں' ورنہ تم نے تو میری چمڑی ادھیڑ دینی تھی۔ فیصل! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

"تم یہاں میرے بھائی کو ورغلانے آئے ہو۔" میں لب بھینچے اسے گھورنے لگی۔

"توبہ کرو بھئی۔ میں پاگل ہوں جو اسے تمہارے خلاف ورغلاؤں گا۔ مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے۔" اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔ میرا جی چاہا فیصل کا بھاری بھر کم بیگ اٹھا کر اسے دے ماروں۔

"مجھے تو یہاں امی نے تمہاری خیریت دریافت کرنے بھیجا تھا کہ پچھلے دو دن سے نیلی نہیں آئی۔ دیکھ کر آؤں' کہیں پاؤں میں موچ وچ تو نہیں آگئی' جو لڑکی بخار کی حالت میں ناغہ نہیں کرتی تھی' اس کے پاؤں میں زنجیر صرف موچ ہی ڈال سکتی ہے۔" اس نے نہایت سنجیدہ انداز میں اپنے گھٹیا خیالات مجھ تک پہنچائے۔ میرا بھڑک اٹھنا لازمی تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' میں مری جارہی ہوں تمہارے گھر کے لیے؟ میرا اپنا کوئی کام نہیں ہے؟ اگر میں مامی کے اکیلے پن کا سوچ کر ان کی مدد کے لیے وہاں آجاتی تھی تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تم اسے میرے لیے طعنہ بنا دو۔ ایک تو نیکی کروں۔ اس پر تم لوگوں کی باتیں بھی سنوں۔ ٹھیک ہے! نہیں آؤں گی اب میں تمہارے گھر۔ جا کر کہہ دینا مامی سے۔" غصے سے کہتے ہوئے میں نے انگلش کی کتاب کافی زور سے فیصل کو رسید کی تھی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ جھوٹ موٹ رونے کا ڈراما کر کے اب وہ سچ مچ رو پڑا تھا۔

"اب پتا چلا' رونا کیسے آتا ہے۔" طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے اس کی کتابیں سمیٹنے لگی۔ ایک گھنٹہ دماغ کھپا کر بھی میں اسے کچھ یاد نہیں کروا پائی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی ایسا تھا۔

"نیلی! تمہاری یہ عادت بہت خراب ہے۔ کسی اور کا غصہ کسی اور پر اتارتی ہو۔" ستون سے ٹیک لگاتے ہوئے آفاق نے جیب سے چاکلیٹ نکال کر میری طرف اچھالی۔

"تم پر اتارنا چاہ رہی تھی' مگر تم دور تھے۔" چاکلیٹ اٹھاتے ہوئے میں نے اس کی کتابیں بیگ میں رکھ کر زپ بند کی اور فیصل کو جھنجوڑا۔

"تھو پڑھ چکے تم۔۔۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور میری جان چھوڑو۔" اور تب ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا دوسری بار رونا بھی ایک ڈراما ہی تھا۔ میری بات سنتے ہی اس میں جیسے بجلی بھر گئی وہ اچھلا تو میں دنگ رہ گئی۔

"فیصل!" میں نے اسے آواز دی۔ مگر اب اسے میری بات کہاں سنی تھی۔ وہ قلانچیں بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ آفاق میری کیفیت دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"بن گئی نا بے وقوف۔ ویسے میں تمہارے لیے یہ بات کیوں کر رہا ہوں۔ بتایا تو وہاں جاتا ہے جہاں کوئی گنجائش ہو۔" اس نے خود ہی اپنی کہی بات رد کی۔

"تمہاری یہ کزن کب تک یہاں رہے گی؟" میں نے اس کی بات ان سنی کر کے اپنی بات کہی۔

"کون۔۔۔ انعمتہ؟" وہ چونکا۔

"شکر ہے! تم نے انعم نہیں کہا۔" میں دھیرے سے بڑبڑائی۔ اس نے سن لیا۔

"کیوں۔۔۔ تمہیں کوئی مسئلہ ہے کیا؟ ویسے مجھے معید نے بتایا تھا کہ تم اس کے انعمتہ کو انعم کہنے پر کتنا چڑی تھیں۔" وہ مسکرا رہا تھا اور شاید مجھے چڑانا چاہ رہا تھا۔

"یہ معید کی خوش فہمی ہے کہ میں اس کے انعمتہ کو انعم کہنے پر چڑی تھی۔" میں نے "اس کے" پر کافی زور دیا۔ "میں صرف حیران ہوئی تھی ایک ہی دن میں ان کی بے تکلفی پر۔"

"بات تو وہی آگئی نا کہ تم جل گئی تھیں۔" اس کا لہجہ اکسانے والا تھا۔

"ہاں۔۔۔ جلی تھی تو۔۔۔" میں تنک گئی۔ وہ مسکرایا۔

"تو یہ کہ ابھی وہ ارمان بھائی کی منگنی تک یہیں ہے۔ اس ایک ہفتے میں تم مزید جلنے' کڑھنے کے بجائے اس سے دوستی کرلو۔ فائدے میں رہو گی' وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"تمہیں امی بلا رہی ہیں۔" چند لمحے اسے دیکھنے رہنے کے بعد میں بولی۔ دراصل وہ مجھے تپانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ مشکوک نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"تمہارے کان بج رہے ہیں یا پھر تم مجھے یہاں سے دفع کرنا چاہ رہی ہو؟" مجھے ہنسی تو بہت آئی' مگر میں ضبط کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"نہیں! تھوڑی دیر پہلے وہ تمہارا پوچھ رہی تھیں۔ شاید انہیں کوئی کام ہے تم سے۔ اب تم جا کر ان سے پوچھو تو وہ تمہیں بتا دیں گی۔"

اس نے بے اختیار ایک سرد آہ بھری تھی۔ ہمارے گھر کے سودا سلف لانے سے بل جمع کروانے تک ہر کام وہی کیا کرتا تھا۔ اسی لیے اس وقت اس کے چہرے پر یہ سنتے ہی تھکن سی بکھر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"جوڑا کیسا لگا نیلی؟"

میں ماموں کے ہاں آئی تو مامی اور انعمتہ لاؤنج میں اپنی شاپنگ بکھرائے بیٹھی تھیں۔ انہیں بازار سے آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ ارمان بھائی بھی وہیں موجود تھے اور فرخ اور آفاق بھی۔ انعمتہ فوراً ہی اٹھ کر کچن میں ٹھنڈا لانے کے لیے چلی گئی۔

ریڈ کلر کے شیفون کے اس خوب صورت جوڑے کو میں اپنی گود میں پھیلائے بیٹھی تھی۔ قمیص کے گلے پر ہلکا سا کام تھا۔ دوپٹا پورا بھرا ہوا تھا۔ "اچھا ہے۔" میں بے ساختہ تعریف کر گئی۔

"یہ انعمتہ نے پسند کیا ہے۔" مامی نے میری تعریف کے جواب میں بتایا۔ جوڑے کے ساتھ کا دیگر سامان دیکھتے ہوئے میں سوٹ کے ہم رنگ موتیوں والے پراندے کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

"مامی! یہ پراندہ لینے کی کیا ضرورت تھی۔ اول تو آج کل پراندے کا فیشن نہیں ہے اور پھر نبیہہ کے بال ہی کتنے ہیں جو آپ نے پراندے کا تردود کر ڈالا۔" (یہ تو گنجے کو کنگھی دینے والی بات ہوئی۔) آخری جملہ میں صرف سوچنے کی ہمت کر سکتی تھی، کہنے کی نہیں۔

"ہائیں... کیا؟ اس کے بال نہیں ہیں۔" ارمان بھائی جو انعمتہ سے شربت کا گلاس لے رہے تھے۔ ایک دم سے چونک گئے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ آف وائٹ پینٹ پر بلیو کلر کی شرٹ پہنے، لائٹ براون بالوں کو سلیقے سے جمائے، چہرے پر ہلکی ہلکی سنہری داڑھی تھی اور لائٹ براون بڑی بڑی روشن ذہین آنکھوں پر سنہرے فریم کی نفیس سی عینک... بالکل ڈینیل ویٹوری لگتے تھے ارمان بھائی۔ میں نے سرد آہ کو اپنے دل میں ہی دبا لیا۔

"نہیں... بال تو ہیں۔ بس لمبے نہیں ہیں۔" میں نے ان کے ہراساں چہرے کو دیکھ کر تسلی دی۔

"ہو جائیں گے لمبے بھی... بالوں کا کیا ہے، گھر کی کھیتی ہے۔" مامی نے اچھا جواز ڈھونڈا بیٹے کا دل بڑھانے کے لیے۔ یہ الگ بات کہ ارمان بھائی بے دل سے ہو گئے۔

"مجھے تو پراندے بہت پسند ہیں۔" فرخ نے مسکرا کر پراندوں کی طرف دیکھا۔ "اگر ایسا ہے تو اس سے پہلے میں تمہارے لیے ڈھونڈوں گی کوئی نرگس اور صائمہ... ویسے بھی مامی ان کی بڑی فین ہیں۔ انہیں من چاہی بہویں مل جائیں گی اور ان کے زرق برق پراندوں کی قدردان بھی۔" میں نے پراندہ مامی کی جانب پھینکا جو بے زار سی شاپرز سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ انعمتہ آکر ان کی مدد کرنے لگی۔

"امی! میں دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ آتے ہوئے لیٹ ہو جاؤں گا۔ فکر مت کیجیے گا۔" ارمان بھیا اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مامی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا نیلی... تو تم کیا کہہ رہی تھیں صائمہ اور نرگس کے بارے میں؟" ارمان بھائی کے جاتے ہی فرخ پوری توجہ سے میری جانب متوجہ ہوا۔ وہ شاید ان کے جانے کے ہی انتظار میں تھا۔ کچھ پوچھنے کو بے تاب سا۔

"نہیں... میں تو ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھی۔" میں نے حیران ہو کر نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تم سیریس ہو اور اگر تمہیں واقعی نرگس جیسی کوئی لڑکی چاہیے تو تمہیں خود ہی کوشش کرنی پڑے گی۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" میں نے کہا آفاق ہنس پڑا۔

"تھینک یو سو مچ اس مشورے کے لیے۔" فرخ کے چہرے پر خفت چھائی۔ "مگر مجھے نرگس جیسی لڑکی نہیں چاہیے... مجھے... مجھے تو..." وہ کہتے کہتے رکا، شاید اسے اپنی بات کے لیے مناسب الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ آفاق بھی اسے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا اور میں بھی۔

"مجھے نرگس ہی چاہیے۔"

آفاق کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں اور میں... میں چلا اٹھی۔ "کیا..."

"آرام سے۔" وہ گھبرایا۔ مامی کچھ دیر پہلے ہی کچن میں گئی تھیں اور انعمتہ شاپنگ کے شاپرز لے کر اوپر۔

"امی چاہتی ہیں کہ میں انعمتہ کے بارے میں سوچوں۔ اس پر غور کروں، لیکن... لیکن میں نرگس کو پسند کرتا ہوں اور اس سے کمٹمنٹ کر چکا ہوں۔"

"خدا کے لیے فرخ... یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" میرا بے چین لہجہ لرز اٹھا۔ اس نے بات ہی ایسی کر دی تھی۔ میں حیران تھی۔ اسے نرگس ملی کہاں۔ شاید وہ بھی اس کا فین ہو اور اس کا کوئی شو دیکھنے چلا گیا ہو۔

"تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟ وہ عمر میں تم سے کتنی بڑی ہے، پھر اس کا پروفیشن... مامی بھلے ہی اس کی کتنی بڑی فین ہوں، مگر وہ اسے بہو بنانے پر کبھی

رضامند نہیں ہوں گی۔"

"عمر میں وہ میرے جتنی ہی ہے اور پروفیشن... وہ تو میرا بھی وہی ہے جو..." کہتے کہتے اسے اچانک ہی جیسے کچھ خیال آیا تھا۔ وہ رک کر مجھے گھورنے لگا۔ "تم کس کی بات کر رہی ہو؟"

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟" میں نے بجائے جواب دینے کے الٹا سوال کر لیا۔

"اپنی آفس کولیگ کی۔" اس نے چبا چبا کر بتایا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے منہ پر گیا تھا اور آفاق کا قہقہہ بے قابو ہو گیا۔

"قصور نیلی کا نہیں ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں بھی کنفیوژ ہو گیا تھا۔" وہ ہنستے ہوئے بول رہا تھا۔ مجھے خجالت سے اپنا چہرہ تپتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"تم لوگوں میں کامن سینس نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔" فرخ نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"تم میں ہے کیا؟ صاف صاف نہیں بتا سکتے تھے کہ اپنی کولیگ کی بات کر رہے ہو۔ نرگس کے نام پر اس دوسری نرگس کا ذکر چھڑنا ضروری تھا۔" میں خجالت مٹانے کو اس پر چڑھ دوڑی۔

"یہ کس نرگس کی بات ہو رہی ہے؟" دو دو سیڑھیاں پھلانگتے نیچے اترتے ہوئے معید کے کانوں تک شاید یہ نام پہلے پہنچ گیا تھا۔ وہ بلو جینز پر بلیک کلر کی ہاف سلیوز کی شرٹ پہنے تھا۔ جس میں اس کے بازوؤں کے مسلز نمایاں تھے۔ اپنے دوسرے بھائیوں کی نسبت وہ کسرتی جسامت رکھتا تھا۔ اب اس نے جم بھی جوائن کر لیا تھا۔

"مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ نرگس کے نام پر تم بھائیوں کے کان کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟" میں نے جلتے ہوئے اس پر طنز کیا تھا۔

"کیا واقعی...!" اس نے مسکرا کر اپنے کانوں کو ٹٹولا۔ "ویسے ان کے لیے تم یہ بات نہیں کہہ سکتیں کیونکہ ان دونوں کے پیدائشی ایسے ہیں۔" وہ ہنسا۔

"نیلی... تم کہاں جا رہی ہو... ابھی تو میں نے اپنی بات کی بھی نہیں ہے۔" مجھے جانے کے لیے اٹھتا دیکھ کر فرخ نے کہا اور مجھے غصہ آگیا۔

"نہیں... پہلے تم ڈیسائیڈ کر لو کہ تمہیں کہنا کیا ہے۔ اس کے بعد کر لینا اپنی بات بھی، جا رہی ہوں میں۔"

اسی وقت مامی نے مجھے آواز دی اور مامی کے آواز دینے کا مطلب اور کیا ہو سکتا تھا یہ میں اچھی طرح جانتی تھی سو بمشکل اپنی ناگواری چھپاتی کچن کی جانب بڑھ آئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ فرخ کو کیا بات کرنی تھی یہی کہ میں مامی کو نرگس کے بارے میں بتاؤں اور یہ فرخ صاحب اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ وہ اس سے شادی کا وعدہ کر چکے ہیں اور یہ ان کے خاندان میں کبھی ہوا نہیں ہے کہ مرد کسی کو زبان دے اور پھر اس سے پھر جائے۔ سو وہ فرخ کی خواہش کو مقدم رکھیں اور انعمتہ کو بھول جائیں بلکہ بھولنے کی بھی کیا ضرورت ہے ان کے دو بیٹے اور بھی تو ہیں۔ معید یا آفاق میں سے کسی کا رشتہ اس سے طے کر دیں۔ ویسے بھی مامی کو انعمتہ کو اس گھر میں رکھنے میں دلچسپی ہے نہ کہ فرخ سے اس کی شادی کرانے میں۔

☆ ☆ ☆
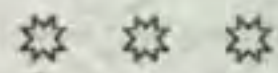
اس شام مامی نے مجھے کھانے پر روک لیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ میری مہمان نوازی کرنے کے موڈ میں تھیں، بلکہ اس لیے کہ ان کا قیمہ کریلے کھانے کا موڈ ہو رہا تھا اور چونکہ یہ انعمتہ سے ٹھیک سے بنتا نہیں تھا۔ اس لیے میری شامت آئی اور میں جو بارہا یہ عزم دہرا چکی تھی صبا کے سامنے بھی کہ آئندہ میں ان کے گھر کا کوئی کام نہیں کروں گی، اب اسے یکسر پس پشت ڈالے کچن ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی کریلوں کا ڈھیر کاٹ رہی تھی اور سوچ رہی تھی...

"یہ مروت بھی کیا فضول چیز ہے۔ صرف اور صرف انسان کو خوار کراتی ہے اور کچھ نہیں۔"

"انعمتہ... تم کیا کرتی ہو؟" انعمتہ اس وقت چولہے پر دودھ کی پتیلی رکھے اس کے گرم ہونے کے انتظار میں تھی اور میں نے تو چپ ہونا سیکھا ہی نہیں

ھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلایا۔ "گریجویشن کرنے کے بعد فارغ ہی تھی کہ خالہ نے یہاں بلالیا۔" میں نے پہلی بار اس کے منہ سے اتنا لمبا جواب سنا یعنی وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔ ورنہ ہر وقت وہ چہرے پر نولفٹ کا جو بورڈ لگائے رکھتی تھی اس کے بعد تو اسے سلام کرنے کا بھی دل نہیں چاہتا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تو تمہارا دل یہاں لگ گیا؟" کچھ حوصلہ پاکر میں نے اگلا سوال کیا۔

"نہیں۔۔۔ دل لگانے کی کیا ضرورت۔ میں تو بس اس سنڈے تک ہی یہاں ہوں۔۔۔ اور میرا تو آنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ یہ تو خالہ نے بلایا تو میں انکار نہیں کرپائی۔" اس نے نجانے میرے سوال کو کس انداز میں لیا کہ اتنے روکھے لہجے میں بولی تھی۔ میں نے محاورتاً "دل لگانے کی بات کی تھی کوئی سچ مچ کے دل لگ جانے کا تو نہیں کہا تھا جو اسے اتنا برا لگ گیا۔ میں اگلی بات کے لیے کوئی محتاط سا سوال سوچنے ہی لگی تھی کہ اس بار اس نے پوچھ لیا۔ "خالہ نے بتایا تھا تم بی اے کرچکی ہو تو۔۔۔ آگے پڑھنے کا نہیں سوچا؟"

"میں نے ابھی تو بی اے کیا ہے اور فی الحال میں ایک سال تک کچھ نہیں کرنا چاہتی۔" وہ شاید مجھے خود سے کچھ زیادہ ہی سینئر سمجھ رہی تھی۔ حالانکہ میں نے کوئی سالوں پہلے بی اے نہیں کیا تھا' اس لیے کافی جتاکر جواب دیا۔

"مجھے پڑھنے کا کافی شوق ہے' اسی لیے میں نے سوچا ہے۔ میں اپنا سال ضائع نہیں کروں گی۔" اس بار میرے منہ کھولنے سے پہلے ہی اس نے ازخود جواب دینے کی مہربانی کرلی۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے ٹوکری کا جائزہ لیا۔ اس میں دو کریلے بچے تھے اور باؤل بھر چکا تھا میں نے ذرا دیر کو چھری سائیڈ پر رکھ کر انگلیاں چٹخائیں۔ "تو حیدر آباد میں پڑھوگی یا تمہیں کراچی میں کہیں ایڈمیشن لوگی؟" میں نے کمر سیدھی کرنے کے لیے کرسی سے ٹیک لگائی۔

"میری خواہش ہے۔۔۔ میں کراچی یونیورسٹی سے ماسٹرز کروں اور۔۔۔ میں نے معید سے بات بھی کرلی ہے۔" اس نے کہا تھا اور میں ایکدم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

معید سے بات کی۔۔۔ مطلب وہ معید سے بات بھی کرتی تھی۔ میں نے بغور اسے دیکھا اور پھر سے چھری اٹھالی۔

"ہائے لیڈیز!" اس نے شاید اپنا نام سن لیا تھا۔ میں نے بے زاری سے دروازے کی سمت دیکھا۔

"ایک کپ چائے ملے گی انعم۔۔۔!" وہ مخاطب انعمتہ سے تھا۔ "انعم" پر زور دیتے ہوئے آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ شرارت سے چمکتی اس کی سیاہ پرتاثر آنکھیں۔۔۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں پھر کوئی ری ایکشن دوں گی۔ مگر میں نے اسے یکسر نظرانداز کرکے کریلا چھیلنا شروع کردیا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔۔۔ میں ابھی بنا دیتی ہوں۔" انعمتہ نے جلدی سے برتنوں کے ریک سے چائے کی پتیلی نکالی۔

"تھینک یو۔۔۔ ورنہ میں نے تو اکثر چائے کی فرمائش کے جواب میں جھاڑ پلانے والے ہی دیکھے ہیں۔" وہ دروازے میں ہی جم کر کھڑا ہوگیا۔

"لیکن۔۔۔ میں نے تو کبھی آپ کو جھاڑ نہیں پلائی۔" انعمتہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"جانتا ہوں۔۔۔ تم کبھی مجھے جھاڑ پلاؤ گی بھی نہیں۔۔۔!" مجھے اس کے لہجے میں مسکراہٹ سی محسوس ہوئی۔ "اس لیے تو تم سے کہا ہے' کسی اور سے نہیں کہا۔"

"اور کس سے کہیں گے آپ۔۔۔ میرے علاوہ؟"

پتا نہیں چھری کی دھار کچھ زیادہ تیز تھی یا میں نے ہی کریلے پر زیادہ طاقت سے کٹ لگانے کی کوشش کی تھی۔ کریلا تو نہیں کٹا' مگر میرا انگوٹھا ضرور کٹ گیا اور میرے منہ سے بے ساختہ سسکاری نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" انعمتہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ معید

بھی اندر چلا آیا۔

"کچھ نہیں۔" میں ہاتھ جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چوٹ لگ گئی ہے ذرا سی۔۔۔ میں بس۔۔۔ ابھی آتی ہوں۔" میں نے خون روکنے کی کوشش میں انگوٹھے کو دبایا ہوا تھا اور باہر نکلنے ہی لگی تھی کہ معید نے اچانک میرا بازو پکڑلیا۔

"اب کیا اس چوٹ کی پٹی کے لیے بھی گھر جاؤگی۔۔۔ بیٹھو یہاں۔۔۔!" کچھ سخت سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ مجھے پھر سے بٹھانے لگا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑالیا۔

"چاہے گھر جاکر پٹی کروں۔۔۔ چاہے اسپتال جاکر۔۔۔ تمہیں اس سے کیا؟"

"بیٹھو نا نیلی۔۔۔ میں کردیتی ہوں پٹی۔" انعمتہ پریشانی سے بول اٹھی۔

"ارے۔۔۔ پہلے مجھے ماسی سے پوچھنے تو دو کہ ڈیٹول کی بوتل کہاں رکھی ہے۔" میں جھلائی۔ خون سے میرے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی بھی سرخ ہوگئی تھی۔

"میں لے آتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ مجھے بادل نخواستہ دوبارہ بیٹھنا پڑا۔ کچھ لمحوں بعد انعمتہ نے میرے سامنے برفیلا پانی رکھ دیا۔

"اس میں ہاتھ ڈبو دو تو خون بہنا بند ہوجائے گا۔"

"تھینکس۔" میں نے ہلکے سے مسکراکر اس میں اپنا ہاتھ رکھا اور دوسرے ہی پل مجھے اپنے انگوٹھے کا درد کم ہوتا لگا۔

"ارے اتنا خون۔۔۔!" تھوڑی دیر میں جب وہ دوائی لے کر میرے سامنے بیٹھا تو کانچ کے برتن میں خون ملے پانی کو دیکھ مصنوعی حیرت کا اظہار کیا اور دوائی کی بوتل کھولتے ہوئے میرا ہاتھ تھامنا چاہا۔

"نہیں۔۔۔ رہنے دو۔" میں جلدی سے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ "اب خون بہنا بند ہوچکا ہے اور مجھے درد بھی نہیں ہورہا۔" وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"تمہیں چوٹ تو لگی ہے نا۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ لگی ہے۔ مگر میں پٹی نہیں کرنا چاہتی۔" میں نے اکتاکر کہا۔

"کیوں۔۔۔؟" وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور تب ہی مجھے اس کی آنکھوں کی بے پناہ کشش کا اندازہ ہوا۔ میں نامعلوم سے احساس میں گھر گئی۔ شاید وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ مجھے نگاہیں نہیں چرانی چاہیے تھیں مگر پھر بھی۔۔۔ میں اسے اپنی کمزوری کا احساس دلاتے ہوئے نظریں چراکر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس۔۔۔ میری مرضی۔۔۔!" مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا۔

"مگر ہمیں ہر وقت۔۔۔ اپنی مرضی نہیں چلانی چاہیے۔" اس نے خود ہی میرا ہاتھ تھام کر دوائی میرے ہاتھ پر انڈیلی اور میں اس کے لمس سے زیادہ اس کی گرفت کی مضبوطی سے ششدر کھڑی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں شاور لے کر نکلی تو میں نے بیڈ کی سمت دیکھا جہاں صبا بیٹھی ہوئی تھی۔

"تم اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔۔۔ آج اکیڈمی نہیں جانا؟" اسے سستی سے پیر پھیلائے دیکھ کر میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں! آج میرا موڈ نہیں ہے۔" اس نے بے زاری سے کہہ کر بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائی۔

"اچھا۔۔۔ تو اب پڑھائی بھی تم اپنے موڈ کے حساب سے کروگی۔۔۔ رکو۔۔۔ ابھی امی کو بتاتی ہوں وہ ایک فیصل کو رو رہی ہیں اور یہاں تم بھی۔۔۔" برش ٹیبل پر پھینک کر میں باہر کو لپکی ہی تھی کہ اس نے جلدی سے اٹھ کر مجھے روکا۔

"میری بات تو سنو۔۔۔ اصل میں بات موڈ کی نہیں ہے۔" وہ پست لہجے میں بتانے لگی۔ "آج میرا ٹیسٹ ہے انگلش کا اور۔۔۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔"

"تو تم نے یاد کیوں نہیں کیا؟" میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"وقت کہاں ملا مجھے یاد کرنے کا۔" وہ ایک دم

جھنجلائی۔ "کل تو تم پوری شام وہاں جاکر بیٹھ گئیں اور یہاں سارا کام مجھے اکیلے کرنا پڑا۔۔۔ اور اب۔۔۔ تمہیں پتا ہے نا۔۔۔ وہ معید کا بچہ میری بہت بے عزتی کرے گا۔" اس نے کہا۔ مجھے ایک دم سے پل بھر کے لیے اپنے پورے وجود میں لرزش سی محسوس ہوئی اور نظر بے اختیار اپنے ہاتھ پر چلی گئی۔

"اور پتا ہے۔۔۔ لڑکیوں میں، میں واحد لڑکی ہوں گی جسے سزا ملے گی۔ ورنہ باقی لڑکیاں تو ہر وقت اسے امپریس کرنے کے چکروں میں لگی رہتی ہیں۔۔۔ بڑا آیا شہزادہ کہیں کا۔" اس کا انداز کافی جلا کٹا تھا۔ میں چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تم جانو۔۔۔ اور تمہارا کام۔۔۔" اسے اس کے حال پر چھوڑ کر میں کمرے سے نکلی مگر جیسے ہی میں برآمدے میں آئی۔ مجھے پھر سے نہایت سے تیزی سے کمرے میں واپس آنا پڑا۔ صبا حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے اپنے بال سمیٹتے ہوئے بمشکل اپنی سانسیں ہموار کیں۔

"نہیں۔۔۔ کچھ تو ہے۔" نہ ماننے والے انداز میں کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے سائیڈ ٹیبل سے ڈائجسٹ اٹھایا۔ پتا نہیں۔۔۔ میں یہ بے وقوفی کیوں کر رہی تھی اور اس سے کیا ہونے والا تھا۔ صفحات پلٹتے ہوئے میں خود کو بھی اپنی اس حرکت کی توجیہہ پیش نہیں کر پا رہی تھی جو میں نے معید کو دیکھ کر کی تھی۔ یعنی خود پر اس کی نظر پڑنے سے پہلے ہی واپس کمرے میں بھاگ آئی۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑا امی کے ساتھ کچھ بات کر رہا تھا۔

"نیلی بدتمیز۔۔۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ باہر معید ہے؟" تھوڑی دیر بعد صبا رونی صورت لیے میرے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟" میں انجان بنی۔

"ہونا کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا ارے! تم ابھی تک گھر پر ہی ہو؟" اور پھر امی سے کہا۔ "پھپھو! کل صبا کو ضرور بھیجیے گا۔ آج اس کا بہت اہم ٹیسٹ ہے کہیں چھٹی نہ مار لے۔" اور اب امی نے مجھے آرڈر جاری کیا ہے کہ میں فوراً کوچنگ جاؤں۔" وہ الماری کھولتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں بتا رہی تھی۔

"اتنا ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کہہ دیتا معید سے تمہیں یاد کرنے کا ٹائم نہیں ملا۔" اس کے مسئلے کی سنگینی محسوس کرکے میں نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"ہاں۔۔۔ وہ تو جیسے میری بات مان ہی لے گا نا۔۔۔ وہ تو ایک نمبر کا۔۔۔" اس نے کچھ کہتے کہتے بروقت زبان روکی۔ "کسی دن یہ معید میرے ہی ہاتھوں قتل ہوگا۔ یاد رکھنا۔" وہ بے حد بھنائی ہوئی تھی۔ میں ہنس پڑی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہنس لو۔ تمہاری زندگی میں معید نام کا کوئی دیو نہیں ہے نا! اس لیے تم ہنس سکتی ہو۔" چادر اوڑھ کر اپنی کتابیں اٹھائے وہ باہر نکل گئی۔ اور میں اس کے جملے پر غور کرنے لگی۔

"میں نہیں چاہتی' میری زندگی میں معید جیسا کوئی آئے۔۔۔ یا پھر۔۔۔ یا پھر معید ہی آئے۔ وہ تھوڑی دیر رکتی تو میں یہ بات ضرور کہتی۔

☼ ☼ ☼
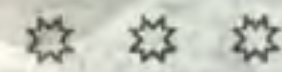
دوسرے دن مامی انعمتہ کے ساتھ چلی آئیں۔ منگنی میں صرف تین دن تھے اور وہ ہمیں شاپنگ کروانا چاہ رہی تھیں۔ صبا تو اس وقت کالج میں تھی اور میرا بھی جانے کا موڈ نہیں تھا' مگر پھر میں نے سوچا۔ اگر میں نہیں جاؤں گی تو مامی اپنی پسند کا کوئی بھی سستا' بدرنگ اور ہلکے سے کپڑے کا سوٹ لے آئیں گی اور احسان جو ہوگا وہ الگ۔ اسی لیے میں نے اپنی تمام تر سستی اتار پھینکتے ہوئے اسی وقت ان کے ساتھ بازار کا رخ کیا تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا تین چار ہزار سے کم کسی سوٹ پر نہیں ٹھہروں گی۔ نت نئے' خوب صورت اور قیمتی ملبوسات میری کمزوری تھے۔ ابو کی طرف سے ملنے والا جیب خرچ بھی میں اسی پر لٹاتی تھی اور اب تو مال بھی مفت کا تھا اور مامی کے پلے سے جا رہا تھا تو دل بے رحم کیوں نہ ہوتا۔

شاپنگ ہم نے بہت جلدی کرلی تھی۔ بس جوتوں کی خریداری میں ذرا لگا تھا۔ ہم دو گھنٹوں کے اندر گھر لوٹ آئے تھے۔ لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے جس چہل پہل کا احساس ہوا' وہ مجھے بے حال کرنے کے لیے کافی تھا۔ مامی نے الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور شاپرز مجھے پکڑا کر ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئیں۔

"آؤ انعمتہ!" میں مرے لہجے میں اس سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور شاپرز ایک طرف پھینک کر بیڈ پر گری تھی۔

"یہ مہمان کون ہیں۔۔۔؟" انعمتہ بیڈ پر میرے قریب ہی بیٹھتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں۔۔۔ میں تو سیدھی یہاں آگئی اور۔۔۔ امی نے صبح کوئی ذکر بھی نہیں کیا تھا کسی کے آنے کا۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے پیر دبائے جو اونچی ہیل کی سینڈل کی وجہ سے کافی تکلیف دے رہے تھے۔

"تو تم جاکر دیکھ لیتیں۔" اس نے بھی اپنے سینڈل اتارے۔

"نہیں۔۔۔ خاندان کا تو کوئی نہیں ہے۔۔۔ اتنا تو مجھے پتا ہے۔" میں نے آوازیں سن کر اندازہ لگایا تھا۔ اسی وقت صبا بھی واش روم سے نکل آئی۔

"ارے! تم لوگ آگئے۔۔۔ کیا کیا شاپنگ کی تم لوگوں نے؟" وہ جوش سے آکر کہتے شاپرز کھولنے لگی۔

"صبا ندیدی۔" میں غصے سے کھول گئی۔ "پہلے یہ بتاؤ یہ مہمان کون ہیں؟" اس نے میری طرف دیکھا۔

"صفیہ آنٹی ہیں۔ اپنی ساس اور بیٹی کے ساتھ آئی ہیں۔ تم گئی نہیں انہیں سلام کرنے؟" اس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" تھکن سے میرا برا حال تھا اور ابھی مزید متوقع تھکن کا سوچ کر ہی میرا جسم ٹوٹنے لگا۔

"یہ لوگ فون کرکے نہیں آسکتے تھے؟" مجھے ابو کی ان کزن صاحبہ پر غصہ آیا۔ ان سے ہمارے نزدیکی روابط نہیں تھے۔ بس کبھی کبھار کا آنا جانا ہوتا تھا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں صرف تولیے سے منہ پونچھ کر ہی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں خود پر پرفیوم تو اسپرے کر ہی دیتی۔ مگر اس وقت میرا کچھ بھی کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا اور تو اور میں نے اپنے سبز رنگ کے لباس پر دوپٹا بھی صبا کے کالج یونیفارم کا اوڑھ لیا تھا۔

صفیہ آنٹی اور ان کی بارعب دادی جیسی ساس نے مجھے کافی لگاوٹ سے اپنے ساتھ لپٹایا تھا اور مجھے ان کے وجود سے پھوٹتی خوشبو نے یکایک پچھتانے پر مجبور کردیا کہ میں نے پرفیوم کیوں نہیں لگایا۔ کچھ دیر ان کی بیٹی فاریہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے امی کی آنکھوں کے اشارے بھانپتے ہی باہر آنا مناسب سمجھا۔

"کیا بنانا ہے اب؟" ان کے باہر آتے ہی میں نے جل کر دریافت کیا تھا۔

"زیادہ کچھ مت بنانا۔۔۔ بریانی کا مسالا میں بنا چکی ہوں۔ چاول بھی ابالنے کو رکھ دیے ہیں۔ تم بس ہانڈی چڑھالو۔ باقی میں آفاق کو بھیج کر بازار سے منگوا لوں گی۔ اب ہر چیز باہر سے آئے۔ یہ بھی تو اچھا نہیں لگتا نا۔" میرے چہرے پر چھائی تھکن دیکھ کر ان کا دل پسیج گیا۔ اسی لیے نرمی سے اپنی مجبوری سمجھائی۔ "میں صبا سے کہہ دیتی ہوں۔۔۔ اگر تمہاری مدد کردے۔"

مامی تو کچھ ہی دیر میں تھکن کا بہانہ بنا کر گھر چلی گئی تھیں۔ انعمتہ کو میں نے کھانے پر روک لیا۔ اس کے لیے کولڈ ڈرنک بھجوا کر میں نے کچن میں کام شروع کردیا۔

"میں کچھ مدد کروں نیلی؟" انعمتہ ٹرے میں خالی گلاس رکھے باہر آئی تو مجھے مدد کی آفر کردی۔

"ارے نہیں۔۔۔ زیادہ کچھ نہیں کرنا۔۔۔ میں کرلوں گی۔" میں مسکرائی۔

انعمتہ اچھی لڑکی تھی۔ اب مجھے خود بھی دل میں اس بات کا اعتراف کرنا پڑ رہا تھا۔ پھر میرے "نہ' نہ"

کرنے کے باوجود اسی نے بریانی کی تہیں لگائیں۔ کباب تلے۔ رائتہ اور سلاد بھی بنا ڈالا اور صبا بے فکری سے اندر بیٹھی فاریہ کے ساتھ گپیں لڑا رہی تھی۔ بے شرمی میں اس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ ہمارے گھر روٹیاں کبھی بازار سے نہیں آتی تھیں۔ اور اس وقت میں روٹیاں ہی بنا رہی تھی کہ تب ہی آفاق بھی آگیا۔ کچھ دیر میں مہمانوں کے لیے کھانا لگانے کے بعد میں نے انعمتہ سے کہا تو اس نے منع کردیا۔

"مجھ سے اجنبی لوگوں کے سامنے کھانا نہیں کھایا جاتا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھ سے بھی نہیں کھایا جاتا۔ ہم بعد میں کھالیں گے۔" میں نے اس کی تائید کی۔

یہ اور بات کہ ہمارا لنچ پھر کافی لیٹ ہوگیا تھا۔ کیونکہ مہمانوں کے جانے تک مجھے ایک پل کی بھی فرصت نہیں ملی تھی اور جس وقت وہ جا رہے تھے میں انعمتہ کے ساتھ باہر ہی کھڑی تھی۔ صفیہ آنٹی نے مجھے مسکراتے ہوئے گلے لگایا اور پھر... میرے ہاتھ میں کئی کڑکڑاتے نوٹ رکھ دیے۔ میں ہکا بکا رہ گئی۔

"آنٹی یہ..." میں نے انہیں پیسے واپس کرنے چاہے۔

"ارے رکھ لو۔ اس کے لیے "نہ" نہیں کرتے۔" وہ ہنسی تھیں اور امی سے مخاطب ہوئیں۔

"فاخرہ! آپ بھائی صاحب سے جلد ہی بات کرکے ہمیں جواب دے دیجیے گا مگر یاد رکھیے... ہم کوئی انکار نہیں سنیں گے۔" ان کے لہجے میں مان بھری دھونس تھی۔ مجھے اپنا چہرہ پھیکا پڑتا محسوس ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میں سرعت سے اندر چلی آئی تھی۔

"نیلی! کیا کررہی ہو...؟ اٹھو! کھانا لگا دیا ہے میں نے... وہ بے چاری بچی کب سے بھوکی بیٹھی ہے۔ اسے کھانے پر روک ہی لیا تھا تو کم از کم وقت پر کھلا تو دیتیں۔"

مجھے اپنی پشت پر امی کی ناراض سی آواز سنائی دی تو میں اٹھ بیٹھی۔ کچھ دیر پہلے تک مجھے جتنی بھوک لگ رہی تھی اب کھانے کا محض سوچ کر ہی میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ مگر انعمتہ نے بھی تو کھانا نہیں کھایا تھا اور میں اتنی بد اخلاق تو بالکل نہیں تھی کہ اسے کھانے پر روکنے کے بعد اس کا ساتھ بھی نہ دیتی۔ اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر باہر آنا پڑا۔ آفاق بھی موجود تھا اور ایک کرسی سنبھالے بریانی کے مزے لے رہا تھا۔

"نیلی! یہ مہمان کون تھے؟" آفاق کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی اس لیے اسے گھورنے لگی۔

"تم جانتے ہو' یہ لوگ پہلے بھی آچکے ہیں۔ پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ لوگ آئے کیوں تھے؟"

"تم یہاں اس لیے آئے تھے کہ یہ بکواس کرسکو؟" میرے لیے ضبط کرنا مشکل ہونے لگا۔

"نہیں... میں تو یہاں اس لیے آیا تھا ناکہ بریانی کھا سکوں۔" وہ مسکراتے ہوئے لاپروائی سے بولا۔

"تو اب تم بتاؤ گی کہ..."

"چپ رہو... آگے کچھ نہیں کہو گے تم۔ سمجھے۔" میں نے آفاق کو کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتے دیکھ کر جلدی سے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

"ٹھیک ہے! نہیں کہتا... مگر میں حیران ضرور ہوں۔ کیا ان کی نظر کمزور تھی یا پھر وہ کسی مینٹل اسپتال سے سیدھا یہیں آرہے تھے۔" مصنوعی حیرانی سے کہتے ہوئے وہ مجھے جلانے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ انعمتہ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ مگر میں اس وقت ناگواری یا برہمی کا اظہار بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اسی لیے سن ہوتے دل و دماغ کے ساتھ اس کی بات بھی ان سنی کردی اور وہ جو میری جانب سے کسی تند و تیکھے جواب کا منتظر تھا۔ حیران سا مجھے دیکھتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"نیلی! کیا کررہی ہو؟"

میں اس وقت اپنی نئی قمیص کی فٹنگ کررہی تھی جب امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کچھ خاص نہیں۔" میں نے انہیں دیکھا۔ "کوئی کام ہو تو بتائیں۔" میں نے قمیص اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے اس کی فٹنگ کا جائزہ لیا۔ آدھی آستینوں کی یہ قمیص دامن پر سے جگمگاتے نیلے نگوں کے کام سے مزین تھی۔ گلے پر کچھ نہیں تھا مگر دونوں آستینیں بھی کام سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ پاجامہ اور بڑا سا دوپٹا تھا۔ میں کبھی بھی جدید فیشن کے مطابق ڈریسنگ نہیں کرتی تھی وہی کرتی جو مجھے اچھا لگتا یا مجھ پر اچھا لگتا۔

"نہیں! کام نہیں ہے... میں تم سے بات کرنے آئی تھی۔" وہ پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"تم جانتی تو ہو کہ آج صفیہ آئی تھی اور کیوں آئی تھی' یہ پتا بھی چل چکا ہوگا۔" انہوں نے تمہید باندھی۔ آستین سے لٹکتے دھاگے کو دانتوں سے توڑتے ہوئے میں رک سی گئی اور نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"ویسے تو بہت دن پہلے فون پر اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا اور پچھلے اتوار کو تو آنا بھی چاہ رہی تھیں مگر پھر کسی وجہ سے نہیں آپائی اور آج صبح جب فون کرکے اپنے آنے کا بتایا تو تب تک تم بھابھی کے ساتھ بازار کے لیے نکل چکی تھیں۔" امی بتا رہی تھیں۔

"اس کا مطلب' انہوں نے فون کیا تھا مگر... میرے جانے کے بعد۔" میں نے سوچا۔

"صفیہ بھلی عورت ہے۔ ساس مزاج کی تھوڑی سخت ہیں مگر خیر... تمہاری دادی بھی تو ایسی ہی ہیں بڑھاپا انسان پر اتنا اثر تو ڈالتا ہی ہے۔ میری تو خواہش تھی کہ تم میری نظروں کے سامنے ہی رہتیں مگر بھابھی نے ارمان کا رشتہ کرتے ہوئے ایک بار بھی تمہارے بارے میں نہیں سوچا اور نہ ہی اب فرخ کے لیے ان کی ایسی کوئی خواہش نظر آتی ہے۔" امی کافی بجھی ہوئی سی تھیں۔ میرا دل گھبرا گیا۔ قمیص گول مول کرکے بیڈ پر پھینکتے ہوئے میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"ہاں تو کہہ رہی تھیں کہ میں خود بھائی جان سے بات کروں... مگر میں نے منع کردیا۔ بھائی اپنا ہے تو کیا۔ بھابھی تو پرائی ہیں نا! کیا سوچیں گی وہ بیٹیاں اتنی ہلکی ہیں کہ میں اپنے منہ سے ان کے رشتوں کی بات کررہی ہوں؟ تمہارے تو اس سے پہلے بھی کئی اچھے اچھے رشتے آچکے ہیں۔ مگر میں ہی ہچکچا رہی تھی۔ نئی رشتے داریاں بنانا اور نبھانا آسان کام نہیں ہوتا۔ سو مسئلے' سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ سوچا تھا تم اپنے ماموں کے گھر سے اچھی طرح واقف ہو۔ سب کے مزاج سمجھتی ہو۔ ان کا ماحول' ان کا رہن سہن سب ہمارے گھر جیسا ہی ہے۔ اسی لیے تمہیں وہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ بھائی جان اپنی سگی بہن کو چھوڑ کر غیروں سے رشتے داریاں گانٹھنے چل پڑیں گے۔" ان کے لہجے میں تلخی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر ان کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ میں ان سے کیا کہتی یہ سب تو میرے ذہن میں بھی تھا۔ ان کے گھر کی طرف میرا یہ جھکاؤ' میرا یہ لگاؤ اسی سبب سے تو تھا کہ مجھے وہ گھر بالکل اپنے گھر کی طرح لگتا تھا۔ ورنہ مجھے ارمان یا فرخ کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں وہاں جانا چاہتی تھی کیونکہ اجنبی لوگوں' اجنبی ماحول کا سوچ کر میرا دل ہولنے لگتا تھا۔

"خیر! اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔" انہوں نے پھر سے سلسلہ کلام جوڑا۔ "یہ بھی برے نہیں ہیں۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ گھر بھی زیادہ بھرا پرا نہیں ہے اور صفیہ کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت ہی صاف اور کھرے دل کی عورت ہے۔ پھر اکلوتی بہو ہونے کی وجہ سے تو تمہیں سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھے گی۔"

"آپ نے ابو سے بات کی؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کرلوں گی ان سے بات بھی... مگر وہ یہی کہیں گے کہ پہلے میں تم سے پوچھ لوں۔"

میں ایک گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ اگر میں منع کرتی تو ابو کبھی بھی اس رشتے کو اوکے نہ کرتے۔ یوں تو ہر باپ کی طرح وہ بھی اپنے بچوں کے لیے ہمہ وقت فکرمند ہی رہا کرتے تھے مگر اس فکرمندی اور محبت میں ان کے ملائیشیا جانے کے بعد اور بھی شدت آئی تھی۔

وطن سے، رشتوں سے دور جانے کے بعد ہی ان کی قدر اپنا آپ منواتی ہے اور ہمارے لیے بھی ان کی پدرانہ شفقت اور حساسیت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں نیلی! تمہاری کیا مرضی ہے؟" انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو میں چونک گئی۔

"آپ کو کس بات کی جلدی ہے امی؟" میرا دل اس ذکر سے گھبرانے لگا تھا۔

"جلدی مجھے نہیں ہے... جلدی صفیہ کو ہے۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی جلد منانا چاہتی ہے اور دیکھا جائے تو دیر کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے نا۔ جب ہمیں اس رشتے کے لیے ہامی بھرنی ہی ہے تو پھر انہیں خوامخواہ کا انتظار کیوں کروائیں۔" امی شاید ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھیں اس رشتے کو فائنل کرنے کے لیے۔

"امی پلیز کچھ دن ٹھہر جائیں۔ ابھی میں کچھ بھی سوچ نہیں پا رہی ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہتے ہوئے ان کے ہاتھ تھامے۔

"ٹھیک ہے! میں تم پر کوئی زور نہیں ڈالنا چاہتی۔ تمہارا جب جی چاہے۔ مجھے جواب دے دینا اور اگر تمہارا دل یہاں راضی نہیں ہے تو بھی مجھے بتاتے ہوئے جھجکنا مت۔ میں انہیں انکار کہلوا دوں گی۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے میری ٹینشن کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"آج ارمان بھائی بھی پرائے ہو جائیں گے۔"

میں اس وقت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی آنکھوں کے کناروں پر آئی پنسل پھیر رہی تھی، جب صبا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب عادت بے سروپا ہانکی۔ میں نے پہلے تو ہاتھ روکا اور پھر اسے دیکھا۔ پیچ اور بلیک کنٹراسٹ کا خوب صورت سوٹ پہنے وہ مجھ سے پہلے تیار ہو چکی تھی۔ اس میں کم از کم یہ عادت تو اچھی تھی کہ وہ تیار ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیتی تھی۔

"جانتی ہو، آج کل شادی کے بعد لڑکیوں سے زیادہ لڑکے پرائے ہو جاتے ہیں؟" اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"ارمان بھائی ایسے نہیں ہیں اور نہ یہ منگنی ان کی پسند پر ہو رہی ہے۔" میں نے آنکھوں کا کاجل مزید گہرا کیا۔ "ہاں... یہ بات تم فرخ کے لیے کہہ سکتی ہو... اگر اس کی شادی اس جگہ ہو گئی، جہاں وہ چاہتا ہے تو..."

"کیا... کیا چاہتا ہے وہ...؟" اس نے میری بات پر غور کیا اور اچھل پڑی۔

"وہ اپنی کسی کولیگ کو پسند کرتا ہے اور مامی اسے انعمتہ کے لیے منا رہی ہیں۔" میں نے ٹیبل پر سے اپنے آویزے اٹھا کر کانوں میں ڈالے۔

"اس کا مطلب... وہ انعمتہ سے شادی نہیں کرے گا... مامی بے چاری کا پلان فیل۔" وہ بے یقینی سے بڑبڑائی۔

"یہ تو نہیں پتا کہ وہ شادی کرے گا یا نہیں کرے گا۔ مگر فی الحال وہ راضی نہیں ہے۔" میں نے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔

"دیکھا... اور تم نے خواہ مخواہ انعمتہ بے چاری سے بیر باندھ لیا تھا۔" میری بات سنتے ہی صبا نے تبصرہ کیا۔ میں نے پلٹ کر اسے گھورا۔

"تمہاری یہ بکواس کرنے کی عادت ختم کیوں نہیں ہو جاتی۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں اس..." صبا کے تاثرات ایک دم بدلے تھے۔ میں چپ ہوئی اور اس کی نظروں کے تعاقب میں دروازے کی سمت دیکھا معید دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"یہ کیا سر! آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔" صبا نے اسے دیکھ کر حیرانی سے دریافت کیا۔

"میں نہیں جا رہا۔" سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے وہ اطمینان سے بولا۔ وہ اس وقت اپنے اسی رف حلیے میں تھا۔ اڑے رنگ کی جینز پر بلیک چیک کی پر شکن شرٹ پہنے۔ کئی دن کی شیو بڑھائے اور آنکھوں میں سرخیاں سمیٹے۔ میں نے بے زار ہو کر رخ پھیرا۔ اسے دیکھ کر اگر ذہن میں کوئی تاثر ابھرتا تو وہ پاگل خانے سے بھاگے کسی پاگل یا پھر عشق میں ہارے کسی ناکام عاشق کا سا تھا۔

"کیوں... کیوں نہیں جا رہے؟"

"میرا موڈ نہیں ہے جانے کا... اور پھر... مجھے اپنا کچھ ضروری کام بھی کرنا ہے۔" وہ مجھے دیکھتے ہوئے عام سے لہجے میں بتا رہا تھا، مگر اس کی نظریں... مجھے اپنا آپ جلتا محسوس ہوا۔

"کتنے عجیب ہیں آپ... بھائی کی منگنی بھی اٹینڈ نہیں کریں گے۔" جب سے وہ صبا کا ٹیچر بنا تھا۔ صبا اس سے کچھ اسی طرح بات کرنے لگی تھی۔

"منگنی بھائی کی ہے... میری نہیں کہ شرکت ضروری ہو۔" وہ دھیرے سے مسکرایا تھا۔ خود پر جمی اس کی گہری نظریں مجھے بے چین کرنے لگی تھیں۔ باہر نکلنے کا سوچا، مگر اس کے دروازے میں کھڑے ہونے کے باعث یہ بھی نہیں کر پائی۔

"ویسے میں آپ لوگوں کو یہ بتانے آیا تھا کہ ذرا جلدی باہر نکلنے کی زحمت کر لیجیے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ آپ بھی یہ فنکشن اٹینڈ کرنے سے رہ جائیں۔"

امی اور دادی کافی دیر پہلے ماموں کے ہاں جا چکی تھیں۔ مگر ہماری تیاری نے کافی وقت لے لیا تھا۔ اب شاید انہوں نے ہی اسے بھیجا تھا۔ صبا تو یہ سنتے ہی تیزی سے باہر کی جانب بڑھی تھی۔ اس کے مڑنے پر میں نے بھی قدم بڑھائے، مگر دو قدم بعد ہی وہ اچانک رک کر پلٹا اور میں جو اس کے پیچھے ہی تھی، اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"کیا ہے۔" اس یقینی تصادم سے بچتے ہی میں اس کی اس حرکت پر جھلا گئی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی اتر آئی۔

"سنا ہے عنقریب تمہاری بھی منگنی ہونے والی ہے۔"

میں نے ٹھٹک کر اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اس کا انداز پوچھنے والا نہیں، چھیڑنے والا تھا۔

"ہاں... بالکل ٹھیک سنا ہے تم نے۔" میں نے سر ہلایا۔ "منگنیوں کا سیزن چل ہی رہا ہے تو سوچا میں بھی منگنی کر ہی لوں۔"

"ایسا کیا...!" اس نے شریر سے لہجے میں کہتے ہوئے پیشانی پر بکھرے بال ہٹائے۔ "پھر تو مجھے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک عدد منگنی کر لینی چاہیے۔" وہ کمرے سے نکل آیا۔

"بالکل کیجیے... مگر بھائی صاحب..." میں نے پیچھے اس کے شانے کو ہولے سے تھپتھپایا۔ وہ گردن موڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

"اس سے پہلے ایک لڑکی ضرور ڈھونڈ لیجیے، کیونکہ ہواؤں کو یا پھر دیواروں کو آپ انگوٹھی نہیں پہنا سکتے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی باہر نکل گئی۔

"آپ کو یہ جملہ بہت مہنگا پڑنے والا ہے نیلی جی!" اس نے پیچھے سے کہا تھا۔ مگر میں نے اسے مڑ کر نہیں دیکھا۔

☼ ☼ ☼

مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ دن ارمان بھائی کے علاوہ میرے لیے بھی اتنا غیر معمولی ثابت ہو گا۔ ورنہ میں شاید خود کو ذہنی طور پر تیار ہی کر لیتی۔ اب جو اچانک اور غیر متوقع جھٹکا میرے اعصاب کو لگا تھا، اس سے میرے دل و دماغ ہل کر رہ گئے تھے۔

منگنی کی رسم ہونے کے بعد جب مبارک بادیں دی جا رہی تھیں۔ مٹھائیاں کھلائی جا رہی تھیں، آفاق بھی کیمرا سنبھالے آ گیا تھا۔ میں ایک طرف کھڑی نبیہ کی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔ جس کے چہرے پر ایک خوب صورت سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ وہ خوش تھی اور اپنی خوشی کو چھپانے کی وہ کوئی خاص کوشش بھی نہیں کر رہی تھی۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ ارمان بھائی اور نبیہ کو دیکھنے کے بعد میرا اس بات پر ایمان پختہ ہو گیا تھا۔ اسی وقت تصویریں کھینچتے ہوئے آفاق کو میری یاد آئی تو صبا بھی امی کا پیغام لیے میرے پاس آ گئی۔

"تمہیں امی بلا رہی ہیں۔"

"امی کیوں بلا رہی ہیں۔" میں نے چونک کر سامنے دیکھا تو امی ایک باوقار سی خاتون کے ساتھ بیٹھی نظر آئیں۔

"جا کر پوچھ لو تو بتا دیں گی۔" صبا کچھ تپ کر بولی۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا' پھر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے آفاق کی پکار نظر انداز کر کے امی کے پاس آگئی۔

"جی امی!"

"یہ میری بڑی بیٹی ہے نیلمان.....!" امی میرے پاس آتے ہی ان خاتون سے مخاطب ہوئیں۔ انہوں نے شاید مجھے ان سے متعارف کرنے کے لیے ہی بلایا تھا۔

"السلام علیکم!" میں نے دھیرے سے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو۔" انہوں نے مسکرا کر میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔ کہیں رشتہ وشتہ تو طے نہیں ہوا ابھی تک.....؟" بعض خواتین کی پتا نہیں یہ کون سی عادت ہوتی ہے۔ کسی بھی لڑکی کو دیکھ کر پہلا سوال اس کے رشتے کا ہی کرتی ہیں اور انہوں نے بھی جب ایک دم سے یہ سوال کیا تو میں گڑبڑا سی گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا رکوں یا چلی جاؤں۔

"نہیں..... ابھی تو....." امی جز بز ہو کر کچھ کہنے ہی لگی تھیں کہ تب ہی امی نے نجانے کہاں سے آکر ان کا سوال سن لیا اور امی کی بات کاٹ کر بیچ میں ہی بول پڑیں۔

"ارے ہوا کیوں نہیں ہے۔ یہ میری ہونے والی بہو ہے..... میں نے بتایا تھا نا آپ کو ایک بیٹے کے لیے تو میرا ارادہ اپنی بھانجی کی طرف ہے اور یہ میرے تیسرے بیٹے کی....." وہ بول رہی تھیں اور میں حق دق کھڑی تھی۔ میں نے بے اختیار امی کی طرف دیکھا کہ شاید وہ ہی کچھ بول دیں۔ مگر ان کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ آنکھوں میں تحیر تھا' الجھن تھی اور لب چھونے کو بے تاب ان گنت سوالات۔

یہ تو شکر تھا دادی اس وقت آس پاس نہیں تھیں ورنہ تو وہ موقع محل دیکھے بغیر ہنگامہ کھڑا کر دیتیں۔ ساس اب اس خاتون سے اپنے بیٹوں کی شادی کے منصوبوں پر بات کر رہی تھیں۔ میں بمشکل اپنا ٹھنڈا وجود سنبھالتی ایک کرسی پر آ بیٹھی تھی اور پھر آنے کے وقت تک اس سے نہیں اٹھی۔

☼ ☼ ☼

"ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ غضب خدا کا..... میں پوچھتی ہوں تم نے اسی وقت زرینہ کا منہ بند کیوں نہیں کر دیا۔ جب وہ سب کے سامنے تمہاری بیٹی پر اپنا حق جتا رہی تھی؟" دادی شدید غصے میں تھیں۔ گھر آتے ہی امی سے صبر نہیں ہوا اور اب دادی کا طیش کم ہونے میں آرہا تھا۔ اور میں ایک کونے میں بیٹھی اس ساری صورت حال کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے تو لباس بدلنے کا وقت بھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی اب دادی کے اس غصے کو دیکھتے ہوئے میرا وہاں سے اٹھنے کا دل کر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو میں کپڑے بدلنے اٹھوں اور دادی مزید کچھ شوشے چھوڑ دیں۔

"مگر تم کچھ کیوں کہتیں' تمہاری تو دلی مراد پوری ہو رہی تھی۔ برا بھلا' نکما' آوارہ جیسا بھی ہو۔ بس! تمہارے بھائی کا بیٹا ہو۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تم نے اسی وقت اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دے دیا۔ کہ لو! اسے بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤ..... ہم کمین..... ہماری تو قسمت جاگ اٹھی جو تم نے ہماری بیٹی قبول کر لی۔" اب ان کی توپوں کا رخ امی کی طرف ہوا تھا۔ امی کا رنگ زرد ہو گیا۔

"خدا کے لیے اماں..... یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں کیا بھری محفل میں ان سے جھگڑا کرتی..... تماشا بناتی..... جو بات آرام سے ہو سکتی ہے وہ....."

"آرام سے..... یہ آرام سے کرنے والی بات تھی؟ ہمیں پوچھے بغیر..... ہمیں بتائے بنا وہ ہماری بچی اپنے بیٹے سے منتھی کر رہی تھی اور تم کہہ رہی ہو کہ۔

تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے یا پھر بھائی کی محبت میں اندھی ہوگئی ہو؟ کل کو وہ پوری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹ دے گی اور تم بیٹھی چین کی بنسی بجاتی رہنا۔ آئے گا پھر کوئی تمہاری بیٹیوں کو پوچھنے؟ گھر بیٹھی بوڑھی ہوجائیں گی۔" دادی کا غضب شدید تر ہوتا جارہا تھا۔

"ایسا نہیں ہوگا اماں۔۔۔ بھابھی کہہ رہی تھیں کہ ان کے دل میں تو بہت پہلے سے یہ خواہش تھی اور اب صفیہ کے آنے کے بعد تو انہیں اس ہفتے باقاعدہ رشتہ لے کر آنا تھا۔ مگر اس وقت جب آمنہ کی بہن نے پوچھا تو ان سے صبر نہیں ہوا اور انہوں نے ان کے سامنے پہلے ہی یہ بات ظاہر کردی۔" امی گھبرا کر وضاحت دینے لگیں۔

"بات تو پھر وہی آگئی۔ اسے یہ یقین ہی کیوں تھا کہ ہم اپنی بچی کا رشتہ اس کے نالائق بیٹے سے طے کردیں گے؟ جس کا نہ کوئی کام ہے' نہ دھندا۔۔۔ نہ جانے کہاں کہاں آوارہ گردیاں کرتا پھرتا ہے۔ نہ اسے وقت پر کبھی گھر آتے دیکھا' نہ جاتے۔۔۔ صورت الگ غنڈوں موالیوں جیسی۔۔۔ اپنے لائق فائق بیٹوں کے لیے تو دنیا جہان میں گھوم لیں۔ تب اسے ہم یاد نہیں آئے؟ اب خیال آیا ہے ہم پر یہ احسان دھرنے کا؟ مگر میں تم سے کہے دے رہی ہوں فاخرہ۔۔۔ کل اسے جواب میں دوں گی۔ ہماری بیٹی ہم پر اتنی بھاری نہیں ہے' جو اسے اندھے کنویں میں دھکیل دیں۔" دادی کا لہجہ ناراضی سے بھرپور تھا۔ امی بے بسی سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"مگر اماں! معید میں خرابی ہی کیا ہے؟ اپنا بچہ ہے۔ ہمارے سامنے پلا بڑھا ہے۔ صرف یہ کہ اس کی نوکری نہیں ہے تو۔۔۔"

"میں جانتی تھی تم یہی کہو گی۔" دادی نے انہیں بات بھی پوری نہیں کرنے دی۔ "تمہاری نیت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔۔۔ تمہارا بس چلے تو دونوں بیٹیوں کو ہاتھ سے پکڑ کر ان کے گھر چھوڑ آؤ۔ مگر میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ بچی سے جان چھڑانے کی اتنی ہی جلدی ہے تو ابھی صفیہ کو فون کرکے "ہاں" کہہ دو۔ تمہارے بھائی کے خاندان سے تو ہزار گنا بہتر ہے ان کا خاندان' پھر پوری عزت اور مان کے ساتھ آکر رشتہ مانگا ہے۔ تمہاری بھابھی کی طرح ہمیں ہماری اوقات نہیں دکھائی۔ آج ہمیں بنا پوچھے خود سے ہی رشتہ طے کردیا۔ کل کو بارات لے کر دروازے پر کھڑی ہوگی۔" دادی بولے جارہی تھیں۔ امی کے چہرے پر مایوسی چھاگئی۔ اپنے اعصاب کو جکڑتی بے چینی سے گھبرا کر میں وہاں سے اٹھ آئی۔

"نیلی۔۔۔ اب کیا ہوگا۔" میں جیسے ہی اپنے کمرے میں آئی' صبا نے مجھے دیکھتے ہی ہراساں لہجے میں یہ سوال کیا۔ مجھے لگا تھا وہ سو چکی ہوگی۔ مگر وہ نہ صرف جاگ رہی تھی' بلکہ ساری باتیں بھی سن چکی تھی۔

"کیا۔۔۔؟" میں نے خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے الماری کھولی۔

"دادی تو کل مامی کو صاف منع کردیں گی۔" اس کا لہجہ تشویش سے پر تھا۔

"تو کیا نہیں کرنا چاہیے؟" کپڑے نکالتے ہوئے میں نے مڑکر حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم چاہتی ہو' وہ انکار کردیں؟" اس کا انداز اتنا بے یقین سا تھا' جیسے میں نے پتا نہیں کیا کہہ دیا ہو۔

"میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوگا تو وہی جو دادی چاہتی ہیں۔" میں کہہ کر واش روم کی طرف بڑھنے لگی تھی کہ صبا نے میرا بازو پکڑلیا۔

"رکو نیلی! مجھے تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔ تم چاہتی تھیں ناکہ تم مامی کی بہو بنو۔۔۔ پھر اب اس طرح تم ساری بات دادی کی مرضی پر کیسے ڈال سکتی ہو؟" وہ ناراض' ناراض سی کہہ رہی تھی۔ میں نے نرمی سے اس سے اپنا بازو چھڑالیا۔

"میں مامی کے گھر جانا ضرور چاہتی تھی' مگر معید کے حوالے سے بالکل نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

"کیا خرابی ہے معید میں؟" اس نے پوچھا۔ میں نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ میں جانتی تھی وہ مجھ سے یہ سوال ضرور کرے گی۔

"اس کی بے ترتیب شخصیت' اس کی لاابالی

فطرت' اس کی غیر سنجیدگی۔ وہ زندگی میں کسی چیز کے لیے سنجیدہ نہیں ہے۔ اس کے لیے وقت صرف ضائع کرنے کی چیز ہے۔ اسے ماسٹرز کیے بھی سال بھر ہونے کو ہے' مگر اس نے ایک بار بھی ڈھنگ کی نوکری کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ چند ٹیوشنز پڑھا کر وہ سمجھتا ہے' اس نے بہت بڑا تیر مار لیا ہے۔ لڑکیاں' لڑکیاں ہوتی ہیں صبا! مگر مردوں کو یہ لاپروائی زیب نہیں دیتی۔ مردوں کو مضبوط شخصیت کا' مستقل مزاج اور ذمہ دار ہونا چاہیے۔۔۔ جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔ ارمان بھائی ہیں۔" دوٹوک لہجے میں اس پر اپنا موقف واضح کرتے میرا لہجہ آخر میں ذرا دھیما پڑا اور وہ چونک گئی۔

"تم۔۔۔ تم۔۔۔ ارمان بھائی کو پسند کرتی ہو؟"

"جیسے تم سوچ رہی ہو' ویسے بالکل نہیں۔" میں نے بھرپور انداز میں کی نفی کی۔ "میں صرف ان کی شخصیت سے متاثر ہوں اور میں چاہتی ہوں' جس سے میری شادی ہو' وہ بھی ایسی ہی خوبیوں کا مالک ہو۔"

"معید تمہیں پسند کرتا ہے۔" اس نے اچانک ہی اتنے اعتماد سے یہ بات کی کہ میرے وجود کے ساتھ ساتھ ایک پل کے لیے میرا دل بھی ساکت ہوگیا۔ جس غیر واضح اور مبہم سے احساس نے ابھی میرے دل کے نہاں خانوں میں ابھرنا شروع ہی کیا تھا۔ جس کے ہونے کو ابھی میں بھی ٹھیک سے محسوس نہیں کرپارہی تھی' وہ اس نے کیسے پالیا۔

"اور تم جانتی ہو یہ بات۔۔۔ ہے نا؟" اس نے شاید میرے چہرے سے بہت کچھ بھانپ لیا تھا۔ میرا شانہ ہلاتے ہوئے اس کا لہجہ تیز ہوا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ "یہ فضول باتیں اپنے ذہن سے نکال پھینکو' سمجھیں۔ آئندہ میں تمہارے منہ سے ایسی کوئی بکواس نہ سنوں۔" سختی سے کہتے ہوئے مجھے اسے اپنے بڑے پن کا رعب دکھانا ہی پڑا۔ میں نہیں چاہتی تھی آئندہ وہ کوئی ایسی بات کرکے مجھے مزید ڈسٹرب کرے۔ اس کی رنگت پھیکی پڑگئی۔ میں نظر انداز کرکے واش روم کی طرف بڑھ آئی۔

☆ ☆ ☆

صبح میری آنکھ امی کی آواز سے نہیں' بلکہ ندا پاشا کی آواز سے کھلی تھی۔ چند لمحے خوابیدہ اعصاب کو بیدار کرنے میں گزر گئے۔ حواسوں کے جاگتے ہی میں نے حسب عادت کل رات کی آخری بات یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور ڈالا اور دوسرے ہی پل میں اٹھ بیٹھی۔ آدھی رات تک اسے سوچ سوچ کر جاگتے رہنے کے بعد اب اس کی یاد آتے ہی مجھے اپنی صبح کا لطف غارت ہوتا محسوس ہوا۔ صبا ٹی وی کے سامنے براجمان مارننگ شو لگائے بیٹھی تھی۔

"تم آج کالج نہیں گئیں؟" کیچر کی تلاش میں تکیے کے پاس ہاتھ مارتے میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ گئی ہوں۔۔۔ یہ تو میرا ہمزاد بیٹھا ہے۔" وہ اگر کبھی کسی سوال کا سیدھا جواب دے دیتی تو وہ تاریخ ڈائری میں لکھنے کے قابل ہوتی تھی۔

"تم کالج کیوں نہیں گئیں؟" صبح ہی صبح میں بحث سے گریز کرنا چاہ رہی تھی' سو بمشکل موڈ نارمل رکھا۔

"آج ماہی آرہی ہیں اور میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔" چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس نے بتایا۔

"یہ اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھے گا' یہ کھڑا ہی رہے گا۔" میں کیچر میں بال سمیٹتی بستر سے اتر آئی۔

"میں چاہتی ہوں نیلی! تم دادی کو منع کرو۔"

"کس بات سے؟" میں نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔

"کہ وہ ماہی کو انکار نہ کریں۔" اس کا لہجہ التجائیہ تھا۔ میں الجھ گئی۔

"تم نے تو معید کو کبھی پسند نہیں کیا' پھر تم اس کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہو؟" دوبارہ۔۔۔ بیڈ کے کنارے ٹکتے میں نے اس سے پوچھا۔

"تم تو پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو نیلی۔۔۔ میرا وہ بچگانہ سا غصہ تھا۔ کوئی ذاتی پرخاش یا نفرت تو نہیں تھی' بلکہ مجھے تو ان چاروں بھائیوں میں ارمان بھائی کے بعد صرف معید ہی اچھا لگتا ہے۔ اگر تمہارا اعتراض اس کے جاب لیس ہونے پر ہے تو اسے جلد ہی جاب بھی مل جائے گی۔ اگر تمہاری ناپسندیدگی اس کے لاپروا اسٹائل یا اس کے رف حلیے پر ہے تو میں تمہیں بتاؤں کہ لڑکیاں اس کے اسی لک پر مرتی ہیں۔"

"میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔" میں نے اٹھ کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ کیا میں واقعی اس کی ظاہری شخصیت کی وجہ سے اسے ریجیکٹ کر رہی ہوں۔ اپنے سوجے پپوٹوں کو دیکھتے ہوئے میں نے خود سے سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔ تم ان سے کہیں زیادہ سطحی اور چھچھوری ہو۔" وہ میری بات کے جواب میں جل کر بولی۔ میں نے اسے دیکھا' مگر کچھ کہنے کی زحمت نہیں کی۔ میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی۔ میرے من میں سوالات اٹھتے۔ ذہن و دل میں کشمکش چلتی اور دل و دماغ کی اس جنگ میں اگر فتح دماغ کی ہوتی تو ہاتھ مجھے اپنے دل سے دھونے پڑتے اور میں خود کو اس آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

"رات سے تمہارے ابو کو فون کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مگر ان کا فون ہی نہیں مل رہا۔" امی نے ناشتا میرے سامنے رکھتے ہوئے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا تو میں چونک گئی۔

"کیوں فون کر رہی ہیں آپ انہیں؟"

"تاکہ وہ اپنی ماں سے بات کر کے انہیں سمجھائیں۔۔۔ اور کس لیے کروں گی؟ جانے کس بات کی دشمنی نکال رہی ہیں وہ میرے میکے والوں سے۔ پہلے اس بات پر طعنے دے دے کر میرا جینا حرام کیا کہ بھائی نے میری کوئی بیٹی نہیں لی اور اب جب وہ رشتہ مانگنے آرہے ہیں تو بھی ان کا اعتراض۔۔۔ میرے لیے ارمان' معید اور فرخ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر اماں کو معید چھٹا ہوا بدمعاش نظر آتا ہے اور ارمان اور فرخ شہزادے' ورنہ صرف نوکری ہی نہیں ہے نا معید کے پاس' صورت میں' مزاج میں ان دونوں سے بڑھ کر ہے۔ فرخ کا تو دماغ ہی ساتویں آسمان سے نیچے نہیں اترتا اور ارمان الگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر خوش ہے۔ ان میں بس معید اور آفاق ہی ہیں ہنس مکھ اور ملنسار۔۔۔ مگر اماں کو تو مجھے نیچا دکھانے کا موقع چاہیے۔ وہ اسے بھی میری ذلت قرار دے رہی ہیں کہ بھائی نے قابل بیٹے چھوڑ کر اپنے ناکارہ بیٹے کے لیے میری بیٹی کا ہاتھ مانگا۔" امی دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔ دادی کے سامنے تو وہ کچھ بول نہیں پاتی تھیں' مگر بعد میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑے بنا انہیں چین نہیں آتا تھا اور ایسے میں ان کی بہترین سامع میں ہی ہوتی تھی۔

"تو اب آپ کیا کریں گی؟" ناشتے سے میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ سو چائے کا کپ اٹھا کر گرما گرم چائے حلق میں انڈیلی۔

"وہی تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔" وہ ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی تھیں۔ میں اضطراب سے اپنی پیشانی سہلانے لگی۔ پتا نہیں امی طرف داری سے کام لیتے ہوئے بھتیجے کے حق میں ہو گئی تھیں یا پھر دادی ہی بے جا ضد میں آکر زیادتی کر رہی تھیں۔ جو بھی تھا جان میری پھنسی تھی اور میں خود سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

٭ ٭ ٭

اس دن ماہی اور ماموں دوپہر کے بعد آئے تھے اور تب تک میں جلے پیر کی بلی کی طرح پورے گھر میں چکراتی پھری تھی۔ صبا کو فضول میں اپنے چھٹی کرنے کا افسوس ہوا تھا۔ اور آفاق جو ویسے تو دن میں پانچ' چھ چکر لگا جاتا تھا' اس دن ایک بار بھی جھانک کر نہیں گیا تھا۔ مگر ان کے آنے کے تھوڑی دیر بعد وہ بھی آن وارد ہوا۔ آنکھوں میں شرارت لیے ہنسی نکالے۔

"صبح سے کہاں مرے ہوئے تھے؟ اب خیال آیا ہے آنے کا؟" میں اس وقت کچن میں تھی' جب اس نے جھانکا اور اس کے چہرے پر چھائی معنی خیز مسکراہٹ نے مجھے لمحوں میں سلگا دیا۔

"لگتا ہے تم کافی بے تابی سے تمہارا انتظار کر رہی تھیں۔" وہ اندر آتے ہوئے ہنسا۔ وہی جان جلانے والی ہنسی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ دوبارہ بول اٹھا۔

"ویسے سوری! میں نے سوچا ہے' اب میں تمہیں 'تم' نہیں کہوں گا۔۔۔ بھابھی بننے جا رہی ہو نا! وہ بھی بڑی' معید۔۔۔ میری کھال کھنچوا لے گا۔" وہ یوں پوز کر رہا تھا جیسے واقعی معید سے بہت ڈرتا ہو۔

"تم نے آج تک معید کو کبھی بھائی جان کہا ہے' جو اسے بھابھی کہو گے؟" سنک کے سامنے کھڑی برتن دھوتی صبا اس کی بات پر دخل دیے بغیر نہ رہ سکی۔

"بکواس بند کرو صبا!" میں نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔ یہ موضوع مجھے بے زار کیے دے رہا تھا۔

"نیلی! تم شرما رہی ہو؟" آفاق نے بغور مجھے دیکھا۔

"یہ تم پوچھ رہے ہو کہ بتا رہے ہو؟" صبا نے حیرانی سے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں پوچھ رہا تھا۔ اصل میں نیلی کبھی شرمائی نہیں ہے نا تو اسے پتا بھی نہیں ہو گا کہ شرمایا کیسے جاتا ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میں کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر ٹرے میں چائے کے کپ سیٹ کرنے لگی۔

"صبا! یہ برتن چھوڑو اور آکر یہ چائے اندر لے جاؤ۔" میں صبا سے مخاطب ہوئی۔

وہ سب لوگ دادی کے کمرے میں بیٹھے تھے جو کچن سے کافی ہٹ کر تھا۔ یہاں تک باتوں کی آواز تو نہیں آرہی تھی' مگر مجھے پریشانی تھی کہ اندر پتا نہیں کیا صورت حال ہو گی۔ کل رات تو دادی بہت برہم تھیں۔ کہیں وہ انکار کے لیے بھی زیادہ سخت الفاظ نہ استعمال کر لیں۔ کہیں وہ ماموں اور ماہی کی بے عزتی ہی نہ کر دیں۔ ان اندیشوں میں ایک امی کا خیال ہی تھا جو مجھے ذرا تسلی دے رہا تھا کہ وہ معاملہ سنبھال لیں گی۔ صبا شاید میری کیفیت سمجھ گئی تھی اسی لیے بنا کسی جرح کے آکر ٹرے لے گئی۔ آفاق بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"انعمتہ کل جا رہی ہے۔" تھوڑی دیر بعد اس نے بتایا تو میں چونک گئی۔

"اچھا!"

"نیلی!" چند لمحوں بعد اس نے دوبارہ مجھے پکارا' مگر اس بار اس کے لہجے میں بے چینی سی تھی۔

"کیا ہے؟" میں تنگ سی ہو گئی۔

"تم خوش نہیں ہو۔" وہ میرا چہرہ جانچ رہا تھا۔

"کس چیز سے؟" میں نے بے تکا سا سوال کیا۔

"اس رشتے سے؟" اس نے جواب دیا۔

"یہ رشتہ ابھی ہوا کہاں ہے؟" میں نظریں چراتے ہوئے دھلے ہوئے برتن ریک میں لگانے لگی۔

"نیلی!" اس کی آواز بلند ہوئی۔ مضطرب سا وہ میرے سامنے آیا۔ "تمہارا اس بات سے کیا مطلب ہے۔" وہ پرتشویش لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" میں چڑ گئی۔

"پھپھو انکار کرنے والی ہیں؟" اس نے اندازہ لگانا چاہا۔

"میں نہیں جانتی۔" میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"تو کیا جانتی ہو تم؟" وہ اتنے زور سے بولا کہ میں

بے اختیار اچھل گئی۔
"کوئی وجہ تو ہوگی نا کہ تم اس طرح۔۔۔" وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میں اس کی پوری بات سنے بغیر برتن پٹخ کر باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

دادی نے وہی کہا تھا' جو وہ پہلے سے طے کر چکی تھیں۔ ماں بہت ناراض ہو کر گئی تھیں۔ گو کہ دادی نے پھر بھی ویسا رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا جسے سوچ سوچ کر میں اپنا آدھا خون جلا چکی تھی' مگر پھر بھی انکار کی سبکی ماں کے لیے کچھ کم نہیں تھی اور میرا جو یہ خیال تھا کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے معید میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اب زیاں کا احساس اتنا گہرا تھا کہ مجھے اپنا آپ خالی ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کچھ کھو دیا تھا اور جو کھویا تھا' وہ میرے لیے اتنا ضروری تھا کہ اس کے آگے باقی ہر چیز غیر اہم ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ میرا اپنا وجود بھی۔
اور اس وقت کمرے میں اندھیرا کیے جب میں اپنے آپ سے بھی چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ صبا کی آواز مجھے اپنے بالکل قریب سنائی دی۔
"نیلی! معید آیا ہے۔" اس نے دھیرے سے میرا شانہ ہلایا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں برقی لہریں دوڑتی محسوس ہوئیں۔ دوسرے ہی پل میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔
"کہاں۔۔۔؟"
"شاید امی سے بات کرنے آیا ہے۔ مجھے لگتا ہے' اس نے بہت برا مانا ہے اس بات کا۔" اپنا دوپٹا اٹھا کر اوڑھتے ہوئے میں نے برآمدے کی سمت دیکھا۔
"دادی بھی وہیں ہیں؟" میرے ذہن میں یہ خدشہ سرسرایا تھا۔
"نہیں۔۔۔ معید امی کے کمرے میں ہے اور دادی کو ابھی اس کی آمد کا نہیں پتا۔"
میں اٹھ کر باہر آئی۔ ابھی دوپہر ڈھلی نہیں تھی اس کا مطلب تھا دادی ابھی سو ہی رہی ہوں گی۔ میں سوچتے ہوئے امی کے کمرے کے پاس آئی۔ مگر اندر داخل ہوتے ہوتے رک گئی۔ میں معید کا سامنا کیسے کروں گی۔ اب تو بہت کچھ بدل گیا ہے۔ میرے دل نے بے اختیار مجھے روکا۔
"آپ نے انکار کیوں کیا پھپھو؟" اس کی بھاری آواز کمرے کی حدود سے نکل کر میری سماعتوں تک پہنچی اور میرے پیروں میں زنجیر سی پڑ گئی۔ وہ انکار کی وجہ جاننے آیا تھا۔ اس کا مطلب اسے بات سے فرق پڑا تھا۔
"انکار میں نے نہیں کیا معید! میرے لیے تو سب سے بڑھ کر تم ہو۔۔۔ یہ تو نیلی کی دادی نہیں چاہتیں کہ۔۔۔" امی بے چارگی سے بول اٹھیں۔
"تو آپ انہیں منا سکتی تھیں نا۔ مجھے بیٹا مانا ہے آپ نے تو اپنے بیٹے کے لیے تو آپ انہیں کنونس کر سکتی تھیں۔ مگر آپ ایسا کیوں کرتیں۔ میں فرخ نہیں تھا نا جو مجھے کوئی فیور دیا جاتا یا کچھ سوچنے کی زحمت ہی کر لی جاتی۔" اس کے تلخ لہجے میں عجیب سی چبھن تھی۔
"تم غلط سمجھ رہے ہو معید۔ ایسی بات بالکل نہیں ہے۔" امی کو یقیناً اس کی بات دل پر لگی تھی۔
"مجھے افسوس انکار کا نہیں ہے پھپھو۔ مجھے دکھ اپنی بے وقعتی کا ہوا ہے۔ میری جس بے کاری اور فراغت کو بنیاد بنا کر آپ نے مجھے ریجیکٹ کیا ہے' وہ صرف اسی ہفتے تک ہی تھی۔ اگلے ہفتے سے میں اپنی جاب جوائن کرنے والا تھا اور آپ نے اس ایک ہفتے کے بدلے مجھ سے میری زندگی بھر کی خوشیاں چھین لیں۔" وہ بے پناہ دل برداشتہ ہوا تھا اور یہ دکھ اس کی یہ تکلیف اس کے لہجے میں بھی اتر آئی تھی۔
"اگر آپ لوگ رسمی طور پر بھی سوچنے کے لیے کچھ وقت لیتے تو کم از کم یہ تو جان ہی لیتے کہ میں اتنا بھی ناکارہ نہیں ہوں۔ مگر اس طرح۔۔۔ دو ٹوک انکار۔۔۔ وہ بھی امی ابو کے منہ پر۔" تاسف سے اس کا لہجہ دھیما پڑا تھا۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ امی اس لمحے بالکل خاموش تھیں۔ ان کے پاس کہنے کے لیے رہ بھی

کیا گیا تھا۔
"آئم سوری پھپھو۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "میں آپ سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معاف کر دیجیے اگر آپ میری باتوں سے ہرٹ ہوئی ہیں تو۔۔۔"
وہ دھیرے سے کہہ کر باہر نکلا تھا اور میں جو دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی' اس کے اچانک نکلنے پر ہٹ بھی نہ سکی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر رکا تھا اور میری دھڑکنیں اسے دیکھ کر مدھم ہو گئی تھیں۔ آنکھوں میں بے پناہ خفگی سمیٹے' چہرے پر بے تحاشا سنجیدگی لیے۔۔۔ اس کے ناراض سے چہرے اور تنے ہوئے خوب صورت نقوش پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنے خالی دل میں روشنی سی بھرتی محسوس ہوئی۔ اس کی ایک جھلک نے ہی میرا من اجال سا دیا تھا۔ ساعت بھر کے لیے آنکھیں بند کر کے کھولتے ہوئے نظروں نے اس کے ہونے کا یقین پاگل دل کو دلایا تھا۔
اس کی آنکھوں میں حیرت سی امڈی تھی' مگر دوسرے ہی لمحے سر جھٹکتے ہوئے وہ تیزی سے میرے پاس سے ہو کر گزر گیا اور میں اس کے قدموں کی دھمک سنتے سلگتے وجود کے ساتھ وہیں بیٹھ کر ان مٹی زدہ جوتوں کے نشان پر ہاتھ پھیرنے لگی جس پر کچھ دیر پہلے وہ کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج فضا میں عجیب سا حبس تھا۔ ہوا بند تھی اور گھٹن ایسی کہ سانس تک لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی گھٹن سے گھبرا کر میں نے پانی کا پائپ لگا کر صحن دھویا۔ کیاریاں پودے نہلائے۔ خود بھی بھیگی۔ دیواروں کو بھی بھگو دیا۔
"نیلی! کیا کر رہی ہو۔۔۔ پڑوسیوں پر بن بادل برسات برسانے کا ارادہ ہے کیا۔۔۔؟"
سامنے کی دیوار پر پانی برساتے ہوئے مجھے اپنی پشت پر آفاق کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ برآمدے میں کھڑا تھا اور ساتھ میں انعمتہ بھی تھی۔
میں مسکرائی اور پائپ ایک طرف رکھ کر میں اس کے پاس چلی آئی۔
"آؤ نا انعمتہ۔۔۔ کھڑی کیوں ہو۔" میں نے مصافحہ کے لیے اس کا ہاتھ تھاما۔
"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم آئیں نہیں۔" اندر آتے ہوئے وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ انداز میں کوئی شکوہ نہیں تھا' پھر بھی میں شرمندہ سی ہو گئی۔ آفاق نے مجھے بتایا تو تھا کہ وہ جائے گی۔ مگر مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ جا کر ماں کا سامنا کرتی۔
"میں آنے ہی والی تھی مگر۔۔۔" پانی کی موٹر بند کرتے ہوئے میں کوئی بہانہ سوچنے لگی۔
"اجازت نہیں ملی ہوگی۔" آفاق اپنے جوتے اتارتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔
"نہیں۔۔۔ اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے وہاں آنے سے کون روکے گا۔ اصل میں مجھے ٹائم ہی نہیں ملا۔" میں جلدی سے بول اٹھی۔
"کوئی بات نہیں۔۔۔ تم نہیں آئیں تو میں آگئی۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "آنٹی اور صبا کہاں ہیں۔۔۔؟"
"امی کچھ دیر پہلے ہی گئی ہیں چھوٹی خالہ کے ہاں۔۔۔ اور صبا دادی کے کمرے میں ہے۔۔۔ آؤ۔" میں اسے ساتھ لیے دادی کے کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔
"انعمتہ! تم آ رہی تھیں تو۔۔۔ ماں نے کچھ کہا تو نہیں؟"
تھوڑی دیر بعد جب صبا چائے بنانے اور دادی وضو کرنے کے لیے اٹھیں تو میں نے جھجکتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔
"نہیں تو۔۔۔ وہ بھلا کیوں مجھے کچھ کہتیں؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔
"نہیں۔۔۔ میں نے سوچا شاید۔۔۔" میں کہتے کہتے چپ ہو گئی۔
"تم نے سوچا کہ وہ تمہارے گھر والوں کے انکار سے اتنی خفا ہوں گی کہ مجھے بھی آنے سے منع کر دیں

گی؟" انعمتہ نے خود ہی میری بات پوری کر دی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔

"ایک بات پوچھوں نیلی...! تم نے انکار کیوں کیا؟" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھی۔

"انکار میں نے نہیں کیا۔ انکار تو..."

"یعنی تم راضی تھیں؟" اس نے میری بات کاٹی۔

"مجھ سے کسی نے میری مرضی نہیں پوچھی تھی انعمتہ۔"

"مگر یہ تمہاری زندگی کا فیصلہ تھا اور تمہیں بیچ میں بولنا چاہیے تھا۔ اگر تم واقعی معید میں انٹرسٹڈ تھیں تو۔" وہ انجانے میں مجھے سوئیاں چبھو رہی تھی۔ میرا احساس زیاں بڑھنے لگا۔

"کاش! مجھے تب ہی یہ بات پتا چل جاتی۔" میرے دل سے ہوک اٹھی۔

"پتا ہے نیلی! شروع شروع میں مجھے یہی لگا تھا کہ تم دونوں ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم لوگ معید کے رشتے کو اس طرح ریجیکٹ بھی کر سکتے ہو۔ معید کی نوکری نہیں تھی تو یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں تھا۔ آج نہیں تو کل اسے مل ہی جاتی... اور مل بھی گئی۔ رشتے داری میں ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی... مگر مجھے زیادہ حیرت تم پر ہو رہی ہے... تم چپ رہیں، تمہیں کوئی فرق نہیں پڑا اور تم اب بھی بہت خوش ہو۔"

"میں خوش نہیں ہوں۔" میں بے اختیار بول اٹھی۔ "لیکن میں کیا کر سکتی ہوں؟" میرے لہجے میں بے بسی در آئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

"تم ہی کچھ کر سکتی ہو نیلی... اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو..."

"میری جگہ تم ہوتیں تو بولتیں؟" میں اس کی بات پوری ہونے کا انتظار کیے بغیر ہی بول پڑی۔

"یقیناً" بولتی اور بولوں گی۔ خالہ اگلے ہفتے ہمارے گھر آ رہی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا، مگر میں جانتی ہوں ان کے آنے کا مقصد... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ فرخ کسی اور کو پسند کرتا ہے۔ اسی لیے میں تمہاری طرح چپ رہنے کی بے وقوفی نہیں کروں گی۔" وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔ میں حیرت سے کتنی دیر تو اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"تم انکار کرو گی؟" میں نے بے یقینی سے دریافت کیا۔

"ظاہر ہے... ان چاہا بن کر کسی پر عمر بھر مسلط ہونے کی اذیت اور تکلیف سہنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں اچھے مستقبل کی محض موہوم سی امید پر اپنی پوری زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ بھلا فرخ میں ایسا کیا ہے، جو مجھے کسی اور میں نہیں مل سکتا... میں بہت ہی عجیب فطرت کی لڑکی ہوں نیلی... مجھے ہر چیز ان چھوئی اور کوری چاہیے... پھر جیون ساتھی کے معاملے میں، میں کوئی سمجھوتا کیسے کر سکتی ہوں... ایک ایسے شخص کا انتخاب کیسے کر سکتی ہوں... جس کے دل پر مجھ سے پہلے کسی اور کی چھاپ ہو۔"

"ہاں... ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔" میں نے سر ہلایا۔ "بھلا فرخ میں ایسا کیا ہے، جو تمہیں کسی اور میں نہیں مل سکتا۔ تم تو اتنی اچھی ہو کہ تمہیں تو کوئی اپنے دل کی پوری خوشی، اپنی اولین خواہش سمجھ کر اپنی زندگی میں شامل کرے گا۔"

"مگر تم تو واقعی میں اتنی لکی ہو نیلی... تم تو سچ مچ کسی کا پہلا پیار، کسی کی پہلی خواہش ہو۔ پھر تم کیوں اسے اپنے ہی ہاتھوں سے کھونے جا رہی ہو؟" وہ میرے ہاتھ تھام کر بے تاب سی ہو کر کہنے لگی۔ "معید بظاہر کتنا ہی لاابالی کیوں نہ نظر آتا ہو، مگر میں نے اس کی آنکھوں میں جو جذبے تمہارے لیے دیکھے ہیں، وہ اتنے بے مول ہرگز نہیں ہیں کہ تم اسے اس طرح ٹھکرا دو۔ سچ کہنا نیلی! کیا تمہیں بالکل کچھ محسوس نہیں ہو رہا کہ تم کتنی بڑی غلطی کر رہی ہو؟"

"ہاں... ہو رہا ہے۔" میرا دل بے اختیار چلا اٹھا۔

"مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں معید کو کھونا نہیں چاہتی، کیونکہ میں جانتی ہوں، جو مجھے معید سے مل سکتا ہے... وہ مجھے کسی سے نہیں مل سکتا۔ چاہے پوری دنیا ڈھونڈ لوں تو بھی نہیں... کیونکہ معید جیسا کوئی نہیں... معید جیسا کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔"

کتنی عجیب بات تھی یہ وہی معید تھا، جسے میں نے کبھی قابل توجہ نہ جانا۔ اس کے خوش لباس اور رکھ رکھاؤ والے بھائیوں کے مقابلے میں اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دی کہ اگر کبھی میرا دل مجھے اس کی طرف سے کوئی سگنل دینے کی کوشش بھی کرتا تو میں ان سنا کر دیتی۔ کیونکہ مجھے اس کے بارے میں سوچنا ہی نہیں تھا۔ میں کوئی حسینہ عالم نہیں تھی کہ جو مجھے دیکھتا۔ میرا شیدائی ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پہلے ارمان میری خواہش کرتا اور پھر فرخ... مگر یہ معید کی نظریں تھیں۔ یہ معید کے جذبے تھے، جس نے مجھے اتنا خاص بنا دیا کہ آج انعمتہ مجھے خوش قسمت قرار دے رہی تھی۔ اگر میں اسے نہ ملتی تو وہ کنوارا نہ رہتا۔ کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔ اسے بھی کوئی مل جاتی۔ شاید مجھ سے زیادہ اچھی۔ مگر نقصان میرا ہوتا۔ کیونکہ یہ محبت کا معاملہ تھا اور محبت کا نقصان... پھر صرف محبت کا ہی نہیں رہتا، زندگی کا نقصان بن جاتا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر انعمتہ کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

"انعمتہ! میرا ایک کام کرو گی؟"

"ہاں! بولو نا۔" وہ جلدی سے کہہ اٹھی۔

"معید سے کہنا۔ ایک بار پھر مامی کو یہاں آنے کی زحمت دے دے۔ اس بار انہیں مایوسی نہیں ہو گی۔" میرا لہجہ مضبوط تھا اور محض ایک لمحے میں کیا گیا میرا یہ فیصلہ اٹل۔

اس کی آنکھوں میں خوشگوار سی حیرت پھیلی تھی اور اس نے بے اختیار اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

"آفاق! اس بار تصویریں ذرا ڈھنگ کی کھینچنا۔ پچھلی بار کی تصویریں کیسی لی تھیں تم نے۔ پتا ہے ایک میں ... روتی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایک میں سوئی ہوئی اور ایک میں جماہی لیتی ہوئی۔" تیز لہجے میں کہتے ہوئے صبا کی آواز اتنی بلند تھی کہ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ وہ میرے بالکل قریب ہی تو بیٹھی تھی، بلکہ ایک وہ ہی نہیں، امی، دادی، مامی اور خاندان کے سب ہی لوگ ہمارے گھر کے اس چھوٹے سے لاؤنج میں میری منگنی کی اس سادہ تقریب کو پر رونق بنانے کے لیے میرے آس پاس ہی موجود تھے۔

تھوڑی دیر پہلے ہی مامی نے مجھے معید کے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی اور اب وقفے وقفے سے وہ مجھے بہت محبت بھرے انداز میں اپنے ساتھ لپٹا رہی تھیں۔ ناپسند تو خیر اپنوں نے مجھے کبھی بھی نہیں کیا تھا، مگر اب اس نئے نئے بننے والے ساس بہو کے رشتے کی مٹھاس ان کے ہر ہر انداز سے جھلک رہی تھی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر رہی تھی۔

معید آج بھی حاضر نہیں تھا، حالانکہ باقی سب ہی موجود تھے، مگر وہ ہمیشہ کی طرح نجانے کہاں غائب تھا۔

"نیلی! ذرا مسکرانے کی زحمت تو کر لو۔ تم تو آج بھی اتنے غصے میں لگ رہی ہو جیسے اپنی نہیں، کسی اور کی منگنی کی میں شرکت کرنے آئی ہو۔" آفاق کی شریر آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے گھورنے کی کوشش کی اور اسی وقت اس نے کھٹ سے تصویر کھینچ لی۔

"یہ تصویر بڑی زبردست آئے گی۔" وہ ہنسا۔

"مجھے پتا تھا۔ تم یہی کرو گے۔ لاؤ! یہ کیمرا مجھے دو۔" صبا نے غصے سے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے کیمرا چھینا۔ "اب میں تصویریں کھینچوں گی اور... مامی! یہ معید کہاں ہے۔ کیا اسے یہ بھی بھول گیا کہ آج اس کی منگنی ہے؟" اب کے وہ مامی سے مخاطب ہوئی اور باقی سب کو بھی جیسے خیال آیا۔

"ہاں... کہاں ہے معید؟" چھوٹی مامی نے پوچھا۔

"پتا نہیں... میں نے فون کر کے آنے کے لیے کہا تو تھا۔ شاید آنے والا ہو۔" فرخ نے بتایا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ شاید آنے والا ہو۔ اسے ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا نا۔" دادی کو غصہ آیا۔ وہ ویسے بھی ابھی تک کچھ روٹھی روٹھی سی تھیں۔

"آپ تو جانتی ہیں اماں... وہ گھر میں ٹکتا کہاں

ہے۔ صبح میں نے اسے گھر پر رہنے کے لیے کہا تو تھا۔ مگر اب دیکھیں۔" مامی کچھ شرمندگی سے دھیمے لہجے میں بولیں۔

مجھے اپنے دل میں بے چینی کی لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ میں نے اسے کئی دن سے نہیں دیکھا تھا۔ میں اسے اس کی ناراضی قرار دے کر تشویش میں بھی مبتلا ہو جاتی، اگر مامی کی دوبارہ آمد نہ ہوتی۔ میں مطمئن ہوگئی تھی کہ انعمتہ کے ذریعے اس تک پہنچائی گئی میری بات اس نے رکھ لی تھی۔ وہ خفا نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو مامی نہ آتیں۔ مگر اب اس اہم موقع پر اس کی غیر موجودگی نے مجھے پھر سے واہموں میں دھکیل دیا تھا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے ارد گرد دیکھا تھا۔

سب ہی موجود تھے مگر وہ...

"السلام علیکم!" اسی پل دروازے سے ابھرنے والی اس کی بلند بھاری آواز نے مجھے بھرپور طریقے سے چونکا گئی۔ میں نے بے اختیار دروازے کی طرف دیکھا۔ اس بات سے بے پروا کہ میں جو اتنی دیر سے ایک شرمیلی لڑکی بن کر بیٹھی تھی۔ اب میری اس بے باکی پر یہ لوگ کیا سوچیں گے۔

"سوری! مجھے کچھ دیر ہوگئی۔" نادم لہجے میں کہتے ہوئے اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرے۔

"بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی۔" اب اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تھی اور میرے انگوٹھی والے ہاتھ پر۔

"نہیں! ابھی اتنی دیر بھی نہیں ہوئی۔ بارات لے جانی تو ابھی باقی ہے۔" فرخ نے طنز کیا تھا۔

"ناں... میں نے تم سے کہا نہیں تھا گھر پر رہنے کے لیے... یہ کوئی وقت ہے آنے کا۔" مامی کا غصہ اسے دیکھ کر عود کر آیا۔

"میں تو ایک گھنٹے پہلے ہی آچکا تھا' یہ تو تیار ہونے میں ہی اتنی دیر لگ گئی۔"

"جی ہاں! انہیں تیار ہونے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ کبھی کبھار ہی تو اس طرح تیار ہوتے ہیں ہمارے بھائی۔" آفاق بھی پیچھے نہ رہا۔ ہنس کر کہتے ہوئے اس نے نک سک سے تیار معید پر چوٹ کی۔ وہ بنا کچھ کہے مسکرا دیا۔

پھر وہ میرے قریب بیٹھا تو اس کے کلون کی دلفریب مہک میری سانسوں میں اتر کر میرے دل کو تر و تازگی بخش گئی۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے ذرا سا گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ لائٹ براؤن کرتا شلوار میں ملبوس وہ اتنا وجیہہ لگ رہا تھا کہ میرا جی چاہا' میں اسے دیکھتی رہوں۔ خلاف معمول آج اس نے شیو بنائی ہوئی تھی۔ مگر ہونٹوں کے اوپر ہلکا ہلکا نیلا رواں آج بھی موجود تھا اور بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ اس کی گھنی مڑی ہوئی پلکوں والی بے حد گہری آنکھیں' میری آنکھوں سے ملتے ہی مسکرا دی تھیں۔ میں نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔

اس کے بیٹھتے ہی مامی نے اس کے منہ میں مٹھائی ٹھونسی۔ آفاق کھٹا کھٹ تصویریں لینے لگا... اور ذرا دیر میں جب سب ہی اپنی اپنی باتوں میں مصروف ہوئے اور ہمارا چھوٹا سا لاؤنج مختلف آوازوں سے گونجنے لگا' صبا چائے سرو کرنے لگی۔ میں نے دھیرے سے اس سے پوچھا۔

"تھے کہاں اتنی دیر سے؟" وہ چونکا۔

"ابھی سے بیویوں والی تفتیش شروع... منگنی والا دن ہے یار... آج تو تھوڑا شرما لو۔"

"مجھے لگا تھا کہ شاید تم ابھی تک خفا ہو۔" میں اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے قدرے ہچکچا کر بولی۔

"کس بات پر؟" وہ جو صوفے کی پشت سے ٹیک لگا چکا تھا۔ سیدھا ہو بیٹھا۔ "جس بات پر خفا تھا' جب وہ بات ہی نہیں رہی تو اسے دل میں رکھ کر میں اپنا آج کا اتنا خوب صورت دن کیوں خراب کرتا؟"

"اس دن کے بعد سے تم آئے نہیں تھے نا! اسی لیے میں نے انعمتہ سے تم سے بات کرنے کے لیے کہا اور..." اضطرابی لہجے میں کہتے ہوئے میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارا پیغام ملنے کے بعد ہی امی یہاں آئی ہیں تو میرے خیال میں مجھے تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہیے۔" سنجیدگی سے کہتا وہ مجھے حیران کر گیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس سے مجھے تمہارے دل کی بات تو ضرور پتا چل گئی' لیکن اگر تم ایسا نہ بھی کرتیں تو بھی میں اتنی آسانی سے تمہاری جان نہیں چھوڑنے والا تھا۔ امی کو بہت غصہ تھا' اسی لیے انہیں منانے میں تھوڑی دیر ہوگئی مجھے۔ مگر میرے ذہن میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ مجھے تمہاری تمنا چھوڑ دینی چاہیے۔ جہاں چاہ اور لگن ہو' وہاں مایوسی نہیں ہوتی۔ پھر میں تم سے دستبردار ہونے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا تھا؟" وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا اور اس واضح اظہار پر مجھے اپنا چہرہ تپتا محسوس ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا' صبا کی تیز آواز نے ہمیں چونکایا۔

"یہ لیجیے چائے... ویسے یہ آپ کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں اتنی دیر سے؟ مانا کہ منگنی شدہ ہوگئے ہیں مگر بندہ ذرا ماحول کا بھی خیال کر لیا کرتا ہے۔" صبا نے گھورتے ہوئے کپ ہمیں پکڑائے۔

"تمہاری بدتمیزیاں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں... اسی لیے میں سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسی سزا دوں تجھے..."

"کیا؟" صبا اس کی بات مکمل کرنے سے پہلے ہی چیخ اٹھی۔ "مجھ سے اتنی بڑی فیور پانے کے بعد بھی آپ مجھے کوئی رعایت دینے کے روادار نہیں ہیں؟"

"کیسی فیور... ایک چائے کے کپ کو تم فیور دینا کہتی ہو؟" وہ متعجب ہوا۔

"چائے کا کپ۔" اس نے دانت پیسے۔ "اپنی پیاری کی پوری سالم بہن دے رہی ہوں آپ کو۔" وہ ہنس پڑا۔

"یہ مجھ پر تمہارا نہیں' خدا کا احسان ہے اور شکر کہ اسی کا ادا کرتا ہوں۔" میں نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سر جھکایا۔ اسی وقت آفاق آ کر اسے تصویریں دکھانے لگا تھا۔ سب کی توجہ پھر سے اس جانب ہوئی تھی اور میری سرسری سی نظر ارمان اور فرخ پر سے ہوتی ہوئی اس پر آ کر ٹھہر گئی۔

وہ آج مجھے سب سے اچھا لگ رہا تھا۔ میری نظروں کو' میرے دل کو۔ اس وقت میرے ذہن میں کہیں دور دور تک یہ خیال نہیں تھا کہ میں مامی کی بہو بن رہی ہوں۔ محض ایک لمحے میں اچانک ہی دل سے نکلنے والی میری دعا اتنی جلدی قبولیت کا درجہ پا کر مجھے معید کا ساتھ بخش گئی تھی کہ اب اسی کا حوالہ مجھے میری پہچان لگنے لگا تھا۔

وہ اس دنیا سے الگ تھا یا نہیں تھا مگر میرے لیے تو ہر ایک سے بڑھ کر تھا کہ اب تو بات بھی محبت کی تھی۔

سیکڑوں سورج چمک اٹھیں بھی گر مل کر ایک ساتھ
سال کی ساری چودھویں راتیں بن جائیں ایک رات
بن ساجن کے قسم خدا کی پھر بھی لگے اندھیرا
میرا ساجن سب سے روشن' ساجن کی کیا بات

☼

ناولٹ

آمنہ ریاض

تم سلامت رہو

عبدالباقر لودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہروقت ہڈحرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔
شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی ساہر کو اس سے شدید جلن ہے وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔
ساہر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا ساہر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہروقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا نہ بنانے پر اس نے ساہر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام ساہر پر لگا دیا کہ ساہر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر ساہر کو دو تھپڑ مار دیتا ہے۔ ساہر کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔
تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

۴
چوتھی قسط
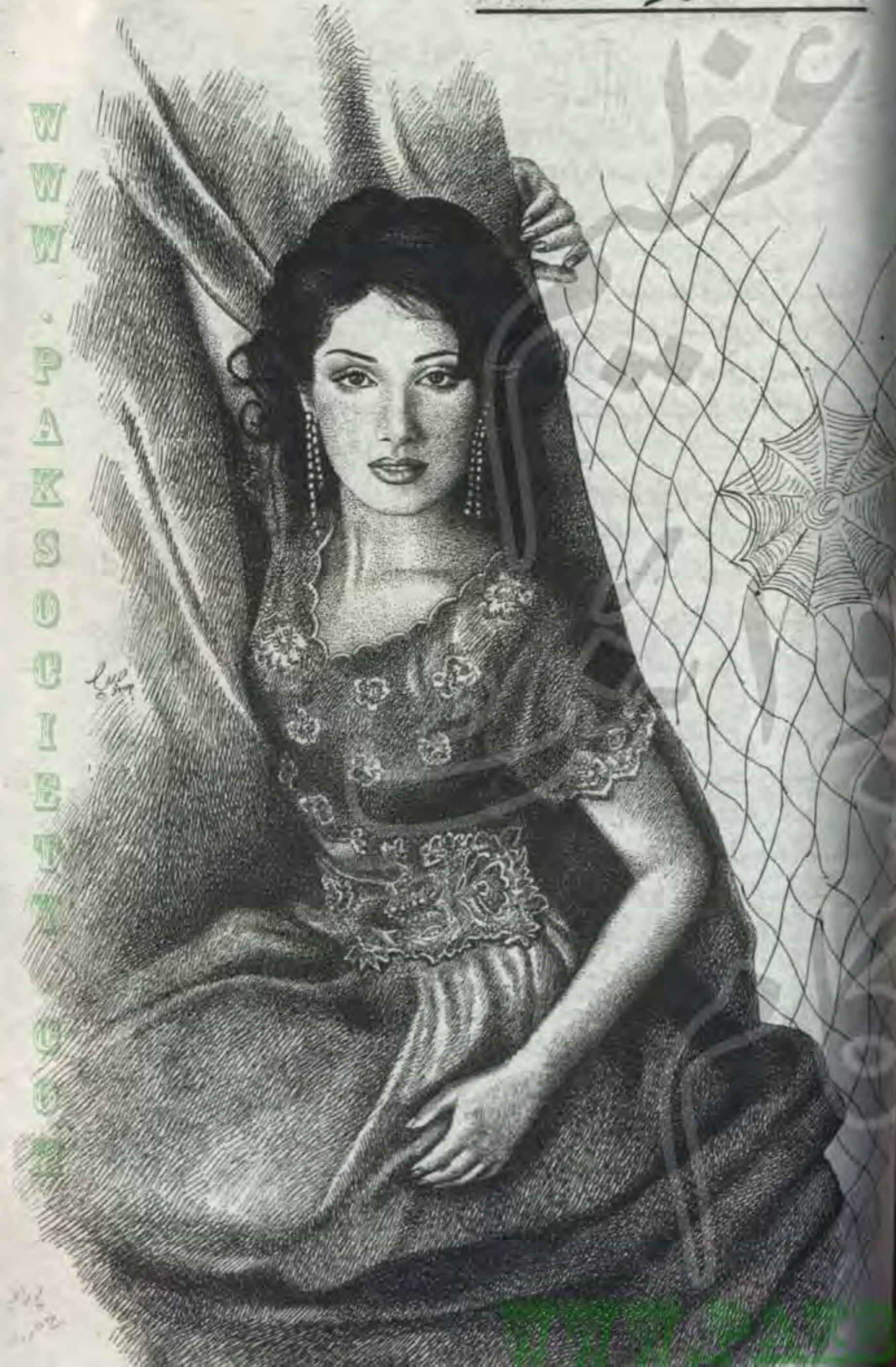
"تو کون سا پہلی بار ہوئی ہے۔" کمبل میں سے ترخ کر آواز آئی۔

"یہ والی پہلی بار ہی ہوئی ہے یعنی پکی اور سچی والی محبت۔۔۔ جیسی لیلیٰ نے مجنوں سے کی تھی' رومیو نے جولیٹ سے کی تھی۔ قسم سے۔"

"نہ تو تو نیا ہے سمیر! نہ تیرے دعوے۔۔۔ سال میں دوبار ایسی محبتیں تجھے ہوتی ہی رہتی ہیں' اس لیے اب میرے کان کھانا بند کر اور مجھے سونے دے۔" کمبل لحظہ بھر کو ہٹا' تقی کا سر باہر نکلا آواز آئی اور پھر غڑاپ سے کمبل میں غائب۔

"حد ہو گئی ہے یار! میں نئی نئی محبت کا بوجھ دل میں اٹھائے پھر رہا ہوں اور تجھے نیند کی پڑی ہے۔ کم سے کم یہی پوچھ لے وہ ہے کون۔" اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"لو بھلا اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" کمبل بولا۔

"اچھا تو بتاؤ بھلا۔" سمیر نے ماہر استاد کی طرح وائیوا لینا شروع کیا۔

"تو ابھی اس لڑکی کو بھولا نہیں۔۔۔ جس کی راہ میں پلکیں بچھانے کے بجائے تو نے کیلے کے چھلکے بچھائے تھے۔۔۔ نام البتہ بھول گیا ہے تو۔"

"واللہ اسے کہتے ہیں دوستی۔ تم مجھے مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔" سمیر اس ولائیت بھرے جواب پر جھوم اٹھا تھا۔ "مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ جس طرح تم اس لڑکی کو دیدے نکال کر گھور رہے تھے اس سے کسی احمق کو بھی اندازہ ہو سکتا تھا کہ تم اس لڑکی کی محبت میں مبتلا ہو اور اگر نہیں ہو تو عنقریب ہونے والے ہو۔"

"ایں۔" سمیر پر جوش ہوا۔ "پھر تو اسے بھی پتا چل گیا ہو گا۔"

"نہیں۔۔۔ کیونکہ جس طرح وہ تمہیں گھور رہی تھی اسے دیکھ کر لگتا تھا وہ تمہاری گردن چبا جانا چاہتی ہے۔"

"وہ تو ظاہر ہے بھئی۔ میری وجہ سے اسے اتنی گہری چوٹ لگی۔۔۔ غصہ تو آیا ہو گا لیکن میں صبح ایکسکیوز کر لوں گا۔"

"میں بہت فریش ہو کر تمہاری درگت بنتے دیکھنا چاہتا ہوں سمیر! اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں نیند پوری کر لوں۔ سو تم اب اپنے بیڈ پر دفع ہو جاؤ اور مجھے سونے دو۔" تقی نے ایک بار پھر چہرے سے کمبل ہٹا کر کہا تھا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے تقی! یہ وہی ثمرہ ہے جسے ابو نے میرے لیے پسند کیا ہے۔" سمیر پر اس کی التجا کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ اپنا آدھا بوجھ تقی پر ڈالے نیم دراز ہو گیا تھا۔ بازو سینے پر باندھ لیے تھے اور آنکھیں چھت سے لگی تھیں۔

"کیا ضروری ہے پورے پاکستان میں اس نام کی ایک ہی لڑکی ہو۔" تقی نے تحمل سے کہا۔

"نہیں' ضروری تو نہیں ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے۔" سمیر نے آس و نراس بھرے لہجے میں کہا۔

"چار چھتر لگا دل کو۔۔۔ جو آدھی رات کو ایسی الٹی سیدھی بکواس کر رہا ہے۔" تقی نے سلگ کر کہا۔ سمیر جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا اور خفگی سے بولا۔

"حد ہو گئی بھئی۔۔۔ دوست کی چار باتیں بھی تجھ سے نہیں سنی جاتیں تقی! مجھے تو لگتا ہے تیرے پاس دل ہی نہیں ہے' جو کسی کے جذبات کو سمجھ سکے۔"

"نہیں ہے دل تو نہ سہی۔۔۔ اب کیا آدھی رات کو بیٹھ کر اس بات کا غم مناؤں۔" تقی نے لاپروائی سے بولتے ہوئے کمبل جھاڑا۔

"اور اگر بالفرض یہ وہی لڑکی ہے جسے انکل نے تمہارے لیے پسند کیا ہے تو مجھے انکل کی خود غرضی پر بڑا افسوس ہو رہا ہے۔ کہاں وہ شکل سے ہی ذہین لگنے والی لڑکی۔۔۔ اور کہاں تجھ جیسا ڈفر۔۔۔ بیٹے سے محبت اپنی جگہ لیکن انکل کو کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔ میں چونکہ بہت حساس طبیعت کا مالک ہوں اس لیے اپنی اسلامی بہن پر یہ ظلم و زیادتی ہونے نہیں دے سکتا۔ میں نے سوچ لیا ہے ظالم سماج بن کر تیری شادی میں رکاوٹ ضرور ڈالنی ہے۔"

"تقی! تو میرا ہی دوست ہے ناں۔" سمیر اس کے فصیح بیان پر تخمصے میں پڑ گیا۔

"دوست تو تیرا ہی ہوں لیکن کسی انسان پر ظلم ہونے نہیں دوں گا۔۔۔ آخر آل کل کو میں نے اللہ میاں کو بھی منہ دکھانا ہے۔" ادائے بے نیازی سے فرمایا گیا۔

سمیر نے تکیہ اسے کھینچ مارا پھر ہنسا اور آ کر اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ بازو کا حلقہ بنا کر سر کے گرد رکھا اور نیم تاریک چھت کو گھورتے ہوئے اسے مخاطب کر بیٹھا۔

"تم کون ہو۔۔۔ کوئی پری یا کسی دیومالائی داستان کا دلکش' فسوں خیز کردار۔۔۔ آسمان کے سینے پر چمکتا ہوا چاند یا آسمان کا وہ سب سے روشن ستارہ۔۔۔ جس کی ابنا کی چاند کی روشنی میں بھی ماند نہیں پڑتی۔۔۔ خدا جانے تم کون ہو۔۔۔ اس کائنات سے کہیں فاصلے پر۔۔۔ جب اس جسم کی قید سے ماورا تھے ہم' ہماری روحیں ایک دوسرے سے ضرور ملی ہوں گی تب ہی تو میرا دل تمہاری طرف کھنچ رہا ہے۔ میں لاکھ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر لوں کہ یہ محبت نہیں محض "کشش" ہے پھر بھی میرا دل تمہارا ہی نام لیوا ہے۔"

نیند کی وادی میں اترنے سے پہلے اس نے جو آخری بات سوچی وہ یہی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

ساہر نے عمیر کو سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔ گو کہ یہ سوال غیر ضروری تھا۔ اتنی دیر سے عمیر سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے اور یہ بات ان کی کسی پریشانی یا ذہنی الجھن کی علامت تھی۔ چھ سال کی رفاقت میں اتنا تو وہ جان ہی چکی تھی پھر اب تو سامنے کی بات تھی کہ ان کی پریشانی کا سبب کیا ہے۔

رات کا آغاز تھا کھلی کھڑکی سے باہر رات چپکے چپکے بتی تھی۔

"آپ شفا کو فون کیوں نہیں کر لیتے۔" ساہر نے عمیر کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر ہمت کر کے کہا۔

"تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں' فون کرنے سے وہ فوراً واپس نہیں آ جائے گی۔۔۔" عمیر نے سنجیدگی سے لیکن دھیمے لہجے میں یاد دلایا۔

"واپس نہیں آئے گی لیکن آپ کی تسلی تو ہو جائے گی کہ وہ خیریت سے ہے۔" ساہر نے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے' میں پریشان نہیں ہوں۔" عمیر نے سگریٹ ایش ٹرے میں رگڑی۔ ساہر ہنس دی جیسے بچے کی بات پر ہنسا جاتا ہے۔

"پریشانی آپ کے چہرے پر لکھی ہے۔"

عمیر کھڑکی بند کر کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ساہر نے نرمی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عمیر نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس نظر میں ان کی بے بسی تھی۔

"شفا نے بہت غلط حرکت کی ہے۔"

"وہ آئے گی تو آپ اسے ڈانٹ لیجئے گا۔ اس طرح پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" عمیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں نے سوچ لیا ہے اب شفا کو کس طرح سمجھانا ہے۔ اس بچے کے کان تو تھوڑا کھینچنے ہی پڑیں گے۔"

ان کا انداز پُرسوچ تھا۔ ساہر نے چونک کر انہیں دیکھا جیسے ان کی سوچ پڑھنا چاہ رہی ہو پھر خفیف سا سر جھٹک کر بولی۔

"اچھا جو آپ کو مناسب لگے۔ وہ تو اپنی فرینڈز کے ساتھ انجوائے کر رہی ہو گی آپ ہیں کہ سوچ سوچ کے بے حال ہیں۔" اس نے پیار سے ان کا ہاتھ تھپتھپایا۔

عمیر نے سر ہلایا اور اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئے۔

"ذرا کھڑکی بند کر دینا۔" انہوں نے جاتے جاتے کہا تھا۔ ساہر نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کھڑکی تو میں ایسی بند کروں گی کہ دوبارہ کبھی کھلے گی ہی نہیں۔" اس نے گھٹنوں پر ہتھیلیوں کا بوجھ ڈال کر اٹھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی ایسی بھرپور مسکراہٹ جو اس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کے ٹیرس پر صبح سویرے کی چمکیلی تیز لیکن ٹھنڈی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان کا رنگ بے تحاشا نیلا تھا اور اس پر سفید روئی کے گالوں جیسے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔

تقی نے گرل سے جھانک کر دیکھا۔ وادی نشیب میں اور ناقابل رسائی دکھائی دیتی تھی۔ سمیر اسے کھوجتا ہوا اوپر آیا تھا۔ اس کا موڈ بے حد خوشگوار تھا اور وہ دھیمی آواز میں کوئی ہٹ نمبر گنگنا رہا تھا لیکن جس وقت اس نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا۔ تقی گرل کی دیوار پر ایک پاؤں ٹکائے دونوں ہتھیلیاں گرل پر جمائے خطرناک حد تک آگے کو جھکا ہوا تھا۔ سمیر دھک سے رہ گیا۔ اسے ایک پل میں تقی کے عزائم سمجھ میں آگئے تھے۔

"تقی!" وہ سرعت سے اس کی طرف لپکا اور دونوں بازوؤں میں اسے جکڑ کر تیزی سے پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔

"نہیں تقی!..... نہیں۔ میں تجھے حرام موت مرنے نہیں دوں گا۔" وہ بری طرح چیختے ہوئے تقی کو اس کے اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹیرس پر موجود دیگر لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ بلکہ دو تین تو سمیر کی مدد کے خیال سے آگے بھی آ گئے تھے۔

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا سمیر! میں کیوں حرام موت مروں گا؟" تقی اس افتاد پر بری طرح گھبرا گیا۔ اس نے خود کو سمیر سے چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"خودکشی کرنے والا حرام موت ہی مرتا ہے۔" سمیر بدستور اسے دبوچے ہوئے تھا۔

"اس۔" تقی چونکا پھر جھنجلایا۔ "تو پاگل ہو گیا ہے سمیر! خودکشی کریں میرے دشمن۔ میں تو نیچے وادی میں جھانک رہا تھا۔"

"ارے۔" سمیر کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے بے یقینی سے تقی کو دیکھا۔ "تو یہاں سے چھلانگ نہیں لگانے لگا تھا؟"

"مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے، جو اتنی بلندی سے چھلانگ لگا کر ہاتھ بازو تڑواؤں گا۔" تقی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" سمیر سر کھجانے لگا۔ "میں تو سمجھا تم ابا کے ناروا سلوک سے گھبرا کر خودکشی کرنے لگے ہو۔" اتنے اطمینان سے فرمایا گیا کہ تقی کے آگ ہی لگ گئی۔ اس نے گھور کر ان اکا دکا لوگوں کو دیکھا جو سمیر کی مہربانی سے تماشا دیکھنے لگے تھے۔ اس نے غصے اور شرمساری سے رخ بدلا اور گرل پر آگے کو جھک کر پھر سے نیچے جھانکنے لگا۔

وادی میں قدرتی خوب صورتی جا بجا بکھری ہوئی تھی۔ گھاس سے ڈھکی ڈھلوانیں، ہری بھری فصلوں کے قطعات، ان کھیتوں کے درمیان خود بخود ابھر آئی پیچ در پیچ پگڈنڈیاں، ان پگڈنڈیوں پر آزادانہ سرگشت کرتی بکریوں کے ریوڑ، ان ریوڑوں کے لاپروا چرواہے، ننھے منے کچے پکے مکانات، سانپ کی طرح بل در بل بچھی سڑکیں اور سڑکوں پر رواں اکا دکا ٹریفک۔

یہاں ایسا بہت کچھ تھا۔ جس پر سمیر کی بکواس باتوں سے بچنے کے لیے غور کیا جا سکتا تھا۔ سمیر نے اسے لاتعلق دیکھ کر خود بھی وادی میں جھانکنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ کوئی ایسا دلچسپ مشغلہ نہیں تھا۔

"جیسی تم نے شکل بنا رکھی ہے ناں۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے کہ تم یہاں خودکشی کے ارادے سے کھڑے ہو۔" بالآخر سمیر نے ہی اکتا کر خاموشی کو توڑا تھا۔ ایک تو یہ کہ اسے تقی کی طرف سے کسی قدر تشویش لاحق تھی۔ دوسرے، بہت دیر تک خاموش رہنا اس کے لیے خاصا مشکل کام تھا۔

"ہوا کیا ہے تقی..... کوئی پریشانی ہے؟"

تقی نے گرل چھوڑ کر رخ بدلا اور گرل سے داہنا شانہ لگا کر دور خلا میں گھورنے لگا۔ وہ عجب تذبذب کا شکار تھا۔

"یار سمیر! کل ابا سے ڈانٹ کھا کر میں بہت غصے میں آگیا تھا۔" آخر کار اس نے بلی تھیلے سے باہر نکالنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

"اب شرمندہ ہونے کا کوئی فائدہ نہیں..... واپس جا کر ایکسکیوز کر لینا۔" سمیر نے اپنے حساب سے مشورہ دیا۔

"بات یہ نہیں ہے۔" تقی نے بالوں میں داہنے ہاتھ کی انگلیاں پھنسائیں۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہ غصے میں آکر میں نے جاثم سے کہہ دیا میں اس کے ڈرامے میں کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے بتا ہی دیا کہ یہی وہ بات تھی، جو غصہ اترنے کے ساتھ ہی اسے پریشانی میں مبتلا کرنے لگی تھی۔ سمیر نے بے ساختہ سر پر ہاتھ مارا۔

"تیری عقل کہاں تھی اس وقت؟"

"بس یار! غصہ آگیا تھا۔" تقی نے منہ لٹکا کر کہا۔

ٹھیک ہے! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" چند منٹ بعد کچھ سوچتے ہوئے سمیر نے کہا۔ "واپس جا کر جاثم کو منع کر دینا یا ابھی فون کر دو۔" اس نے تجویز دی۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ کل غصے میں آکر میں کانٹریکٹ سائن کر بیٹھا ہوں۔ انکار کی صورت میں جاثم کیس کر دے گا۔" تقی مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"کانٹریکٹ کی ساری شقیں پڑھی تھیں؟ کیا اس میں کوئی ایسی شق تھی کہ تیرے انکار کی صورت میں قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔" اب سمیر کو بھی تشویش ہوئی۔

"میں نے بلینک پیپر پر دستخط کر کے دیے ہیں جاثم کو۔ اس لیے اس شق کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"تقی!" سمیر بری طرح جھنجلا گیا۔ "تیرے پاس عقل ہے کہ نہیں؟ بلینک پیپر پر سائن کر کے دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے تو جانتا ہے؟"

"یار! میری کون سی دولت جائیداد ہے۔ جسے جاثم اپنے نام لکھوا لے گا۔" تقی نے لاپروائی سے کہا۔ "ابا کو کس طرح قائل کرنا ہے۔ صرف یہ سوچ..... آگے کیا کرنا ہے۔"

"کرنا کیا ہے؟" سمیر نے کندھے اچکا کر کہا۔ "جو بھی پہلی کھائی نظر آئے "فوراً" سے پہلے اس میں کود کر خودکشی کر لینا۔ ویسے بھی چند روز بعد تو نے ابا کے ہاتھوں قتل ہو ہی جانا ہے تو چلو یوں ہی سہی۔" سمیر طنزیہ گویا ہوا۔

"جتنی تیری شکل بری ہے ناں! اس سے زیادہ بری تو باتیں کرتا ہے۔ حالانکہ کبھی کبھار تو انسان بھول کر ہی کوئی اچھی بات کر لیتا ہے۔ لیکن نہ جی۔" تقی کی جان جیسے جل کر خاک ہی ہو گئی تھی۔

"ابھی تو کاسٹنگ شروع ہوئی ہے۔ ریکارڈنگ، مارکیٹنگ، پروموشن کے بعد بھی کوئی پراجیکٹ آن ایئر ہونے میں اچھا خاصا ٹائم لگ جاتا ہے..... مجھے لگتا ہے تب تک تو میں ابا کو منا ہی لوں گا۔" تقی نے نروٹھے پن سے کہا۔

"ان شاءاللہ۔" سمیر نے باآواز بلند کہا۔ لیکن اس کا انداز دعا سے زیادہ طنزیہ لگتا تھا۔ اسی وقت ہوا زور سے چلی۔ اس ہوا میں جنگلی پھولوں کی مہک اور خنکی بھی تھی۔ سمیر نے اس ہوا کی خوشگواریت کو اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے بے ارادہ گردن موڑی۔ اسی وقت ثمر اپنی سہیلیوں کے ہمراہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اوپر آئی تھی۔ سمیر کے دل میں خوشی پھیل گئی اور آنکھوں میں روشنی سی اتر آئی۔ جبکہ اس پر نظر پڑتے ہی ثمر کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

سمیر نے رخ موڑا اور تقی کی اوٹ میں ہو کر گرل سے نیچے جھانکنے لگا۔ تقی پرسوچ تاثرات کے ساتھ چہرے پر بمشکل مسکراہٹ سجائے نیچے پگڈنڈیوں پر دوڑتے مقامی بچوں کو ہاتھ ہلا رہا تھا۔

"تقی! لک ایٹ یور لیفٹ سائیڈ۔" سمیر نے چپکے سے سرگوشی میں کہا۔

تقی نے بنا چونکے کسی معمول کی طرح بائیں طرف دیکھا۔ ٹیرس کے انتہائی کونے پر رکھی میز کرسیوں پر کچھ لڑکیاں بیٹھ رہی تھیں اور گرل پر نیلے پروں والا پرندہ بیٹھا اپنے پروں میں چونچ گھما رہا تھا۔

”واہ۔“ تقی نے بے ساختہ کہا۔ ”کتنا خوب صورت پرندہ ہے ناں۔“

”پرندہ۔“ سمیر جھنجلایا۔ ”گدھے! ادھر تمہاری ہونے والی بھابھی بیٹھی ہے جاکر سلام کرکے آؤ۔“

”ہونے والی بھابھی..... جوڈی فوسٹر مری میں کیا کر رہی ہے؟؟“

”جوڈی فوسٹر نہیں ثمر۔“ اس نے زور دے کر کہا۔

”اوہ! اچھا اچھا.....“ تقی نے مسکراہٹ دبائی۔ ”ویسے بھابھی جان جتنی محبت بھری نظروں سے تمہیں گھور رہی ہیں۔ انہیں دیکھ کر لگتا ہے عنقریب تمہاری گردن ان کے ہاتھوں میں اور جسم نیچے وادی میں پڑا ہوگا۔ اس لیے بہتر ہوگا منہ چھپا کر یہاں سے بھاگ چلو۔“ تقی کا نیک مشورہ..... سمیر نے اپنے تئیں چپکے سے اسے دیکھا۔ اتنے فاصلے کے باوجود ثمر کی آنکھوں سے نکلنے والی آگ کی چنگاریاں اس تک آ رہی تھیں۔ سمیر نے گڑبڑا کر دوبارہ تقی کی اوٹ لی تھی۔

”تقی کیا پتا یہ وہی والی ثمر ہو جس سے ابو نے میری منگنی کی ہے۔“ دل کی خواہش زبان پر مچلی تھی۔

”ہاں! ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ تقی نے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے ایسا ہوگا نہیں۔ اس لیے تم اس لڑکی کے خواب دیکھنے کے بجائے اس کے متعلق سوچو جس سے انکل نے تمہاری منگنی طے کی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

”میں نے پتا کیا ہے یہ گروپ کوئین میری کالج سے آیا ہے۔“

”پھر؟“ تقی نے پوچھا۔ ”ثمر بھابھی بھی کوئین میری میں پڑھتی ہیں کیا؟“

”پتا نہیں۔“ سمیر نے مایوسی سے کہا۔ ”امی ابو نے مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا..... اور سچی بات ہے میں نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ یہی سوچا کہ ابو نے میری بھلائی کا فیصلہ کیا ہوگا۔“

”شاباش..... تو نے بھی تو بھائی مشرقی پن کی حد کر دی۔ کم سے کم یہی پوچھ لیا ہوتا جس کی قسمت، تیرے ساتھ پھوڑی جا رہی ہے وہ رہتی کہاں ہے کرتی کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔“

سمیر نے قسمت والی بات پہ اسے بری طرح گھورا۔

”ہاں! تو مجھے کیا پتا تھا منگنی کے فوراً بعد مجھے میرے خوابوں کی ملکہ مل جائے گی۔“ سمیر جھنجلاتے ہوئے بولا۔

”پہلے تو یہ غلط فہمی دور کرلو کہ وہ تمہیں مل گئی ہے..... وہ تمہیں ابھی صرف نظر آئی ہے۔“ تقی نے اطمینان سے اس کے سارے خوب ملیامیٹ کیے۔

”اور ہاں! اب حسرت بھری آہیں بھی بھرنا بند کر دو۔ دیکھ لینا ثمر بھابھی اس والی ثمر سے کہیں زیادہ اچھی ہوں گی..... چلو اب نیچے چلتے ہیں۔ دیکھیں باقی لڑکے کیا کر رہے ہیں۔“ تقی اس کا ہاتھ دبوچ کر اس طرح سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ ساتھ لے جا رہا ہو۔ سمیر بددلی سے اس کے ساتھ گھسیٹتا چلا گیا۔ لیکن دل اور آنکھیں ہمک ہمک کر اسی کی طرف جا رہی تھیں۔

معاً اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اس نے بے ساختہ تقی کا بازو دبوچا۔

”مجھے یاد آیا تقی! ابو نے جس دوست کی بیٹی سے میری منگنی طے کی ہے۔ وہ کئی سال پہلے والٹن میں رہتے تھے۔ اگر کسی طرح اس ثمر کے ویئرآباؤٹس کا پتا چل جائے تو.....“

”یار سمیر! پورے شہر میں اس نام کی کئی لڑکیاں ہوں گی۔“ تقی جھنجلا کر بولا۔ ”تو ایک کام کر..... اگر اتنا تجسس ہو رہا ہے تو پہلے انکل آنٹی سے ثمر بھابھی کے ویئرآباؤٹس کے بارے میں پوچھ لے۔ پھر اس لڑکی سے جاکر کنفرم کرلینا۔ تیری الجھن ختم ہو جائے گی۔“

”واقعی پوچھ لوں؟“ سمیر نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”حیرت ہے ایسا عقلمندی والا خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔“

”عقل ہوتی تو عقل والا خیال آتا..... اب چلو۔“

سمیر سعادت مندی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ یہ الگ بات کہ جاتے جاتے بھی ثمر پر نظر ڈالنا نہیں بھولا تھا۔

☼ ☼ ☼
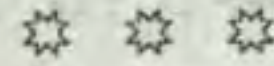
”یہ لڑکا مجھے اتنا برا لگا ہے کہ دوبارہ میرے سامنے آیا تو میں اس کا سر ہی توڑ دوں گی شاید۔“ ان دونوں لڑکوں کو سیڑھیوں پر غائب ہوتا دیکھ کر ثمر نے دانت کچکچاتے ہوئے اپنی ہمجولیوں سے کہا۔

”اب اس سے تمہاری شان میں کیا گستاخی سرزد ہو گئی ہے؟“ فرح نے اپنے موبائل پر کھٹا کھٹ ایس ایم ایس ٹائپ کرتے ہوئے کہا۔ وہ جب سے ٹیرس پر آئی تھی اسی کام میں مصروف تھی۔

”کوئی ایک گستاخی؟“ ثمر حسب سابق چڑ کر بولی۔ ”تم نے دیکھا نہیں کس طرح مجھے گھور رہا تھا؟ جتنی دیر کھڑا رہا بار بار اس کی نظریں ہماری طرف اٹھتی رہیں۔“

”ایک تو تمہیں اپنے بارے میں خوش فہمی بہت ہے ثمر!“ فرح نے ناک سکوڑی۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے اس کی نظریں بار بار ہماری طرف مجھے دیکھنے کے لیے آ رہی ہوں۔ آخر کو اس گروپ میں تمہارے علاوہ بھی کوئی خوب صورت ہے۔“ اس نے دل و جان سے اتراتے ہوئے کہا تھا۔ گو کہ یہ ایسا بیان تھا جس پر ثمر کے علاوہ باقی دونوں لڑکیاں بھی اعتراض کر سکتی تھیں۔ لیکن کوئی خاص رد عمل فوری طور پر ظاہر نہ ہو سکا۔ کیونکہ شفا تو سر جھکائے مراقبے میں گم تھی۔ ہاں! حرم نے ضرور تائیدی مسکراہٹ اچھال دی تھی۔

”بالکل بالکل..... اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکا بھینگا ہو۔ دیکھتا فرح کو ہو اور تمہیں لگا ہو کہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔“ اس بات پر وہ چاروں قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ فرح نے موبائل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”یار! ویسے تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو لڑکا اچھا خاصا ہینڈسم ہے۔ میں تھوڑی سی بھی آزاد خیال ہوتی ناں تو اب تک ضرور اس سے ہیلو ہائے کر چکی ہوتی۔“

”پھر شکر کرو کہ تم آزاد خیال نہیں ہو۔ کیونکہ ایسے بدتمیز لڑکے کے ساتھ دوستی گانٹھتے دیکھ کر مجھے اس کے بجائے تمہارا سر توڑ دینا تھا۔“ ثمر نے دانت کچکچائے۔

تب ہی اس کی نظر شفا پر پڑی۔ دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ لیے وہ خدا معلوم کس سوچ میں گم تھی۔

”تم کہاں گم ہو؟“ ثمر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے عمیر بھائی یاد آ رہے ہیں۔“ شفا نے پل بھر کو اسے دیکھا اور اداسی سے بولی۔ ثمر کو ہنسی آگئی۔

”ہمیں اپنے گھروں سے نکلے ابھی بمشکل چوبیس گھنٹے ہوئے ہیں اور تمہیں عمیر بھائی یاد بھی آنے لگے۔“ اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

شفا کو برا لگا۔ ویسے بھی وہ پہلی بار گھر والوں سے اتنا دور ہوئی تھی۔

”عمیر بھائی اپنے میٹنگ کے سلسلے میں گھر پر نہیں تھے۔ میں ان سے مل بھی نہیں سکی تھی گھر پر تھی تو ساہر بھابھی اور بچوں کی موجودگی میں اتنا فیل نہیں ہوا کہ بھائی دور ہو گئے ہیں۔ لیکن اب.....“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”کم آن شفا! اب بڑی ہو جاؤ۔ آخر کب تک تم اپنے بھائی اور بھابھی کے پروں تلے چھپی رہو گی۔“ ثمر کی یہ بات شفا کو ہر پچھلی بات سے زیادہ بری لگی تھی۔ وہ اپنی ناگواری چھپا نہیں سکی۔

”بڑے ہو جانے یا اپنے بڑوں کے پروں سے نکل جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ انسان انہیں یاد کرنا یا ان کی کمی محسوس کرنا ہی چھوڑ دے۔“

”عمیر بھائی تو چلو پھر بھی ٹھیک ہیں۔ لیکن ساہر بھابھی.....“

”پلیز ثمر!.....“ شفا نے تیزی سے اس کی بات قطع کی۔ ”ساہر بھابھی کے بارے میں کچھ مت کہو۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گی۔“ ثمر اس کے لہجے اور انداز پر خفیف سی ہو گئی۔ جبکہ حرم اور فرح الگ خاموش۔

”اچھا! ٹھیک ہے بھئی۔ تمہاری پیاری بھابھی کے بارے میں میں کچھ نہیں کہتی۔ جھگڑا تو ہم بھی نہیں

چاہتے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں بات سمیٹ دی۔

"چلو اٹھو۔ میڈم احسان سے چل کر پوچھتے ہیں۔ اس ٹوٹے پیر کے ساتھ مجھے پنڈی پوائنٹ جانے کی اجازت تو نہیں ملی۔ تم لوگوں کا پروگرام بھی میری وجہ سے خراب ہوا۔ ممکن ہے مال روڈ تک جانے کی اجازت مل جائے۔" ثمر کے لہجے میں شفا کی تلخی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ دوسرے اسے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ حرم اور فرح کے سامنے اسے ساہر بھابھی کا باب کھولنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ جبکہ شفا کی ان سے وابستگی سے نہ صرف وہ واقف تھی۔ بلکہ پچھلی رات شفا اسے منع بھی کرچکی تھی۔

شفا بھی خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساہر بھابھی کی برائیاں کرتے رہنے سے قطع نظر ثمر اس کی بہترین دوست اور بچپن کی ساتھی تھی۔ وہ چپ چاپ ان تینوں کے ساتھ چل دی۔

☆ ☆ ☆

تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد سمیر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ثمر سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اسے اماں سے بات کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہی تھیں جو کچھ بتانے پر آمادہ ہو جاتیں اور اسے کسی طعنے کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ بڑے بھائیوں یا ابو سے کچھ بھی پوچھنے کی صورت میں اسے بہت باتیں سننا پڑسکتی تھیں۔

گو کہ اس کا گھرانہ کوئی بہت روایتی قسم کا نہیں تھا۔ جو روایات کی پاسداری کے چکر میں اس طرح کے معاملات میں رازداری برتتا۔ دراصل معاملہ کچھ یوں تھا اس کی اپنے ابو اور چاروں بڑے بھائیوں کے ساتھ بے حد بے تکلفی تھی۔ لیکن ان سب کی ڈیمانڈ تھی۔ اگر وہ ثمر کے متعلق کچھ بھی جاننا چاہتا ہے یا اس کی تصویر دیکھنے میں اسے دلچسپی ہے تو انہیں بندو خان میں اچھا سا لنچ یا ڈنر کروانا ہوگا۔ سمیر ابو کے اعلا ذوق کا دل سے قائل تھا۔ سو اس نے بڑے آرام سے کہہ دیا۔

"آپ لوگ مجھے تصویر دکھائیں۔ نہ اس کے متعلق کچھ بتائیں۔ میں شادی والے روز ہی اسے دیکھ لوں گا۔ لیکن یہ بھول جائیں کہ میں آپ لوگوں کو لنچ کراؤں گا۔"

"سوچ لو برخوردار! ایسا نہ ہو کہ کل کو تمہیں پچھتانا پڑے۔" ابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں! یہ بھی یاد رکھنا کہ اگلی بار کچھ پوچھو گے تو ہم بتائیں گے بھی نہیں۔" سراج بھائی نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ میں کچھ پوچھوں گا بھی نہیں۔" اس وقت تو اس نے بڑے نخرے سے کہہ دیا تھا۔ لیکن اب سوچ رہا تھا کہ انسان کو بولتے ہوئے تھوڑا سوچنا چاہیے۔

بہرحال اب ابو یا بھائیوں سے کچھ بھی پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ کسی معمولی سے سوال کو بھی پوچھنے کے نتیجے میں اسے خوب ہی مذاق کا نشانہ بننا پڑتا اور یہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

بھابھیوں سے اس کی کوئی خاص بے تکلفی نہیں تھی۔ شائستہ آپا جو ان بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں، وہ سعودی عرب میں مقیم تھیں اور سچ بات ہے ان سے سمیر کی بے تکلفی نہ ہونے کے برابر تھی۔ باقی بچیں واحد اماں۔ سو اب ہر آس امید انہی سے وابستہ تھی۔ تب ہی وہ کال ملاتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گیا۔

اس کے عین سامنے سرمئی اور سیاہ پتھروں سے بنی روش تھی، جو داہنی سمت میں ہلکا سا خم کھاتی ریسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک چلی گئی تھی۔ روش کے دونوں طرف قد آور درخت تھے جن کی شاخیں پتوں سے لدی ہوئی تھیں، جب ہوا چلتی تو درخت جھولیاں بھر بھر کے پتے روش پر اچھال دیتے تھے۔

"ہیلو اماں!... السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام... کیسے ہو سمیر! اچھا ہوا تم نے فون کیا۔ میں تو خود تمہیں فون کرنے والی تھی۔ یہ نیلوفر کا حال سنو... مجھے کیا کہہ گئی ہے۔"

اماں بڑے بھیا کی بیگم کی کسی بات پر جلی بیٹھی تھیں۔ اس کے فوراً بعد جو انہوں نے بھابھی کی برائیاں کرنا شروع کیں تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیا۔ سمیر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ہر دو تین جملوں کے بعد وہ گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کرتا۔ ہر بار اماں سے مات کھاتا۔ یوں بھی انہیں اپنی چاروں بہوؤں سے اتنی شکایتیں تھیں کہ چند جملوں میں ان کا بیان ناممکن تھا۔

اور یہ اب کی بات نہ تھی۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ یہی دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ سو اماں کا لاڈلا بھی تھا اور چپ چاپ ان کی سن بھی لیتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی اپنی بھابھیوں سے زیادہ بے تکلفی بھی پیدا نہ ہو سکی تھی کہ وہ اسے اماں کا جاسوس قرار دیتی تھیں۔ اسے اس الزام پر کوئی خاص اعتراض نہ تھا۔ کیونکہ جب وہ چھوٹا تھا تو واقعی بھابھیوں کی جاسوسی کیا کرتا تھا۔

"اماں! آپ کے نئے سمدھیوں کے کیا حال ہیں؟" بالآخر اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا اور اماں کو بری طرح اس گستاخی پر تاؤ آیا۔

"ٹھیک ہی ہوں گے۔ انہیں کیا ہونا ہے اور تم تھوڑا شرم لحاظ سیکھ لو سمیر! میں بھی سوچ رہی تھی آج ماں سے اتنی لمبی بات کرنے کا خیال کیسے آگیا۔ اور تو اور ان عزیز رشتہ داروں کے احوال بھی پوچھ رہے ہو، جن کا عام حالات میں تمہیں نام بھی یاد نہیں رہتا۔ اب سمجھی، یہ ساری تمہید اپنے سسرالیوں کے متعلق بات کرنے کے لیے باندھی جارہی تھی۔"

"یہ بات نہیں ہے اماں! میں نے تو یوں ہی..." وہ پوچھ کر پچھتایا۔ شرمندگی ہوئی سو الگ۔

دراصل اماں کو ابو کے سارے دوستوں بشمول شکیل انکل سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ پھر سمیر کی دلہن وہ [illegible] سے لانا چاہتی تھیں۔ اپنی چاروں بڑی بہوؤں کو چنتے ہوئے جو کوتاہیاں ان سے سرزد ہوئی تھیں انہوں نے اعلان کر رکھا تھا، سمیر کے معاملے میں ان غلطیوں کا اعادہ نہیں کریں گی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چھان پھٹک کر سمیر کے لیے لڑکی پسند کرتیں، ابو نے شکیل انکل کی بیٹی سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔

اماں کو اس بات کا بڑا قلق تھا وہ سمیر سے بھی خفا تھیں کہ اس نے اپنے ابو کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کیا۔ جبکہ سمیر کو اس بات پر ہرگز کوئی اعتراض نہ تھا کہ اماں یا ابو میں سے کوئی بھی اس کے لیے لڑکی پسند کرتا۔

اماں نے اسے اپنے سسرالیوں سے متعلق سوال پوچھنے پر اتنی باتیں سنائیں کہ اس نے مطلوبہ معلومات لیے بغیر فون بند کر دیا۔

☆ ☆ ☆

مال روڈ پر دن کے دوسرے پہر میں معمول کا رش تھا۔

مسز احسان نے ان کی توقعات کے برعکس نہ صرف انہیں مال تک جانے کی اجازت دے دی تھی۔ بلکہ وہ خود بھی ان کے ساتھ آگئی تھیں۔ کیونکہ تنہا بیٹھ کر وہ اچھا خاصا اکتا گئی تھیں۔

"اگر ثمر کو زخمی پیر کے ساتھ چلنے پھرنے میں دقت نہیں ہے تو مجھے مال روڈ تک جانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

مال کا رش۔ اس پر داہنی سمت سے آسمان پر تیزی سے بادل اڈے چلے آرہے تھے۔ آن کی آن چمکدار صبح سرمئی دوپہر میں بدل گئی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے ان کے وجود سے ٹکراتے تھے۔

وہ لوگ کچھ دیر ونڈو شاپنگ کرتی رہیں۔ اس دوران مسز احسان نے ثمر سے اس کی چوٹ کے متعلق استفسار کر لیا اور ثمر تو جیسے منتظر ہی بیٹھی تھی۔ اس نے ایک پل کی بھی تاخیر کیے بغیر کل پیش آنے والے حادثے کی تمام تر تفصیلات من و عن ان کے گوش گزار کر دیں۔ مسز احسان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تمہیں ہمیں پہلے بتانا چاہیے تھا۔ میں ریسٹ ہاؤس کی انتظامیہ سے اس بدتمیز لڑکے کی شکایت کرتی۔" انہوں نے غصے سے کہا۔ وہ کالج کی طرف سے اس ٹرپ کی ہیڈ مقرر کر کے بھجوائی گئی تھیں۔ کچھ

اور ٹیچرز بھی ساتھ آئی تھیں۔ جبکہ میل اسٹاف میں چند جونیئر کلرک ان کے ساتھ تھے۔

"دوبارہ وہ لڑکا نظر آئے تو مجھے بتانا.... ایسے کان کھینچوں گی کہ طبیعت سیٹ ہو جائے گی۔ بتاؤ! ان بدتمیز لڑکوں نے تو ہر جگہ کو خالہ جی کا گھر سمجھ لیا ہے۔ جہاں جس کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کر سکتے ہیں۔" مسز احسان مستقل بول رہی تھیں۔

کچھ دیر وہ لوگ اکٹھے شاپنگ کرتی رہیں۔ پھر حرم اور فرح ایک ہینڈ میڈ گرم شالوں کی دکان میں گھس گئیں۔ مسز احسان کو گفٹ آئٹمز میں زیادہ دلچسپی محسوس ہو رہی تھی، سو وہ دوسری سمت میں چلی گئیں۔ شفا اور ثمر ایک کافی اسپاٹ سے کولڈ کافی لینے رک گئی تھیں۔

"تمہارے موبائل میں کتنا کریڈٹ ہے شفا؟" کافی کے ڈسپوزیبل کپ کو ہاتھوں میں پکڑے گرم شالوں کی دکان کی طرف جاتے ہوئے ثمر نے پوچھا تھا۔

"میرا موبائل تو کل سڑک پر گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے اس میں کریڈٹ ہو، تب بھی کوئی فائدہ نہیں۔ تم گھر فون کرنا چاہ رہی ہو؟ آؤ! اس سامنے والے پی سی او سے کر لیتے ہیں۔" ثمر کے زخمی پیر کی وجہ سے وہ خود بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہی تھی۔ ثمر نے خاموشی سے کافی کا ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔ پھر اپنے گلے میں اسکارف کی طرح ایک طرف ڈالے ہوئے پاؤچ سے سیل فون نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"میں اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے پوچھ رہی تھی۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "تمہیں عمیر بھائی اور ساہر بھابھی یاد آ رہے تھے۔ گھر فون کر کے ان کی خیریت معلوم کر لو۔"

شفا نے لحظہ بھر کے لیے گردن گھما کر اسے دیکھا اور نرمی سے اس کا سیل فون والا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔"

"تم کب تک خفا رہو گی؟" ثمر کا لہجہ نروٹھا سا تھا۔

"میں خفا نہیں ہوں ثمر!"

"میں جو کہتی ہوں تمہارے بھلے کے لیے ہی کہتی ہوں۔" ثمر نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تمہیں کیا لگتا ہے شفا! میں تمہاری دشمن ہوں؟"

"اور تمہیں ایسا لگتا ہے کیا کہ ساہر بھابھی میری دشمن ہیں؟" شفا نے ایک خوش رنگ سواتی شال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے الٹا اس سے سوال کیا۔ ثمر نے گہری سانس بھری اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ ثمر بھابھی تمہاری دشمن ہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ وہ مجھے تمہارے ساتھ مخلص نہیں لگتیں۔ اسی لیے میں کہتی ہوں تم ان کی طرف سے محتاط رہا کرو۔"

"ساہر بھابھی میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ میرے کھانے پینے کی انہیں فکر رہتی ہے۔ ہر سیزن میں وہ اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے سے پہلے میرے لیے خریدتی ہیں۔ میرے ساتھ محبت سے پیش آتی ہیں۔ جبکہ عمیر بھائی سے میری خاطر جھگڑا بھی کر لیتی ہیں۔ تم مجھے بتاؤ ثمر! ایک انسان کو اپنا خلوص ظاہر کرنے کے لیے اور کیا کرنا چاہیے؟" شفا نے ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

ثمر بڑی دیر تک خاموشی سے اچانک برسنے والی بارش میں بھیگتی سڑک کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سبھاؤ سے کہا۔

"ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ایک انسان کو اپنا خلوص ظاہر کرنے کے لیے یہی سب کرنا چاہیے۔ جو ساہر بھابھی کر رہی ہیں۔ پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ تم ان کی طرف سے محتاط رہا کرو۔ ان کی ہر بات پر لبیک کہنے سے پہلے تھوڑی سی اپنی عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔ معصومیت ممکن ہے کسی دور میں اچھی چیز سمجھی جاتی ہو۔ لیکن محبت اور بناوٹ میں فرق کرنا انسان کو ضرور آنا چاہیے...."

معاً" بادل زور سے گرجے اور آناً" فاناً" چھاجوں چھاج مینہ برسنے لگا۔ ثمر کا آخری جملہ اس شور میں

دب گیا تھا اور شفا اشتیاق سے بارش دیکھنے لگی تھی۔ کیونکہ پہاڑوں پر برستی اس بارش کو دیکھنا اسے اپنے شہر میں ہرگز نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔

ثمر نے اپنی بات سے زیادہ بارش میں اس کی دلچسپی دیکھ کر مایوسی سے نفی میں سر ہلایا اور خود بھی بارش دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ اسے یقین تھا، کسی نہ کسی دن اللہ ساہر بھابھی کے معاملے میں شفا کو ضرور عقل دے دے گا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس دن کو آنے میں ابھی بہت دن لگنے تھے۔

☼ ☼ ☼

سر ارسلان کو صبح صبح بخار نے آ لیا۔ اب کیفیت کچھ یوں تھی کہ چلنے پھرنے سے بے زار ہوئے بیٹھے تھے۔ نقاہت سے برا حال تھا۔ دو قدم چلتے تو چار قدم ڈولتے تھے۔ اس پر --- "احساس لیڈری" ایسا زور آور کہ اندر سے جانے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ حلق سے آواز بھی پوری نکل رہی تھی۔

"میں بتا رہا ہوں، اگر اس بخار کے ساتھ آگے نہیں جا سکتا تو کوئی بھی نہیں جائے گا۔" ان کا اشارہ گلیات کی طرف تھا۔ لڑکوں پر مایوسی چھا گئی۔ سارا پلان ٹھپ جو ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے سر جی! آپ آرام فرمائیں۔ ہم مال روڈ تک کا چکر ہی لگا لیتے ہیں۔" ساقی نے ساتھ ہی سمیر کے کان میں سرگوشی کی۔ "مال کا کہہ کر نکلتے ہیں۔ آگے نیو مری تک بھی ہو آئیں گے۔ ان کو کون بتائے گا بھلا۔" لیکن جس طرح بیماری کے باوجود سر جی کا عقل پورا کام کر رہا تھا۔ یعنی بولنے چالنے، احکامات جاری کرنے کی صلاحیت عروج پر تھی۔ ٹھیک اسی طرح سننے کے حس ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تیز کام کرنے لگی تھی۔

"جو میری اجازت کے بغیر نیو مری تک جائے اللہ کرے... اللہ کرے اس کے منہ پر چیچک کے داغ پڑ جائیں۔"

"اللہ کا واسطہ سر جی!" ساقی تڑپ کر بولا۔ "بندہ بد دعا دیتے ہوئے ذرا سا سوچ سمجھ تو لیں۔ کچھ مہینے بعد میری شادی ہے۔ خدانخواستہ میرے منہ پر چیچک کے داغ پڑ گئے تو بیوی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

تیر نشانے پر لگا تھا۔ سر ارسلان نے منہ کھول کر بلند و بانگ مصنوعی قہقہہ لگایا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔ چپ چاپ بیٹھ کر میری تیمارداری کرو اور ڈھیروں نیکیاں کماؤ۔"

"تیمارداری کے بجائے کوئی ایسا بندوبست نہ کروں کہ سب آپ کی تعریف کریں؟ سب کو اپنے اردگرد بیٹھا کر رکھنے کا آپ کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔" ساقی اور جل کر بولا۔

"حد ادب لڑکے! اس گستاخی پر میں تمہیں کڑی سزا دے سکتا ہوں۔"

"اس سے زیادہ کی ہمیں آپ سے امید بھی نہیں ہے۔ پورے سمسٹر میں آپ ہمیں اچھے گریڈز تو دے نہیں سکے۔ چلیں اب سزا ہی دے دیں۔ ویسے بھی اب تو ہمیں سی۔ جی۔ پی۔ اے گھٹنے کا خدشہ بھی نہیں ہے کہ آپ کی ہر بری بھلی مانیں۔" ساقی نے تمسخر اڑایا۔ سب اس کے ہم نوا بن گئے۔ بے چارے سر جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ لیکن جب جانے کا وقت آیا تو حنان اور تقی سر جی کے ہم نوا بن گئے۔

"ٹیچر کی حیثیت سے نہ سہی، دوست کی حیثیت سے ہمیں ان کے پاس ضرور رکنا چاہیے۔" لیکن تقی کو سمیر نے زبردستی گھسیٹ لیا۔

بارش کچھ دیر پہلے موسلا دھار برسی تھی۔ اب کن من جاری تھی۔ آسمان ہنوز بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہوا زبردست تھی۔

...مال روڈ پر وہی سب تھا، جو ہمیشہ سے ہوتا ہے۔ دوسری منازل پر بنے ہوئے ریسٹورنٹ جن کی کھڑکیاں

سڑک کی طرف کھل رہی تھیں تفریح کے لیے آئے ہوئے افراد' غیر ملکی سیاح' اوٹ پٹانگ حلیے والے ہپی' چھوٹے چھوٹے کافی اور فوڈ پوائنٹس اور دونوں طرف بنی ہوئی سجی سجائی دکانیں۔

ایسی ہی ایک دکان کے سامنے ثمر اور اس کی سہیلیاں نظر آگئیں۔ سمیر کے دل کی بے تاب و مشتاق کلی فوراً" کھل اٹھی۔ البتہ چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

"میں نے اماں کو فون کیا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے ثمر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ تو یوں بھی ثمر کی پوری فیملی کے بہت خلاف ہیں۔ پتا نہیں شادی کے بعد ثمر کے ساتھ ان کا گزارہ کیسے ہو گا۔"

"ابھی بیوی گھر میں آئی نہیں اور فکر مندی کا یہ حال ہے۔" تقی نے اسے بری طرح گھورا۔ "تمہیں اتنا تجسس ہے تو جا کر پوچھ کیوں نہیں لیتے کہ وہ انگیجڈ ہے یا نہیں؟"

"یہ کس طرح ممکن ہے یار!" سمیر نے افسردگی سے کہا۔

"اس میں ناممکن کیا ہے؟..... یہ پکڑو۔" تقی نے زبردستی اپنی چھتری اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ "یہ چھتری لے جا کر اسے دو۔ بارش ہو رہی ہے۔ اور میرا نہیں خیال ان لوگوں کے پاس چھتری جیسی کوئی چیز ہے۔ وہ تمہارے اس اقدام سے ضرور خوش ہو گی۔ پھر تم اس سے جو پوچھنا چاہو' پوچھ لینا۔" تقی نے منٹوں میں اس کی پریشانی کا حل اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"مار پڑ جائے گی تقی!" سمیر نے تذبذب سے چھتری کو دیکھا۔

"خواہ مخواہ میں پڑ جائے گی..... پیچھے ہم تیرے دوست نہیں کھڑے' تجھے بچانے کے لیے؟" تقی نے جذباتی انداز سے کہا۔ "کیوں دوستو! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟"

"کیا؟" وہ سب یک زبان بولے۔

"وہ جو سامنے لڑکی کھڑی ہے' سمیر کا خیال ہے یہ اس کی ہونے والی منگیتر ہے۔ میں نے کہا تم اس سے جا کر پوچھ لو۔ لیکن سمیر کا خیال ہے اسے مار پڑ جائے گی۔" تقی کی سنجیدگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"لو! ایسے ہی پڑ جائے گی۔" طلحہ نے جھٹ کہا۔ "ہم جو ہیں تیرے کبھرو جوان دوست۔"

"مجال نہیں کسی کی کہ ہمارے ہوتے تجھے ہاتھ بھی لگادے۔ ہاتھ کاٹ کر پھینک دوں گا۔" ساقی تو ہاتھ کاٹنے کے لیے پرجوش بھی ہو گیا تھا۔ وہ تو تقی نے زبردستی روکا۔ ورنہ دو چار لوگوں کے ہاتھ تو مفت میں ٹوٹ ہی چکے ہوتے۔

"اچھا۔" سمیر نے مرے مرے انداز میں کہا۔ اسے اپنے دوستوں کے خلوص پر ذرا بھی شک نہیں تھا اور دل بھی چاہ رہا تھا کہ پوچھ لینا چاہیے۔ تاکہ یہ آس و نراش کی کیفیت تو ختم ہو۔ من کی مراد بر آئی تو لڈی ڈال لیں گے مایوسی ہوئی (جلنے والے کا منہ کالا) تو چند روز حسرت سے آہیں بھر لیں گے۔

"دیکھو! تم لوگ قریب ہی رہنا۔" سمیر نے کہا۔ بالآخر اس نے ثمر سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دوستوں نے یقین دہانی کروائی کہ وہ اس کی مدد کے خیال سے چاق و چوبند اور ہوشیار رہیں گے۔

سمیر دل کڑا کر کے مخالف سمت میں بڑھنے لگا۔ تینوں کی پراشتیاق نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔

☼ ☼ ☼

فرح اور ثمر ایک بک اسٹال کے پاس کھڑی تھیں۔ بک اسٹال بھی کیا تھا۔ ایک مقامی بچہ چھوٹی سی میز اور باسکٹ میں اخبار اور رسالے رکھے بیٹھا تھا۔ ثمر کے ہاتھ میں تازہ اخبار تھا۔ فرح ڈائجسٹ کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ شفا اور حرم خدا جانے کدھر تھیں۔ جبکہ مسز احسان ابھی سامنے والی دکان میں گھسی تھیں۔ معاً" فرح کی کہنی ثمر کی پسلیوں میں لگی۔

"وہ دیکھو..... فرحت اشتیاق کے ناول کا ہیرو آ گیا۔"

"کہاں..... کدھر؟" ثمر نے پرجوش ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کل کی بات بھول بھال چکی تھی۔ سمیر پر نظر پڑتے ہی اس کے جوش پر پانی پڑ گیا۔

"یہ کسی بی کلاس مووی کا ہیرو تو ہو سکتا ہے۔ لیکن فرحت اشتیاق کے ناول کا ہیرو ہر گز نہیں..... اونہہ لوفر' لفنگا۔" اس نے اخبار جھاڑتے ہوئے با آواز بلند کہا۔ مقصود یہ تھا کہ چند قدم ادھر کھڑا سمیر بھی سن لے۔ فرح اس کی بات سن کر ہنسی۔

"جانے بھی دو ثمر! ہیرو تو ہیرو ہی ہوتا ہے۔ کیا لوفر کیا گریس فل۔" اس نے ایک دوسرا میگزین اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ تو مجھے بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ اچھی شکل و صورت' بہترین ڈریسنگ' زبردست رعنائی۔ دیکھو! ذرا ڈائجسٹ کے ہیرو کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ تم دیکھنا! ابھی یہ اپنی چھتری تمہاری خدمت میں پیش کرے گا۔ تاکہ تم اس بارش میں بنا دقت ریسٹ ہاؤس پہنچ سکو..... ایک اچھے ہیرو کی نشانی یہی تو ہوتی ہے۔ وہ بنا کہے ہیروئن کی پریشانی بھانپ لے اور اس کی پریشانی کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔" فرح کے انداز میں شرارت جھلک رہی تھی۔

ثمر نے دیکھا۔ سمیر بظاہر ایک اخبار پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔ گویا وہ فرح کی ساری بات سن چکا تھا۔ ثمر کو تو آگ ہی لگ گئی۔

"چپ کرو فرح۔! اور چلو یہاں سے۔"

"ایک منٹ۔" سمیر نے سرعت سے کہا۔ مبادا وہ چلی جائے۔

"دیکھیے! کل جو بھی ہوا میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ یقین کیجیے۔ میں آپ کو چوٹ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔" سمیر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"زیادہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ثمر نے حسب عادت ترخ کر کہا۔ "تم جیسے فضول لڑکوں کی ان چیپ حرکتوں کو میں خوب سمجھتی ہوں۔ پہلے معذرت کرو گے۔ پھر دوستی کے لیے راہ ہموار کرو گے اور پھر......"

"ارے! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں تو صرف آپ کی مدد کرنے آیا ہوں....." بوکھلاہٹ بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس نے غیر محسوس انداز میں چھتری والا ہاتھ بھی آگے کر دیا۔

فرح کو اپنے اندازے کی سو فیصد درستی پر ہنسی آئی۔ جسے اس نے موقع کی نزاکت بھانپ کر فوراً" روک لیا۔ ثمر کی آنکھیں تو آنکھیں' منہ بھی کھلا رہ گیا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ لفظوں کی گولہ باری کر کے ہی سمیر کو بھسم کرتی۔ اس کے عقب سے ایک موٹا تازہ ہاتھ کہنی تک برآمد ہوا اور اس ہاتھ نے چھتری جھپٹ لی۔

دور کھڑے سمیر کے دوستوں نے دیکھا۔ ڈرامائی انٹری دینے والی ان خاتون کے چہرے پر گامے پہلوان جیسی کرختگی تھی۔ انہوں نے چند جملوں کا تبادلہ سمیر کے ساتھ کیا۔ پھر وہ چھتری جو سمیر نے بڑے چاؤ کے ساتھ پیش کی تھی' کو پکڑ کر اسی پر پل پڑیں۔ دو تین دکان دار اپنے گھونسے لہراتے ان کا ساتھ دینے پہنچ گئے۔

بے چارے سمیر کو اپنا بچاؤ کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ جب مدد کی آس میں دوستوں کی طرف دیکھا تو وہ اس طرح غائب ہو چکے تھے کہ کیا ہی گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوتے ہوں گے۔ سمیر نے ایک دکھ بھری "آہ بھری اور مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق خود کو ان سب کے بے رحم ہاتھوں کے حوالے کر دیا۔

☼ ☼ ☼

لڑکیوں کی واپسی دلچسپ قصے کے ساتھ ہوئی۔ باقی گروپس پتریاٹہ سے واپس آچکے تھے۔ انہیں مزے لے لے کر تفصیلات بتائی گئیں۔ مسز احسان اور ثمر کی بہادری پر خوب داد ملی۔ صرف فرح اور شفا تھیں۔ جنہوں نے ثمر کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی جھوٹ بول کر اس لڑکے کو مار پڑوانے کی؟"

"جھوٹ؟" ثمر کو حیرانی ہوئی۔ "میں نے جھوٹ تو نہیں بولا۔ تمہارے سامنے ہی تو مسز احسان کو ساری بات بتائی تھی۔"

"لیکن ثمر! آج تو اس نے کوئی ایسی قابل اعتراض حرکت نہیں کی تھی۔" فرح نے کہا۔ "الٹا وہ تو معافی ہی مانگ رہا تھا۔"

"معافی نہیں مانگ رہا تھا۔ معافی مانگنے کا ڈراما کر رہا تھا۔ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اپنی حرکت پر شرمندہ ہے۔ ورنہ اس کے دل میں جو تھا وہ اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔" ثمر نے جذباتی پن سے کہا۔

"تم نے دلوں کا حال جاننا کب سے شروع کر دیا؟" شفا نے تحمل سے پوچھا۔

"وہ کہہ رہا تھا وہ اپنی حرکت پر شرمندہ ہے تو تمہیں اس کی بات کا یقین کر لینا چاہیے تھا۔ بات کو طول دینے کی کیا ضرورت تھی۔ معافی مانگ رہا تھا تو معاف کر دیتیں۔ اتنے لوگوں کے سامنے اسے بھی تماشا بنایا اور تم خود بھی تماشا بنیں۔ کل کو ہم لوگ مال روڈ پر نکلیں گے تو کوئی یہ تھوڑا ہی کہے گا کہ اس لڑکے کی پٹائی ہوئی تھی۔ سب تمہاری طرف بھی انگلیاں اٹھائیں گے کہ یہ ہے وہ لڑکی، جس کی وجہ سے اس لڑکے کو مار پڑی تھی۔" شفا کا انداز ناصحانہ تھا۔

ثمر چند منٹ خاموش رہی۔ پھر اس نے لاپروائی سے کہا۔ "کل تک لوگ بھول بھی چکے ہوں گے۔"

"لیکن کیا وہ لڑکا بھی بھول چکا ہوگا؟" شفا نے ایک دم پوچھا۔ اس کی آواز اور جملہ کسی پتھر کی طرح اس کے اعصاب پر لگا تھا۔

"ساہر بھابھی کہتی ہیں لڑکے بہت ضدی ہوتے ہیں۔ ان سے جھگڑے مول نہیں لینے چاہئیں۔ کسی بات پر ضد میں آجائیں تو بدلہ ضرور لیتے ہیں۔" شفا کا انداز اچھا خاصا ڈرانے والا تھا۔ ثمر بری طرح چڑ گئی۔

"چلو! اب آدھی رات کو تم ساہر بھابھی کی نصیحتوں کا پنڈورا بکس کھول کر بیٹھ جاؤ۔"

"ان کی کوئی نصیحت تمہارے بھلے کی بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی تم بھی دھیان دے لیا کرو۔" شفا نے سابقہ انداز میں کہا۔

"ان کی ساری نصیحتیں تمہارے بھلے کی ہی ہوتی ہیں۔ اس لیے تم ہی ان پر دھیان دیا کرو۔" اس نے سارے بال سمیٹ کر اونچی سی پونی ٹیل بناتے ہوئے کہا۔

"اور مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ تمہیں اس چغد سے اتنی ہمدردی کیوں محسوس ہو رہی ہے؟" پونی میں ربر بینڈ ڈالتے ہوئے اس نے تیکھے پن سے کہا۔

"عقل کی اندھی! مجھے اس سے نہیں تم سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ بلکہ میں تمہارے لیے فکر مند ہوں۔ اگر اس لڑکے نے ضد میں آکر تمہیں کوئی نقصان پہنچایا تو۔۔۔"

"تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

"ثمر! خدا کا خوف کرو۔" شفا اس کی بلند آواز سے خائف ہوئی۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے، میرا دل خوف خدا سے عاری ہے؟ نہیں شفا بی بی! خوف خدا بہت ہے اس دل میں۔ خدا کا خوف نہ ہوتا تو اب تک وہ میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہوتا اور اس کی لاش کسی کھائی میں پڑی ملتی۔۔۔ وہ تو شکر ادا کرے کہ میں نے اللہ کے واسطے اسے بخش دیا۔ ورنہ اس بے حس معاشرے کا سر پھرا مرد اس قابل ہرگز نہیں ہے کہ عورت کو ستا کر سکون کا سانس لے۔۔۔ میں اس معاشرے سے ایسے مردوں کا قلع قمع کر دینا چاہتی ہوں، جو عورت کو پیر کی جوتی سمجھتا ہے۔"

ثمر کا ولولہ انگیز بیان، شعلہ بیانی اور تہس نہس کر دینے کا جذبہ عروج پر تھا۔ شفا، حرم اور فرح ہکا بکا منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

تقی، طلحہ اور ساقی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ ان کے مردانہ جناتی قہقہوں سے درو دیوار لرزتے تھے۔ ہر دو چار منٹ کے بعد وہ موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے۔ پھر ان میں سے کسی ایک کی نظر سمیر کے مار کھائے ہوئے اور سوجے ہوئے چہرے پر پڑ جاتی اور قہقہے ایک مرتبہ پھر سے ابل پڑتے۔

سمیر کی حالت تو اس غبارے جیسی ہو رہی تھی جس میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہوا بھر گئی ہو اور ہوا کے تصادم سے بھی اس کے پھٹنے کا خدشہ ہو۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کسی بھی آن پھٹ جائے گا اور یہی سوچ کر تقی کو زیادہ ہنسی آرہی تھی۔ سمیر کی خونخوار نظروں کا مرکز بھی وہی تھا۔

"میں نے کل سے بہت دعائیں کی تھیں کہ یہ وہی لڑکی ہو جس سے ابو نے میرا رشتہ طے کیا ہے۔۔۔ لیکن اب مجھے اپنی ساری دعاؤں پر پچھتاوا ہو رہا ہے۔ میں دعا کر رہا ہوں، یہ لڑکی کوئی بھی ہو، بس شکیل انکل کی بیٹی نہ ہو۔۔۔ اللہ ان لڑکیوں کو ذرا سی اچھی شکل کیا دے دیتا ہے۔ ان کے تو دماغ ہی ساتویں آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔"

عشق کے غبارے سے ہوا تو چھتری کی پہلی ضرب کھاتے ہی نکل گئی تھی اور اب وہاں غم و غصہ بھرا ہوا تھا۔

"ان لڑکیوں کے دماغ ساتویں آسمان پر پہنچانے میں تو جیسے کچھ لڑکوں کا بھی تو ہاتھ ہوتا ہے۔ ذرا اچھی شکل نظر آئی نہیں کہ جی جان سے عاشق ہو گئے۔" تقی نے سنجیدہ کہا اور بول کر اپنی شامت کو دعوت دی۔

سمیر نے گردن موڑ کر اسے یوں گھورا۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچا چبا کر تھوک دینا چاہتا ہو۔

"میرا دل چاہ رہا ہے تقی! تجھے قتل کر دوں۔" وہ رو دینے کو تھا۔

"سو بسم اللہ۔۔۔ لیکن فرد جرم سے ضرور آگاہ کر دینا۔" وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی ڈھیٹ تھا۔

"تم نے مجھے اس سے بات کرنے کا مشورہ دیا تھا۔" سمیر نے زور دے کر کہا۔

"میں نے مشورہ دیا تھا۔ تمہیں گود میں اٹھا کر اس کے سامنے تو نہیں لے گیا تھا کہ اس سے بات کرو۔" تقی نے متبسم لہجے میں کہا۔

"بات کچھ یوں ہے سمیر صاحب! میں مشورہ نہ دیتا۔ تب بھی تمہیں اس سے بات کرنا ہی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک تمہاری آنکھوں پر تازہ تازہ عشق کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔۔۔ ویسے غلطی تمہاری بھی نہیں ہے۔ تاریخ گواہ رہی ہے کہ جس نے بھی ایسا افلاطونی عشق کیا ہے۔ اول اول مار ضرور کھائی ہے۔ اس لیے تمہیں بھی ایک آدھ مار سے دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ بقول غالب۔۔۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔" وہ بڑے ناصحانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ارے! لعنت ہے ایسے عشق پر۔۔۔" سمیر تڑپ اٹھا اور جوش جذبات میں کچھ زیادہ ہی اچھل پڑا۔ پھر پچھتایا کہ ملنے جلنے سے جسم میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"جو بیچ سڑک پر جوتے پڑوا دے۔ ساتھ بھی ایسا ونی تھا استانی جی کا کہ کیا ہی کسی ہیوی ویٹ ریسلر کا ہوتا ہوگا۔۔۔ مار مار کر میری ہڈیوں کا کچومر بنا دیا۔۔۔ لیکن دیکھ لینا، میں بھی جب تک بدلہ نہیں لے لوں گا، سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔" پرعزم گھونسا لہرایا گیا۔

"کیا کرو گے؟" حسان کا لہجہ اشتیاق سے بوجھل تھا۔

سمیر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے انتظار کرنے کا کہا۔ احتیاط سے اٹھا۔ تکلیف سے ڈولتا اپنے سفری بیگ سے ایک شاپنگ بیگ نکال لایا۔

"یہ لو۔" اس نے شاپنگ بیگ تقی کی طرف اچھال دیا۔ جسے اس نے مہارت سے کیچ کیا۔ تجسس

سے بے حال وہ سب اس شاپنگ بیگ پر جھک گئے۔ اندر سے ایک ہیلووین ماسک نکلا جسے سمیر نے ٹیکسلا کی ایک ڈیوٹی فری شاپ سے خریدا تھا۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟" ساقی نے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" سمیر نے خباثت سے آنکھیں مٹکائیں اور جھک کر رازداری سے انہیں اپنا پلان سمجھانے لگا جسے سن کر سب سے پہلے تقی بدکا تھا۔

"یہ پکڑو اپنی سوغات۔" اس نے ماسک سمیر کے سامنے پٹخ دیا۔

"میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گا۔" اس نے قطعیت سے کہا۔

"تمہارے تو اچھے بھی کریں گے بچو جی! الٹے سیدھے مشورے دے سکتے ہو۔ دوست کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اتنا سا کام نہیں کر سکتے؟"

"دوست کوئی تھوڑی سی مار کھا کے فوت نہیں ہو گیا کہ میں سلطان راہی کی طرح گنڈاسا لے کر میدان میں اتر جاؤں اور چن چن کر دوست کے قاتلوں کو مکوڑوں کی طرح مسل کر رکھ دوں۔"

"ہو گئی تیری بکواس؟" اس کے خاموش ہوتے ہی سمیر نے طنزیہ پوچھا۔ "جتنا مرضی اعتراض کر لے تقی! یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ سمجھ آج سے تیری میری دوستی ختم۔"

"ایسی دوستی کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے، جو مجھے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی ترغیب دے۔" تقی نے بے مروتی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر تو اس لڑکی سے میرا بدلہ نہیں لے گا تو میں تجھ سے بدلہ لوں گا اور تیرے ڈراما سائن کرنے کی بات ابا کو بتا دوں گا۔" سمیر نے آواز دبا کر کہا کہ باقی دوست تقی کے اس کارنامے سے تاحال ناواقف تھے۔ تقی مخمصے میں پڑ گیا۔ اسے سمیر سے اس ڈھٹائی کی توقع نہیں تھی۔

"یہ تو سراسر بلیک میلنگ ہے۔" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"ہے تو سہی ...." سمیر کی مسکراہٹ دل جلانے والی تھی۔ "فیصلہ بہرحال تمہیں ہی کرنا ہے۔ میری حالت ایسی نہیں رہی کہ مار کھانے کے بعد جا کر بدلہ لوں۔ میرا نمائندہ بن کر تمہیں ہی جانا پڑے گا۔ میں نے ان لڑکیوں کے ساتھ آئے ہوئے میل اسٹاف کے ایک فرد کو کہتے سنا تھا کہ کل شام یہ لوگ پیرچناسی روانہ ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس صرف آج کی رات ہے۔ جو کرنا ہے آج کی رات ہی کرنا ہوگا۔" سمیر نے پراسرار انداز میں تقریباً" حکم ہی جاری کیا تھا۔

تقی نے تھوک نگل کر خشک ہوتا حلق تر کیا اور مدد طلب نظروں سے باقی احباب کو دیکھا۔ وہ سب تماشائیوں کا سا اشتیاق چہرے پر سجائے اس کے جواب کے منتظر تھے۔ تقی برا پھنسا تھا۔

"تم لوگ ہی کچھ بولو۔ تم لوگوں کے عزیز دوست کو ایسے آتش فشاں کے دہانے پر دھکیلا جا رہا ہے، جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔" اس نے سب کو آس و امید بھری نظروں سے دیکھا۔

"کوئی سچ نہیں بولے گا۔ آخر میری دفعہ بھی تو سب خاموش رہے تھے۔" سمیر نے تو کمینگی کی حد کی ہوئی تھی۔

"اچھا! میں اکیلا تو تو تمہیں چھوڑ کر نہیں بھاگا تھا۔ یہ ساقی اور طلحہ بھی تو میرے ساتھ تھے۔" اس نے کہنا چاہا، طلحہ نے فوراً" ٹوک دیا۔

"ہمارے تو نام بھی مت لینا۔ سمیر کے درست طریقے سے بکنگ نہ کروانے پر ہمیں جو خجل خوار ہونا پڑا۔ ہم تو اس کی سزا کے طور پر وہاں سے بھاگے تھے۔ اس لیے ہم پر تو سمیر کا کوئی قرض واجب الادا نہیں ہے۔"

"درست۔" سمیر نے کہا۔ "چونکہ اس لڑکی کی خدمت میں چھتری پیش کرنے کا مشورہ تم نے ہی دیا تھا۔ اس لیے یہ کام بھی تمہیں ہی کرنا پڑے گا۔"

اس کا دل دہل رہا تھا کہ وہ برا پھنسا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس رات بارہ بجے صرف چند منٹ قبل ثمر کو یاد آیا، وہ اپنا بیش قیمت کیچو ڈائننگ ہال میں بھول آئی ہے۔

"کیا افتاد آئی ہے ثمر! ایک معمولی سا کیچو ہی تو ہے صبح دیکھ لینا۔ وہیں کہیں کرسیوں کے پاس گرا ہو گا۔"

شفا نے ثمر کو ہڑبڑاہٹ کے عالم میں بستر سے نکلتے دیکھ کر کہا۔ شام والا اختلاف بھلائے وہ دونوں باہم شیر و شکر ہو کر بستر میں گھسی باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ فرح اور حرم سو چکی تھیں۔

"یار! وہ کوئی معمولی کیچو نہیں تھا۔ اس میں اصلی "سیفائیر" لگا ہوا تھا۔ میرے بہنوئی پہلی ویڈنگ اینی ورسری پر ثانیہ کے لیے سڈنی سے لے کر آئے تھے۔ میں اس سے ادھار مانگ کر لائی ہوں۔ خدانخواستہ کیچو گم ہو گیا تو ثانیہ تو مجھے قتل کر دے گی۔" ثمر نے اپنی بہن کا نام لیتے ہوئے جلدی جلدی بتایا۔

"کیچو کس کلر کا ہے؟"

"بلیک۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ اب تم بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں ابھی کیچو لے کر واپس آ رہی ہوں۔"

شفا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ دو طرفہ بنے ہوئے کمروں کی درمیانی لابی روشن۔ لیکن گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

عمیر بھائی اچھی طرح جانتے تھے۔ شفا پہلی بار گھر سے اتنا دور گئی ہے۔ لیکن پورے دو دن گزر جانے کے باوجود انہوں نے ایک کال کر کے اس کی خیریت معلوم کرنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی تھی۔ ہاں! اسما ہر بھابھی کی کالز اسے مسلسل آتی رہی تھیں۔

عمیر بھائی کے رویے پر غور کرتے ہوئے وہ ڈائننگ ہال کی طرف چل پڑی۔ اپنے خیالات میں وہ اس حد تک مگن تھی کہ اپنے عقب میں پراسرار چرچراہٹ کے ساتھ کھلنے والے دروازے کی طرف بھی اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
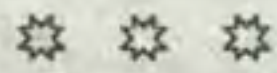
دروازہ پراسرار چرچراہٹ کے ساتھ تقریباً" ایک ہاتھ جتنا کھل گیا تھا۔ اندر بالکل اماوس کی رات کی تاریک پھیلی ہوئی تھی اور تاریکی کے پردے پر الو کے جیسی دو سفید آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔

دروازہ مزید کھلا اور اندر سے بے حد احتیاط کے ساتھ سرکتا ایک سر برآمد ہوا۔ جس کی پیشانی کے ساتھ ایک خوفناک چہرہ لگا ہوا تھا۔ کالا سیاہ رنگ، بے حد بڑی اور تقریباً" ڈھائی انچ تک باہر کو نکلی ہوئی لال انگارہ سی وحشت ناک آنکھیں، موٹے موٹے سے بدوضع ہونٹ، جو کانوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ بنظر غائر

اس پر مسکراہٹ کا گمان ہوتا تھا۔ پھر ان لمبے لمبے دانتوں پر نظر جاتی' جو بے حد سرخ اور گندے تھے اور دل بند ہونے لگتا۔

اس خوفناک چہرے کے ذرا سے نیچے تقی کا منہ لگا ہوا تھا اور اس طرح تقی کو دیکھ کر سب دوستوں نے تقی کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔ سمیر نے تو فرط جذبات سے اسے گلے ہی لگا لیا تھا۔

"پہلی بار تمہارا اصلی روپ دکھائی دیا ہے تقی!" سب کی متفقہ رائے تھی۔ بہرحال تقی نے اس خوفناک چہرے کے ساتھ گردن گھما کر محتاط انداز میں لابی کا جائزہ لیا۔ کمروں کے بند دروازوں کے آگے ہیبت ناک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے میں جنگلی بھیڑیوں کے گھسنے کا امکان تو نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی تقی کے کانوں میں بھیڑیوں کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں اور اس کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

معاً" لابی کے کنارے پر اسے ایک سبز آنچل غائب ہوتا دکھائی دیا تقی نے سٹپٹا کر منہ اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔

"کیا ہوا؟" سمیر نے ٹارچ جلاتے ہوئے پوچھا۔

بوجوہ کمرے کی لائٹس انہوں نے بند کر رکھی تھیں۔ یہ کمرہ باقی کمروں سے الگ تھلگ تھا اور اس کی لوکیشن ایسی تھی کہ مصیبت پڑنے پر بالکونی کی کھڑکی سے بنا کسی دقت کے فرار ہوا جا سکتا تھا۔ سمیر نے ریسٹ ہاؤس کے ملازم کو تھوڑے پیسے دے کر اس کمرے کی چابی رازداری سے حاصل کی تھی۔ ایڈونچر کے مارے ساتی اور حسان بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔

"کیا ہوا ہے تقی؟" سمیر نے اس کی مستقل خاموشی پر چڑ کر دوبارہ پوچھا۔ تقی دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ دل پر رکھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر حواس باختگی کی پرچھائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

"وہ ڈائننگ ہال کی طرف جا رہی ہے۔"

"ویری گڈ۔" سمیر خوش ہوا۔ "مجھے پتا تھا وہ کسی بھی وقت اپنے کمرے سے ضرور نکلے گی اور یہی وقت اسے خوفزدہ کر کے بدلہ لینے کے لیے بہترین ہوگا۔"

"لیکن تمہیں کیسے پتا تھا وہ کمرے سے نکلے گی؟" حسان نے پوچھا۔

"یار! میں نے اس کا کیچو ڈائننگ ہال کے دروازے کے پاس گرتے دیکھا تھا۔ یہ لڑکیاں سب کچھ بھول سکتی ہیں' اپنے سنگھار کا سامان کبھی نہیں بھولتیں۔ اسی لیے مجھے آئیڈیا تھا۔ وہ اپنا کیچو ڈھونڈنے کسی بھی وقت ضرور نکلے گی۔" سمیر کہہ رہا تھا اور تقی کا دل جیسے سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

"دروازہ بند نہیں کرنا تھا تقی! وہ ابھی واپس آجائے گی اور تب تمہیں ایک دم اس کے سامنے جانا ہے۔ میں دروازہ کھولتا ہوں۔ لیکن یاد رکھنا! جوں ہی وہ چیخنے لگے گی اور تمہیں احساس ہو کہ کسی کمرے کا دروازہ کھلنے لگا ہے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر واپس آجانا۔۔۔۔ ہم بالکونی سے فرار ہو جائیں گے۔" سمیر نے ایک ہاتھ میں ٹارچ پکڑے' دوسرے ہاتھ سے دروازے کی ناب گھماتے ہوئے اسے ہدایات دیں۔

"مم۔۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے سمیر!" تقی نے منمنا کر کہا۔

"شرم کر تقی۔" سمیر نے فوراً" نہ صرف اسے گھورا۔ بلکہ لتاڑا بھی۔ "جتنی خوفناک تیری شکل ہے۔ کوئی بہت حوصلہ مند انسان بھی دیکھ لے تو خوف کے مارے پہلی فلائیٹ پکڑ کر اللہ کے پاس پہنچ جائے اور ڈر بھی تو رہا ہے۔۔۔۔ حد ہو گئی بزدلی کی۔۔۔۔ اور کچھ نہیں تو اپنی اس بھوتوں والی شکل کا ہی بھرم رکھ لے۔"

"ہاں! تو میرا بھی بھوت بننے کا پہلا تجربہ ہی ہے۔ کوئی پیدائشی بھوت تو ہوں نہیں کہ ڈروں بھی نہیں۔" تقی نے چڑ کر کہا۔

سمیر اسے نظر انداز کیے باہر جھانک رہا تھا۔

"آگئی۔۔۔۔ آگئی۔" سمیر نے بعجلت اس کا ماسک سیٹ کیا۔

"اسٹینڈ بائی پوزیشن میں آجا تقی! اب سب کچھ

تیرے ہاتھ میں ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا سمیر! آخر اس لڑکی کو اس طرح ڈرا کر تجھے ملے گا کیا؟"

"سکون ملے گا میرے دل کو۔۔۔ جب اس چھٹے خان کی سوتیلی ماسی کے سارے کس بل نکل جائیں گے اور خوف کے مارے اس کی گھگھی بندھی ہوگی تو میرے سینے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی۔"

وہ حد سے زیادہ پر یقین و پر جوش تھا۔ جبکہ تقی کو کئی طرح کے خدشات نے گھیر رکھا تھا۔ سمیر تقی کو ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر یکایک غصے میں آگیا۔ ایک آن میں اس نے تقی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور سرعت سے باہر کی جانب دھکیل دیا۔

تقی اس کی تمام تر کمینگیوں سے واقف ہونے کے باوجود ایسی حرکت کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا سمیر آن اسپاٹ اسے ذہنی طور پر تیار ہونے کے لیے کچھ منٹ تو ضرور دے گا۔ لیکن سمیر نے چونکہ ایسا کچھ نہ کیا تھا۔ اس لیے وہ لابی کے عین درمیان میں لڑکھڑاتا ہوا پہنچا تھا۔

دوسری جانب شفا اپنی ہی جھونک میں تھی۔ ایک انتہائی مکروہ چہرے والے وجود کو اپنے سامنے اچانک آ اور ناچتا دیکھ کر اس کے حلق سے چیخیں ابل پڑی تھیں۔

تقی پہلے ہی بوکھلایا ہوا تھا۔ ثمر کی جگہ اس کی سہیلی کو دیکھ کر وہ بالکل ہی حواس باختہ ہو گیا اور اسی حواس باختگی میں سارا منصوبہ اس کے دماغ سے اڑنچھو ہو گیا۔ وہ قطعی فراموش کر بیٹھا کہ یہاں ڈرنے کے لیے نہیں۔ بلکہ ڈرانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ نتیجتاً" وہ لوگ' جو شفا کی چیخیں سن کر بیدار ہونے سے رہ گئے تھے' انہیں تقی کی بے سری چیخوں نے جاگنے پر مجبور کر دیا۔

سمیر' ساتی' حسان اور طلحہ نے صورت حال کی نزاکت کو بھانپا اور منظر سے غائب ہونے میں ایک بھی پل نہیں لگایا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے چین کر اور پانی کی بوتل میز پر رکھی اور انتظار کرنے لگے تاکہ مار کھائی ہوئی حالت میں جب تقی واپس آئے تو اسے ٹھنڈا کرنے کا بندوبست کیا جا سکے۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں حلق پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے چیخیں مارنے میں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کر رہے ہوں اور اپنی اس کوشش میں انہوں نے ریسٹ ہاؤس کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیے تھے۔

اسی اثنا میں بھاگتے' دوڑتے' لکڑی کا زینہ عبور کرتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور گویا تقی کی تمام حسیات جاگ اٹھیں۔ کمروں کے تالے کھل رہے تھے۔ اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے چیخیں مارتی شفا کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے گھسیٹا اور غڑاپ سے کمرے میں گھس کے مقفل کر دیا۔

شفا کی چیخیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ تقی نے بمشکل اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز بند کی۔ یہ بھی شکر تھا کہ سمیر ٹارچ یہیں چھوڑ گیا تھا۔ جو کمرے میں داخل ہوتے ہی تقی کو پاؤں کے پاس پڑی مل گئی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے ٹارچ جلائی۔ روشنی چہرے پر براہ راست پڑنے سے اس کی ہیبت ناک نقوش اور بھی واضح ہو گئے تھے۔ شفا خوف سے مرنے والی ہو رہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہوتی' تقی نے تیزی سے ٹارچ والے ہاتھ سے اپنا ماسک اتار دیا۔ شفا کی خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں حیرانی نظر آنے لگی۔ پھر وہاں نا سمجھی تیرنے لگی۔ لیکن وہ پرسکون ضرور ہو گئی تھی۔

"کون ہو تم؟" اس نے تقی کا ہاتھ زبردستی پیچھے ہٹاتے ہوئے غرا کر پوچھا۔

"دیکھو! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔۔۔ پلیز تم چیخنا نہیں۔" تقی کی زیادہ تر توجہ باہر سے آتی آوازوں کی طرف تھی۔ لیکن اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔

بھوت کو سامنے پا کر شفا جس خوف کا شکار ہوئی تھی

وہ اس کی انسانی شکل و آواز سن کر دور ہو گیا۔ وہ ایک دم غصے میں آ گئی۔

"میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔ تم ہو کون بد تمیز آدمی؟" وہ غرائی۔ لیکن آواز بلند ہونے سے پہلے ہی تقی نے دوبارہ اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔

"اب تمہارے منہ سے ایک بھی آواز نکلی تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔" تقی نے دانت پیستے ہوئے اسے دھمکایا۔ شفا نے معاملے کی نزاکت سمجھ کر مزاحمت ترک کر دی۔

ان دونوں کے کان دروازے سے باہر ڈوبتی ابھرتی آوازوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔ تقی گاہے بگاہے اس پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ جس بڑی بڑی آنکھوں میں ہراس اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی احمقانہ، فلمی اور پریشان کن صورت حال میں بھی تقی نے اعتراف کیا کہ اس کی اماوس کی رات جیسی سیاہ آنکھیں بے حد خوب صورت تھیں اور ان پر جھکتی اٹھتی پلکوں کی جھالر اتنی گھنی تھی کہ ایک دوبار تقی کے دل میں خیال ابھرا، وہ اصلی بھی ہیں یا نہیں۔

اسی اثنا میں باہر سے آنے والی آوازیں ماند پڑ گئیں۔ شفا نے اس کی گرفت نرم پڑتے ہی خود کو اس سے آزاد کروایا۔ لیکن جوں ہی دروازہ کھولنے لگی، تقی نے ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو۔۔۔ بے شک آوازیں آنا بند ہو گئی ہیں۔ لیکن وہ لوگ قریب ہی ہوں گے۔۔۔ ہم دونوں کو کمرے سے نکلتا دیکھ کر تمہاری پوزیشن بھی مشکوک ہو جائے گی۔" تقی نے مصالحانہ انداز میں کہا تھا۔ لیکن شفا بری طرح چڑ گئی۔

"اگر تمہاری اس حرکت کی وجہ سے کسی نے میری طرف انگلی اٹھائی تو میں۔۔۔ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔" اس نے پھر غرا کر کہا۔

تقی خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

شفا نے اسے یوں اطمینان سے بیٹھا دیکھ کر پیر پٹخا۔

"تم ہو کون؟" شفا نے دانت پیس کر پوچھا۔

"تقی۔۔۔ سمیر کا دوست۔"

"کون سمیر؟" وہ از سر نو چڑ گئی۔

"وہی سمیر۔۔۔ جس کو تمہاری سہیلی نے مال روڈ پر مار پڑوائی تھی۔" تقی نے عقدہ کھولا۔

"اوہ۔" شفا کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ "وہ غلطی ہو گئی۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی مار پڑوانا چاہیے تھی۔"

"دیکھو۔۔۔ میں یہاں تمہاری سہیلی کو ڈرانے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔" تقی نے کسی قدر شرمساری سے بتایا۔ "سمیر اس سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن مار کھا کر اس سے چلا نہیں جا رہا تھا تو اس نے زبردستی مجھے بھیج دیا۔۔۔ لیکن پتا نہیں تم کہاں سے آ گئیں اور سب گڑبڑ ہو گیا۔۔۔ سنو! تم اب اپنی سہیلی کو جسٹی فائی مت کرنا۔ اسے سمیر کو مار تو بہر حال نہیں پڑوانا چاہیے تھی۔"

"تو پھر کیا اس کی تصویر کھنچوا کر فریم کروا لینا چاہیے تھی؟" شفا کو پتنگے لگ گئے۔

"شکر کرو! تمہارے دوست کو صرف مار پڑی ہے۔ میں ثمر کی جگہ ہوتی تو ایسا فضول سوال پوچھنے پر اسے الٹا لٹکا دیتی۔" غصے کی حالت میں وہ یکسر مختلف شفا بن گئی تھی۔

"اس میں فضول کیا تھا؟" تقی نے سادگی سے پوچھا۔ "وہ صرف یہی جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ کہیں کمیٹڈ یا انگیجڈ تو نہیں ہے۔ لیکن تمہاری سہیلی نے اس کا پورا سوال بھی نہیں سنا۔"

"اچھا ہوا پورا سوال نہیں سنا۔۔۔ وہ سن لیتی تو سچ مچ تمہارے دوست کو الٹا لٹکا دیتی۔۔۔ کسی نے اسے اتنی تمیز نہیں سکھائی کہ لڑکیوں سے اتنی ذاتی نوعیت کے سوال نہیں پوچھا کرتے؟"

تقی نے کندھے اچکا کر اسے دیکھا۔

"میں سمجھ نہیں پا رہا۔ آخر اس میں اتنا برا ماننے کی کیا بات ہے؟ پتا نہیں تم لڑکیاں ذرا ذرا سی بات کو اتنا کا مسئلہ کیوں بنا لیتی ہو؟"

"اس لیے۔۔۔ کیونکہ ہمیں ذرا ذرا سی بات کو اتنا کا مسئلہ بنانا اچھا لگتا ہے۔" شفا نے جیسے الفاظ چباتے

ہوئے سرد مہری سے کہا تھا۔ "اب تم اٹھ کر دروازہ کھولو گے یا میں چیخ چیخ کر سب کو اکٹھا کروں؟"
"میں دروازہ کھول دیتا ہوں۔ لیکن تمہیں میری معذرت قبول کرنا ہوگی۔ یہ جو بھی ہوا' وہ محض ایک حادثہ تھا اور۔۔۔ اور سمیر کی بے وقوفی۔۔۔ تمہیں اتنی دیر کمرے میں روکنے کے لیے بھی میں شرمندہ ہوں۔ لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو ہم دونوں بری طرح پھنس جاتے۔" اس نے میجک آئی سے لابی کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔
"میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ گئی ہوگی۔۔۔ ہم دونوں کی پوزیشن اچھی خاصی آکورڈ ہو سکتی تھی۔" اس نے پوری تسلی کے بعد دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔
"اور تمہارا کیا خیال ہے اب میری پوزیشن کلیئر ہو گی؟۔۔۔ محترم! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے میں پچھلے تیس منٹ سے اپنے کمرے سے غائب ہوں۔ میری فرینڈز نے اب تک میری غیر موجودگی کی خبر ہماری ٹیچرز تک پہنچا دی ہوگی اور وہ لوگ یقیناً مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔" شفا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں گی کہ میں اب تک کہاں تھی۔"
تقی کی شرمساری میں اضافہ ہوا تھا۔
"میں شرمندہ ہوں۔۔۔"
"تمہاری شرمندگی کا مجھے کیا فائدہ ہے؟" شفا نے بیڈ پر پڑا ماسک جھپٹ کر اٹھایا اور تقی کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتی دروازے کی طرف لپکی۔
"اپنے کمرے میں جا کر سامان پیک کرنا شروع کر دو۔ صبح ہوتے ہی میں تمہارا وہ حشر کرواؤں گی کہ تم اور تمہارے دوست یاد رکھو گے۔" دروازے کا ہینڈل گھماتے ہوئے اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔
"اچھا! لیکن کم سے کم یہ تو بتاتی جاؤ کہ تمہاری دوست کمیٹڈ یا میرڈ تو نہیں ہے؟" تقی نے جلدی سے پوچھ ہی لیا۔
"نہ انگیجڈ نہ کمیٹڈ۔" شفا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "وہ میرڈ ہے الحمد اللہ۔" اس نے دانت کچکچا کر کہا اور دروازہ تقریباً اس کے منہ پر مار کر چلی گئی۔
"بک ہا۔۔۔ اتنا کھڑاگ بھی پھیلایا۔ شرمندگی ہوئی سو الگ۔۔۔ اور لڑکی بھی شادی شدہ نکل آئی۔۔۔ تف ہے بھئی۔۔۔ تیری قسمت ہی خراب ہے سمیر!" تقی مایوسی سے کہتا بیڈ پر گر گیا۔

☼ ☼ ☼

کچھ عجیب نا قابل فہم سی خاموشی ان سب کے درمیان پھیلی ہوئی تھی۔
جس کے جہاں سینگ سمائے' وہ وہیں سوچ بچار میں مصروف ہو گیا۔ سب سے برا حال سر ارسلان کا تھا' جو بخار سے تپتا چہرہ لیے کمرے میں دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں چکر کاٹ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غصہ اور چہرے پر فکر مندی تھی۔
"سمیر! کم سے کم مجھے تم سے ایسی احمقانہ حرکت کی توقع نہیں تھی۔" ایک دم انہوں نے رک کر ناراضی سے اسے دیکھا۔
"ان سب میں سے کوئی ایسا بے وقوفانہ پلان بناتا کہ ماسک چڑھا کر لڑکی کو ڈرایا جائے تو میں مان لیتا۔ لیکن تم۔۔۔ تم تو۔۔۔"
"تم تو سر کی کلاس کے سب سے لائق اسٹوڈنٹ تھے۔ تم نے ایسا ویک پلان کیسے بنا لیا۔" ایک دم ساقی نے جل کر کہا تھا۔ اس کی بات پر جہاں سب کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ پھیل گئی' وہیں سر نے خفیف سا ہو کر اسے گھورا۔
"تم چپ رہو نالائق۔" پھر کچھ خیال آنے پر بولے۔ "حیرانی مجھے اس بات پر ہے کہ تم لوگ تقی کو اتنی کریٹیکل سچویشن میں اکیلا چھوڑ کیسے آئے؟"
"ہم کب چھوڑ کر آئے تھے۔" سمیر نے تیزی سے کہا۔ "جیسے ہم بھاگے تھے' ہمارا خیال تھا' ہمارے پیچھے وہ بھی آ جائے گا۔ لیکن وہ پتا نہیں کس کے انتظار میں کھڑا رہا۔۔۔ اور میں جب سے آیا ہوں' دیکھ رہا ہوں آپ مسلسل تقی کی فکر میں ہلکان دکھائی دیتے ہیں سر

جی! جبکہ میری ہڈیوں کا سرمہ بننے میں بس کسر ہی رہ گئی تھی اور آپ نے مجھ سے اظہار افسوس تک نہیں کیا۔" سمیر نے منہ بسور کر کہا۔
"وہ اس لیے گدھے! کیونکہ جب تم مار پیٹ کا ہار گلے میں لٹکا کر آئے تو میں سو رہا تھا۔ مجھے تو اصل قصے کا بھی ابھی پتا چلا ہے۔ اگر مجھے خواب میں ہی خبر مل جاتی کہ تم تقی سے کیا کروانے لگے ہو تو فوراً تمہیں روک دیتا۔۔۔ اب تمہاری اس حرکت کی وجہ سے ہم سب نظروں میں آ جائیں گے اور اگر خدانخواستہ! تقی پکڑا گیا تو وہ اتنا اچھا تو ہرگز نہیں ہے کہ تن تنہا مار کھاتا رہے۔۔۔ ہمارے نام تو ضرور لے گا وہ اور اس کے بعد ہڈیاں سینکوانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" بات قابل غور تھی۔ سب کے دل کو لگی۔
"اب کرنا کیا ہے؟" طلحہ نے فکر مندی سے پوچھا۔
"میں تو کہتا ہوں' سامان سمیٹ کر یہاں سے بھاگ چلو۔" حسان نے تیزی سے کہا۔ "تقی کی نشان دہی کے بعد متوقع مار سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔"
"مجھے تم سے اسی آئیڈیے کی توقع تھی۔" ارسلان نے جل کر کہا۔
"ظاہر ہے سر جی! حسان کی آدھی عمر اسی طرح بھاگتے دوڑتے گزری ہے۔ وہ بھی گرلز کالج کے عین سامنے۔" ساقی نے شرارت سے کہا۔ حسان نے کوئی کرارا سا جواب دینے کے لیے پنجے تیز کیے ہی تھے کہ ارسلان نے سب کو باجماعت جھاڑ کے رکھ دیا۔
"خبردار! اب کوئی نہیں بولے گا۔۔۔ مجھے سوچنے دو۔"
تب ہی دھاڑ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور تقی گرتا پڑتا اندر داخل ہوا۔
"ہٹ جاؤ۔۔۔ ہٹ جاؤ۔" وہ دھپ سے بیڈ پر گر گیا۔ سب اس کے ارد گرد ہو گئے۔ بظاہر تو ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ مار پیٹ کے کوئی خاص نشانات بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے اور جب یہی بات سمیر نے

پوچھی تو وہ اسی پر الٹ پڑا اور سارا قصہ کہہ سنایا۔
"بندہ انتقام میں اتنا بھی اندھا نہ ہو کہ اپنے دشمن کو بھی نہ پہچان سکے۔ وہ لڑکی میرے بارے میں پتا نہیں کیا سوچ رہی ہوگی۔" تقی کے سر پر فکر سوار تھی۔
"لو جی۔" ارسلان نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔
"اسے یہ فکر مارے دے رہی ہے کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔ حالانکہ اس کی کوئی گنجائش چھوڑی ہے تم لوگوں نے؟"
"ساری غلطی سمیر کی ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اسے اٹھا کر کھائی میں پھینک دو۔ اگر تب ہی سب نے میری بات مان لی ہوتی تو ابھی یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔" حسان منمنایا۔ کیونکہ مورد الزام اسے بھی ٹھہرایا جا رہا تھا۔
"اب میرا کیا ہوگا؟" تقی کو اپنی فکر سب سے زیادہ تھی۔ "جتنے خطرناک تیوروں کے ساتھ وہ دھمکی دے کر گئی ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ ضرور میرا کچومر نکلوائے گی۔"
"فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔ جو کہ تم لوگوں کے ہر بکواس پلان سے زیادہ بے ضرر اور کار آمد ثابت ہوگا۔۔۔ کام نہ بھی کیا تو مار ہرگز نہیں پڑوائے گا۔" ارسلان نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اپنا پلان ان سب کے گوش گزار کر دیا۔
ان سب نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا اور سب سرجی کی فہم و فراست پر عش عش کر اٹھے۔
"واہ سرجی! واہ۔۔۔ مان گئے آپ کو۔ آپ پڑھائی کے میدان میں ہی نہیں، چالاکیوں میں بھی ہمارے استاد ہیں۔" ان سب کی باہمی رائے بس یہی تھی۔

☼ ☼ ☼

دوسری جانب شفا کی سہیلیاں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔
گو کہ اسے کمرے سے نکلے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ لیکن باہر اچانک ابھرنے والی چیخ و پکار اور شفا کی عدم دستیابی نے انہیں بھی خدشات میں ڈال دیا۔ وہ تذبذب کا شکار تھیں کہ اب کیا کیا جائے۔ لیکن شکر کہ اسی وقت شفا آگئی اور اس نے سارا قصہ کہہ سنایا۔
"اتنی دیر تک تم اس ہینڈسم کے ساتھ کمرے میں اکیلی تھیں؟" حرم نے دبے دبے جوش کے ساتھ اچانک پوچھا۔ "تم دونوں نے کیا باتیں کیں؟"
"جس طرح کی صورت حال تھی۔ تمہارے خیال میں گالیاں دینے کے سوا کوئی بات ہو سکتی تھی؟" شفا نے چڑ کر کہا۔
"کیوں نہیں ہو سکتی تھی؟ بلکہ یہ کوئی فلم یا ڈراما ہوتا تو اتنی دیر میں لڑکا لڑکی کو آپس میں محبت بھی ہو سکتی تھی۔ تم صرف باتوں کا پوچھ رہی ہو۔" حرم نے پُریقین لہجے میں کہا۔ وہ تھوڑا فلمی مزاج رکھتی تھی۔ ہر چیز میں فلمی رومانس ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔
"تھوڑی سی فلمی سچویشن کری ایٹ ہو جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب کچھ فلمی ہو۔" فرح نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔
"اور ان فضول لڑکوں میں سے کسی سے محبت کرنے کا تو تم لوگ سوچنا بھی نہیں۔ صبح ہوتے ہی ان سب کو مسز احسان سے مار نہ پڑوائی تو میرا نام بھی ثمر نہیں۔" ثمر نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"اچھا بھئی۔۔۔ اب تو جو بھی کرنا ہے، صبح ہی کرنا ہے ناں۔۔۔ تو چلو! ابھی سو جاتے ہیں۔۔۔ پہلے ہی کچی نیند سے اٹھنے کی وجہ سے میرا سر پھٹ رہا ہے۔" فرح نے واپس کمبل میں گھستے ہوئے کہا۔
ٹھیک پینتالیس منٹ بعد ان کے کمرے کا دروازہ احتیاط سے بجا۔
رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے؟ انہوں نے اور بھی احتیاط سے دروازہ کھولا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ لابی دور تک خالی پڑی تھی۔ البتہ دروازے کے بالکل سامنے فرش پر رومال کی چھوٹی پوٹلی پڑی تھی۔
کھول کر دیکھا۔ اندر ثمر کا کیچر اور کاغذ کا پرزہ تھا۔ جس پر بڑے حروف میں "سوری" لکھا ہوا تھا۔
"چلو! اب یہ نیا ڈراما شروع ہو گیا۔ میں کہتی ہوں

ابھی چلو۔ مسز احسان سے کہہ کر اتھارٹیز سے بات کرتے ہیں اور انہیں باہر نکلواتے ہیں۔ حد ہو گئی یار! تمیز تہذیب کسی چڑیا کا نام ہے یا نہیں۔" ثمر فوراً ہی تپ گئی۔
"خدارا ثمر! اتنا غصہ مت کیا کرو۔ مجھے لگتا ہے کسی روز پریشر ککر کی طرح پھٹ جاؤ گی تم۔" شفا نے کیچر اس کے ہاتھ میں دیا اور کاغذ مروڑ کر کے ڈسٹ بن میں اچھال دیا۔
"سو جاؤ اب۔" وہ بستر میں گھس گئی۔ لیکن ثمر کی آنکھوں میں اب نیند کہاں؟ وہ ساری رات پلاننگ کرتی رہی کہ ان لڑکوں کو اب سزا کس طرح دلوانی ہے۔

☼ ☼ ☼

ثمر کی ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ لیکن شفا نے اس کی ساری پلاننگ پر پانی پھیر دیا۔
"معافی مانگ تو چکا ہے وہ۔ اب کس لیے اس لڑکے کی شکایت لگائیں؟ ویسے بھی ہمارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں جس سے ثابت کیا جا سکے کہ اس نے رات کو مجھے ڈرایا تھا۔" شفا نے تحمل سے کہا۔ لیکن ثمر اسے ٹال مٹول کرتا دیکھ کر چڑ گئی۔
"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو کہ کس طرح ثابت کرنا ہے۔ بس تم میرے ساتھ چلو۔"
"ثمر! کیا ضرورت ہے یار۔۔۔ وہ دو بار معافی مانگ چکا ہے۔ ایک بار وہاں کمرے میں۔۔۔ ایک بار لکھ کر۔"
"اور تمہیں کیسے پتا اس نے سچے دل سے معافی مانگی تھی؟" ثمر چڑ کر جرح کرنے لگی۔
"مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ اس نے بے دل سے معافی نہیں مانگی۔" شفا نے سابقہ انداز میں کہا۔ وہ لوگ لابی سے گزر کر ہال کی طرف جا رہی تھیں۔
"میں نے زندگی میں ایک سبق سیکھا ہے ثمر! جب کوئی معافی مانگ رہا ہو تو بنا اس بات پر دھیان دیے کہ اس کے دل میں سچ مچ کی شرمندگی ہے یا نہیں اسے معاف کر دینا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت اللہ گیند ہمارے کورٹ میں ڈال دیتا ہے کہ ہماری مرضی ہم اس گیند کو کس طرح کھیلیں۔۔۔ تو کیا ہمارے لیے بہتر نہیں کہ ہم گیند کو اللہ کی مرضی کے مطابق کھیلتے ہوئے اس بندے کو معاف کر دیں، جو اپنی غلطی پر شرمندگی ظاہر کر رہا ہے؟ کیونکہ معاف کر دینا اللہ کے نزدیک بڑا احسن عمل ہے اور دلوں کا حال بھی صرف اللہ ہی جانتا ہے۔۔۔ ویسے بھی جو انسان دوسروں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو معاف کرنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو اسے یہ امید بھی ترک کر دینا چاہیے کہ اللہ اس کی بڑی غلطیوں کو معاف کرے گا۔۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ اللہ ہماری بڑی بڑی کوتاہیوں کو معاف کر دے اور خود دوسرے انسانوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں بھی نظر انداز نہیں کر پاتے۔۔۔ یہ تو بڑا دوغلا طرز عمل ہے بھئی۔"
"توبہ ہے شفا! تم سے تو انسان بات ہی نہ کرے۔ پورا لیکچر ہی سننا پڑ جاتا ہے۔" ثمر قائل ہوئی یا نہیں۔ لیکن اکتا ضرور گئی۔
شفا ہنس دی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ ثمر نے بددلی سے ہی سہی۔ لیکن اپنا ارادہ ترک کر دیا ہے۔
اور اپنے کمرے کی دانستہ اوٹ لے کر کھڑے تقی نے صرف اس کی ہنسی ہی نہیں سنی تھی، پوری بات بھی سنی تھی اور وہ اچھا خاصا متاثر بھی ہوا تھا۔
"شکل سے تو محترمہ بونگی لگتی ہیں۔ لیکن بات عقل والی کر گئی ہیں۔"
شکر گزاری کے احساس سے سرشار گہری سانس لیتے ہوئے اس نے دعا کے انداز میں چہرے پر ہاتھ پھیرے اور باقی سب کو مصیبت ٹل جانے کی نوید سنانے چل دیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بد مزاجی اور بد زبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جبکہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد اجلال رازی سے ہوچکی ہے، جو اعلا تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوجاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

وہ اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خود سر ہوتی جارہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے، مگر وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے۔ کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔
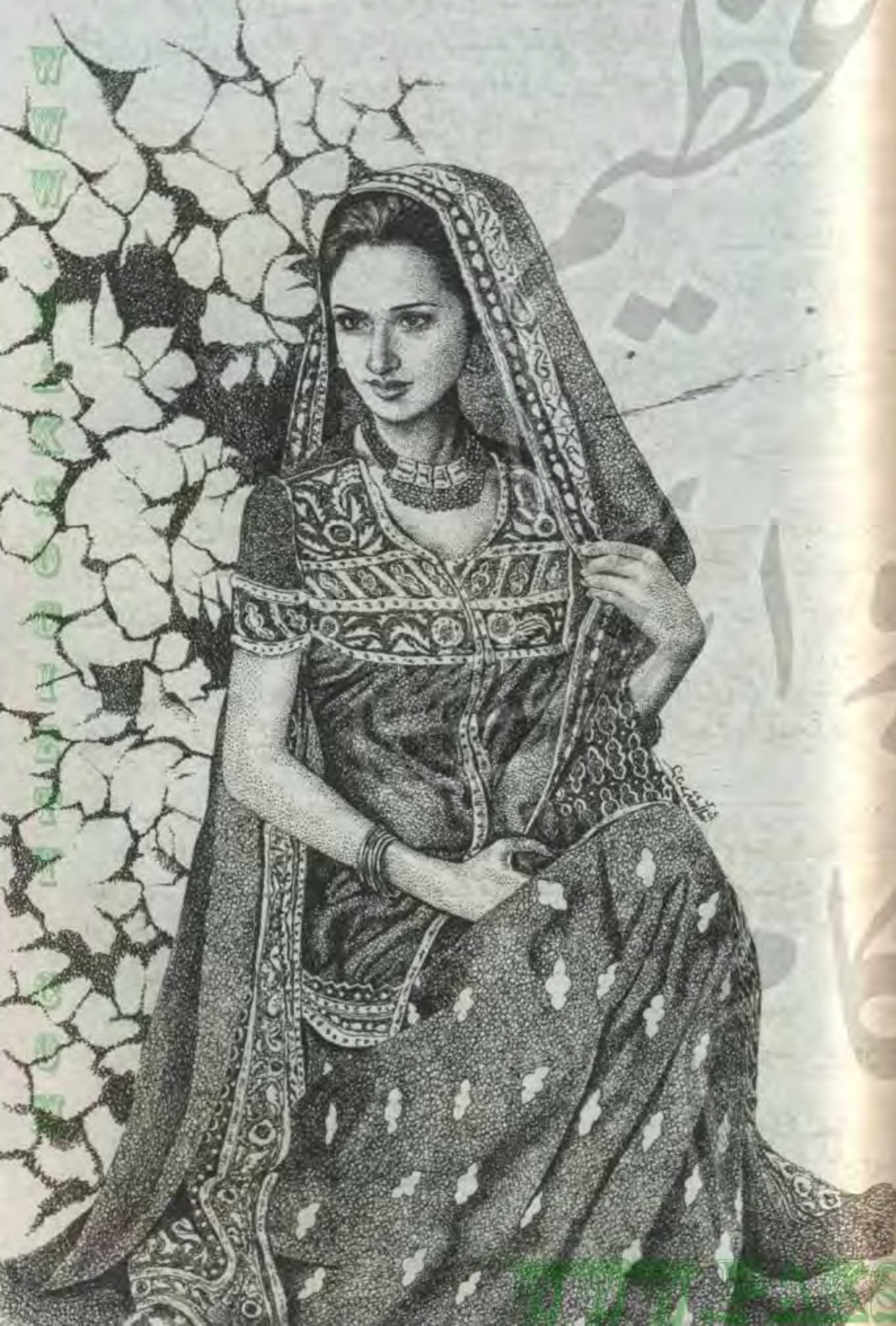
تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کرلیتا ہے اور تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے اسپتال داخل کروادیتا ہے۔

اریبہ 'یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے 'مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کردیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔

اجلال رازی 'اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرادیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نازیبا گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچالیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی 'توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ اریبہ 'ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔

رازی 'اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔ تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہوجاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جاکر تاجور کا معلوم کرتا ہے مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ مگر ابا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہوجاتی ہے۔

یاسمین 'اریبہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں پڑجاتی ہے۔ مگر اریبہ دوٹوک انداز میں منع کردیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال 'اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہوجاتا ہے۔ اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں سمیر سے بات کرتی ہے۔ مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اریبہ نظر آجاتی ہے۔ وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کرلیتا ہے۔

اریبہ کے اغوا ہوجانے پر سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ اجلال 'ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اریبہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر اریبہ سے تمیز سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اریبہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

شمشیر علی کو اریبہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ اریبہ کو اپنا سیل فون دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے رابطہ کرلے۔ اریبہ اجلال کو فون کرتی ہے 'مگر وہ سرد مہری سے بات کرتا ہے تو اریبہ کچھ بتائے بغیر فون بند کردیتی ہے۔ شمشیر علی نے

ابراہیم نامی بچے سے اسکیچنگ سیکھ کر تاجور کی تصویر بنائی تو اریبہ اسے دیکھ کر فوراً" پہچان گئی۔ اس نے شمشیر کو بتایا کہ اریبہ اس کے گھر میں حفاظت سے ہے۔ شمشیر اب اریبہ کو واپس پہنچانا چاہتا تھا 'لیکن اریبہ نہیں چاہتی ہے کوئی شمشیر علی کو مجرم سمجھے۔ وہ ایک منصوبہ بناتی ہے۔ جس کے تحت شمشیر علی اسے اسپتال میں داخل کرا کے توصیف احمد کو اطلاع کردیتا ہے۔ توصیف احمد اس کے ساتھ اسپتال جاتے ہیں اور اریبہ کو گھر لے آتے ہیں۔

اریبہ کو دیکھ کر اجلال کو محسوس ہوا کہ وہ اس کی محبت سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا مگر پھر ساجدہ بیگم سے سارہ سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کردیتا ہے۔ وہ ناراض ہوجاتی ہیں۔ ثنا 'سمیر کو فون پہ بتادیتی ہے۔ وہ سارہ سے پوچھتا ہے 'پھر جواب نہ پاکر اریبہ کو بتادیتا ہے۔ اریبہ 'سارہ سے ناراض ہوجاتی ہے۔ اریبہ اپنے والد کے دفتر میں اجلال سے اشاروں 'کنایوں میں اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ اجلال کے چہرے کے تاثرات سے اسے جواب مل جاتا ہے۔ سارہ حالات سے خوف زدہ ہو کر خودکشی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

ایک عرصے بعد یاسمین کو اپنے والدین یاد آتے ہیں تو وہ توصیف احمد سے اجازت لے کر ان سے ملنے چلی جاتی ہے۔ دوسرے شہر میں ہونے کی وجہ سے وہ ثنا کی شادی میں شرکت نہیں کرپاتی۔ توصیف احمد پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ تاجور اور شمشیر بہن بھائی ہیں۔ یاسمین اپنی والدہ کے ساتھ اپنی مرحومہ کزن کے بچوں سے ملنے جاتی ہے۔ وہاں اسے باتوں میں پتا چلتا ہے کہ ان کے گھر مقیم تاجور ان کی مرحومہ کزن کی بیٹی ہے۔ سارہ اور رازی کی فون پر گفتگو سن لینے کے بعد اریبہ مزید دلبرداشتہ ہوجاتی ہے اور شمشیر کے پروپوزل کی ہامی بھرلیتی ہے۔

۲۱
اکیسویں قسط

"ہا۔ ہاہ !" شمشیر علی نے پورا سر پیچھے گرا کر خود کو نئی زندگی ملنے کی مبارک باد دی تھی پھر اسے دیکھ کر بولا۔

"تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔"

"میں کچھ بھی کرسکتی ہوں۔ جان لے بھی سکتی ہوں اور دے بھی سکتی ہوں۔ یہ بات تم ہمیشہ یاد رکھنا۔" وہ بہت سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

"ارے! تم تو ابھی سے دھونس جمانے لگیں۔" وہ اب اپنی جون میں آنے لگا تھا کیونکہ اس کا دل شاد ہو کر اٹھکھیلیاں کرنے کو چاہنے لگا تھا۔

"یہ محض دھونس نہیں ہے شام !" وہ ہنوز سپاٹ تھی۔

"جانتا ہوں بابا 'جانتا ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں انگیجڈ تھی۔" اریبہ جانے کیا کہنے جارہی تھی کہ وہ ایک دم خاموش ہوگیا۔

"میری منگنی چار سال رہی۔" وہ کہنے لگی۔ "اور وہ چار سال میری زندگی کے خوب صورت سال تھے 'میں کسی ایسے جزیرے پر سفر کررہی تھی جہاں سورج بھی آنکھ بند کرکے طلوع ہوتا تھا اور اس دوران میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرا یہ سفر عارضی بھی ہوسکتا ہے یا اس کا کہیں اختتام بھی ہوگا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ روح کو بھی ایک دن جسم سے نکلنا ہے 'تکلیف تو ہوتی ہے 'لیکن پھر جسم آرام پا جاتا ہے تو شمشیر علی! تم سمجھ لو کہ جس شخص کی محبت میری نس نس میں سمائی تھی 'اس کے نکلنے یا نکالنے میں مجھے کتنی اذیت اٹھانی پڑی ہوگی 'سمجھ سکتے ہو نا تم۔۔؟" وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

شمشیر علی بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے سوال پر پلکیں گرا کر اثبات کا اظہار کیا تو قدرے رک کر وہ پھر کہنے لگی۔

"میں یہ سب تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ اگر کبھی میرے ماضی کو سوچتے ہوئے تمہارے دل میں کوئی شبہ پیدا ہو تو اس پر گرفت مت کرنا۔ کیونکہ میں اپنی زندگی سے وہ چار سال نکالنے پر قادر نہیں ہوں، لیکن یہ میں یقین سے کہوں گی کہ ان چار سالوں کی خوب صورتی مسخ ہو کر اتنا بھیانک روپ دھار چکی ہے کہ پلٹ کر دیکھنا تو دور کی بات، میں شاید تصور میں بھی نہیں لا سکتی۔" وہ خاموش ہو کر پھر گلاس وال سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

شمشیر علی نے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی محسوس کی پھر ہونٹوں سے ہاتھ نیچے گرا کر بولا۔

"تم نے وہ سنا نہیں، وہ جوانی جوانی نہیں جس کی کوئی کہانی نہ ہو۔"

اریبہ نے بے اختیار چہرہ اس کی طرف موڑا تھا۔

"ہاں! یہ سچ ہے۔ وہ کہنے لگا۔ "کوئی راستہ سیدھا منزل کو نہیں جاتا۔ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول پڑھا ہے کہ اگر تمہارے راستے میں کوئی مشکل نہیں آئی تو پلٹ کر دیکھ لو کہیں تم غلط سمت پر تو نہیں جا رہے۔ اس کا مطلب ہے مشکلیں ہمیں ہماری منزل تک لے جاتی ہیں۔ تم اپنے دل سے سارے خدشات مٹا ڈالو اریبہ اور اپنے دل میں صرف اس یقین کو پختہ کر لو کہ آج سے پہلے ہماری زندگی میں جو بھی آیا یا آئی، وہ ہمارے راستے کی مشکلیں یا آزمائشیں تھیں اور ہمیں ان مشکلوں کا شکر گزار ہونا چاہیے، جن کی بدولت ہماری منزل تک رسائی ممکن ہوئی۔" وہ ایک لحظ کو رکا پھر کہنے لگا۔

"کبھی تم نے کہا تھا کہ جانے میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں پرپوز کیا تھا یا یہ میرے دماغ کا فیصلہ تھا تو میں بھی تمہیں بتا دوں اریبہ! کہ میرا دل تو تب ہی تمہاری تمنا کرنے لگا تھا جب ایک چھوٹے سے مکان میں تمہارے وجود سے مجھے گھر کا احساس ہونے لگا تھا، لیکن میں صرف دل کی نہیں مانتا اگر مجھے صرف دل کی ماننی ہوتی تو اس وقت میرے سامنے تم نہیں، تاباں ہوتی۔"

"تاباں۔" اریبہ کے ہونٹ نیم وا ہو کر رہ گئے۔

"ہاں! ایک ادھوری داستان مجھ سے بھی منسوب ہے اور تمہاری طرح میں بھی اپنی زندگی سے وہ ماہ و سال نکالنے پر قادر نہیں ہوں، لیکن یہ یقین سے کہوں گا کہ ان ماہ و سال کا میری آئندہ زندگی میں کہیں دخل نہیں ہوگا۔"

شمشیر علی نے بتا کر یقین سے کہا تو اریبہ سر جھکا کر جانے کیا سوچنے لگی۔ وہ کچھ دیر اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتا رہا پھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ ایک دم سر اونچا کر کے بولی۔

"چلیں؟"

"کہاں؟" وہ کہہ کر سٹپٹایا پھر سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "ہاں چلنا چاہیے۔"

اریبہ نے پہلے اس کے اٹھنے کا انتظار کیا پھر اس کے ساتھ چلتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور دل میں اعتراف کیا کہ اس پوری دنیا میں یہ واحد شخص ہے، جس کے ساتھ وہ سر اٹھا کر چل سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

"اماں! جمیلہ آپا کی بیٹی تاجور میرے پاس ہے۔ میرے گھر میں ہے۔"

یاسمین نے گھر آتے ہی اماں کو بتایا، وہ تمام راستہ اس عجیب اتفاق پر حیران تھی اور یہی سوچتی رہی تھی کہ

قدرت انسان کو کیسے کیسے اور کہاں کہاں ملاتی ہے اور اس ملن میں کیا بھید ہے، یہ تو بھید کھلنے پر ہی سمجھ میں آتا ہے۔

"تیرے پاس۔ تیرے پاس کیسے آ گئی؟" اماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ اماں! تاجور بیمار تھی تو اریبہ پہلے اسپتال میں اس کا علاج کر رہی تھی پھر اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی تب سے وہ میرے گھر میں ہے، لیکن اماں! مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ جمیلہ آپا کی بیٹی ہے۔ یہ تو ابھی پتا چلا ہے، میں خود حیران ہو رہی ہوں۔" یاسمین نے بتایا۔

"اور جمیلہ کا بیٹا وہ بھی تیرے گھر میں نوکر ہے؟" اماں نے پوچھا تو یاسمین چونک کر انہیں دیکھنے لگی پھر سوچتے ہوئے انداز میں نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں! اس کا تو مجھے پتا نہیں ہے۔ اریبہ نے تو بتایا تھا۔" یاسمین پھر سوچ میں پڑ گئی۔

"چل اچھا ہے، بچی تیرے پاس آرام سے ہے اور اب تو تجھے پتا چل گیا ہے اب زیادہ خیال رکھنا تاجور کا۔ بن ماں کی بچی ہے۔" اماں نے کہا۔

"لیکن اماں! اس کا بھائی، جمیلہ آپا کا بیٹا۔" یاسمین کا ذہن الجھ گیا تھا اسے اریبہ کی بات یاد تھی اس نے تاجور کے بارے میں کہا تھا کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔

"بتایا تو تھا جمیلہ کی سوکن نے کہ اس کا بیٹا شہر میں کہیں نوکر ہے۔"

"ہاں لیکن۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر پرس میں سے موبائل فون نکالا اور اماں کے پاس سے اٹھ کر صحن میں آ کر اریبہ کا نمبر ملایا۔

"السلام علیکم مما!" اریبہ نے فوراً" اس کی کال ریسیو کی تھی۔

"وعلیکم السلام بیٹا! کیسی ہو؟" یاسمین نے کوشش سے اپنا دھیان اریبہ کی طرف منتقل کیا تھا۔

"بالکل ٹھیک مما! آپ کب آ رہی ہیں؟" اریبہ نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

"آ جاؤں گی بیٹا! جلدی آؤں گی۔ تم بتاؤ، گھر میں سب ٹھیک ہیں؟"

"جی سب ٹھیک ہیں مما! لیکن آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔" اریبہ نے کہا تو یاسمین گہری سانس کھینچ کر بولی۔

"پریشان نہیں ہوں بیٹا! تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"جی۔۔۔"

"بیٹا! وہ جو لڑکی تاجور ہمارے گھر میں ہے، تم نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔"

یاسمین کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اریبہ بول پڑی۔

"وہ تو میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا مما! اصل میں تاجور سوتیلی ماں کی ستائی ہوئی تھی، پھر اس کا بھائی اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا، لیکن یہاں مسئلہ یہ تھا کہ وہ سارا دن بہن کو اکیلے گھر میں نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ وہ جاب کرتا ہے اس لیے میں تاجور کو اپنے ساتھ لے آئی تھی۔"

"تم اس کے بھائی کو جانتی ہو؟" یاسمین نے فوراً" پوچھا۔

"جی مما! تاجور کے بھائی کا نام شمشیر علی ہے۔ جب میرا بائیک ایکسیڈنٹ ہوا تھا تب شمشیر علی نے مجھے اسپتال پہنچایا تھا اور میں تب سے ہی اسے جانتی ہوں۔ اس نے مجھ پر بلکہ سمجھیں تو آپ پر بھی احسان کیا تھا اور میں اس احسان کا بدلہ تو نہیں اتار سکتی، لیکن اس کی پرابلم سمجھتے ہوئے میں تاجور کو گھر لے آئی تھی۔" اریبہ اب

اپنے حساب سے شمشیر علی کو متعارف کرا رہی تھی۔
"ہاں بیٹا! یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" فوری طور پر یاسمین یہی کہہ سکی۔
"لیکن مما! آپ کو اس وقت تاجور کا خیال کیسے آگیا؟" اریبہ نے پوچھا۔
"بس بیٹا یوں ہی بلکہ میں آؤں گی تو بتاؤں گی اور ہاں! شمشیر علی، تاجور سے ملنے آتا ہے؟" یاسمین نے ٹالتے ٹالتے بے ساختہ پوچھا تھا۔
"جی مما! آتا ہے۔"
"اچھا بیٹا! ٹھیک ہے۔" یاسمین نے سیل آف کر کے یوں سر ہلایا جیسے ابھی بھی اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ پھر اماں کے پاس آتے ہی بولی تھی۔
"بس اماں! اب چلنے کی تیاری کریں۔"
"ہائیں! میں کہاں چلنے کی تیاری کروں؟" اماں اسے دیکھنے لگیں۔
"میرے ساتھ میرے گھر۔" وہ زور دے کر کہنے لگی۔ "ضد نہ کریں اماں! یہاں اکیلی پڑی رہتی ہیں، وہاں بچے ہیں ان کے ساتھ آپ کا دل بہل جائے گا۔"
"یہاں بھی محلے والے آتے جاتے رہتے ہیں۔" اماں کے انداز میں بچوں کی سی ناراضی تھی۔
"ہاں دیکھ لیا ہے میں نے، کون کون آتا جاتا ہے، پھر بھی میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی اماں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔ کیا آپ سمجھتی ہیں اب یہاں سے جا کر میں چین سے رہ سکوں گی؟ نہیں اماں! میرا دھیان ہر وقت آپ کی طرف رہے گا۔" یاسمین رونے لگی تو اماں خاموش ہو گئیں۔
"اگر آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گی تو میں سمجھوں گی آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔" یاسمین روتے ہوئے بولی تھی۔
"اچھا بس چپ ہو جا، ذرا ذرا سی بات پہ رونے لگتی ہے۔" اماں سے اس کا رونا برداشت نہیں ہوا تھا۔
"میری قسمت میں ہی رونا لکھا ہے۔" وہ کہہ کر اٹھنے لگی تو اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"چل رہی ہوں پر دیکھ، پھر مجھے ادھر ہی لے آنا۔"
یاسمین اماں کا مطلب سمجھ کر چپ ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

شمشیر علی بہت خوش تھا اور خوشی میں بوکھلا بھی گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ کبھی کچن میں برتنوں کی ترتیب بدلنے لگتا۔ کبھی لاؤنج میں رکھے گملے ادھر سے ادھر کرتا پھر سوچتا کہ اریبہ کو کیا چیز کہاں اچھی لگے گی۔ وہ خود گھر میں زیادہ سامان بھرنے کا قائل نہیں تھا۔ لیکن اریبہ کے لیے اسے اور بہت سی چیزوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ مزید گھر میں جو تھوڑا بہت سامان تھا۔ وہ بھی پرانا لگنے لگا تھا، شاید اس لیے کہ وہ خود اس وقت خوشی کی انتہا پر تھا اور چاہتا تھا اریبہ کے لیے سارا جہان خرید لائے۔ غالباً "زندگی کے ساتھ محبت کا معیار بھی بدل گیا تھا، کیونکہ تاباں کے لیے اس نے ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔ بہرحال اس وقت گھر کی نئے سرے سے سیٹنگ سوچتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ ابھی اسے توصیف احمد سے بات کرنی ہے۔ پتا نہیں وہ اسے اپنی بیٹی کے لیے پسند کرتے بھی ہیں کہ نہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے سیل فون اٹھا کر پہلے ابا کو فون کیا تھا۔
"السلام علیکم ابا!"
"وعلیکم السلام۔" ہمیشہ کی طرح ابا کا نروٹھا انداز تھا۔ نہ خوشی کا اظہار نہ شکوہ کہ اتنے دنوں بعد میری یاد آئی

ہے۔
"کیا حال ہے ابا! گھر میں سب خیریت ہے؟" اس نے پھر بھی لگاوٹ سے پوچھا۔
"ہاں! شکر ہے۔"
"اچھا ابا! میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اصل بات پر آگیا۔
"ضرور کر۔ کس نے منع کیا ہے، ہمن سے فارغ ہو گیا ہے؟" ابا نے پوچھا تو وہ سمجھا نہیں۔
"کیا مطلب؟"
"میں تاجور کا پوچھ رہا ہوں۔ تاجور کی شادی کر دی ہے؟" ابا اس کے نہ سمجھنے پر جھنجلائے تھے۔
"نہیں..." وہ بھی چڑ گیا۔ "میں کیسے تاجور کی شادی کر سکتا ہوں ابا! میری بیوی آئے گی تو وہ یہ کام کرے گی۔"
"اچھا تو کر شادی... لے آ بیوی۔" ابا نے کہا تو اس نے پہلے خود پر ضبط کیا پھر کہنے لگا۔
"ابا! بیوی ایسے ہی تو نہیں آجاتی نا آپ آئیں، میرا مطلب ہے، میرا رشتہ لے کر جائیں گے تو بات بنے گی نا۔"
"لے میں کیسے آجاؤں، ادھر گھر کون دیکھے گا؟" ابا نے کہا تو وہ جز بز ہو کر بولا۔
"ایک دن کی تو بات ہے ابا!"
"نہ پتر! ایک دن تو آنے جانے میں لگ جائے گا، تجھے جو کرنا ہے، آپ کر۔"
اسے ابا سے زیادہ امید تو نہیں تھی، بس ایک موہوم سی آس کہ شاید اس کی شادی کا سن کر خوش ہو جائیں، وہ بھی ٹوٹ گئی تو کتنی دیر وہ گم صم بیٹھا رہا۔ پھر پہلے اس نے چائے بنانے میں اپنا دھیان بٹایا۔ اس کے بعد سکون سے توصیف احمد کا نمبر ملایا تھا۔
"سر! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔
"جی سر! ابھی..."
"تھینک یو سر! میں آ رہا ہوں۔"
سیل آف کرتے ہی اس کے اندر بجلی دوڑ گئی۔ جب سب کچھ اسے ہی کرنا ہے تو پھر دیر کیوں۔ تیاری میں اس

نے صرف دس منٹ لگائے اور تقریباً "بیس منٹ بعد وہ توصیف احمد کے سامنے کھڑا تھا۔

"بیٹھو شمشیر علی! سب ٹھیک ہے نا؟" توصیف احمد نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی سر...!" وہ بیٹھ گیا۔

"کوئی آفیشل پرابلم ہے؟" توصیف احمد سگار ہاتھ میں لے کر اسے دیکھنے لگے۔

"نو سر! میں اس وقت آفیشل کام سے نہیں، بلکہ پرسنل کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔" وہ فیصلہ تقدیر پر چھوڑ کر پُر اعتماد تھا۔

"ہاں کہو...!" توصیف احمد نے اب اپنا دھیان اس کی طرف منتقل کیا۔ وہ چند ثانیے کو رکا پھر بغیر کسی تمہید کے بولا تھا۔

"سر! میں اریبہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

توصیف احمد نے بے اختیار انگلیوں میں دبے سگار پر گرفت مضبوط کی تھی۔

شمشیر علی نے اپنی بات کہہ کر نظریں جھکالی تھیں اور اپنے چہرے پر توصیف احمد کی نظریں محسوس کرتے ہوئے ان کے بولنے کا منتظر تھا۔

"ہوں!" کتنی دیر بعد توصیف احمد نے ہنکارا بھر کر فقط اس قدر پوچھا۔ "تمہارے ماں باپ؟"

"جی! میری ماں میرے بچپن میں انتقال کر گئی تھیں، اس وقت میری بہن تاجور سال بھر کی تھی، پھر میرے باپ نے دوسری شادی کرلی اور وہ اپنے بال بچوں میں یوں مگن ہوگئے کہ میں اور تاجور کہیں پس منظر میں چلے گئے تھے۔ پھر اللہ نے مجھے ہمت دی، میں نے خود محنت مزدوری کرکے تعلیم حاصل کی اور آج میں آپ کے سامنے جو کچھ بھی ہوں۔ اپنی محنت کے بل بوتے پر ہوں۔ اس میں اللہ کی مدد کے سوا کسی کا حتیٰ کے میرے باپ کا تعاون بھی شامل نہیں ہے۔"

اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مختصراً بتادیا جس پر توصیف احمد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اس پر سے نظریں ہٹا کر نئے سرے سے سگار سلگانے لگے۔

شمشیر علی بہت کوشش سے بھی ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں کھوج سکا تو آس و نراس میں گھر گیا۔

"ٹھیک ہے شمشیر علی!" توصیف احمد سگار سلگانے کے بعد اسے دیکھ کر بولے۔ "میں اریبہ کی مدر سے بات کروں گا اور اریبہ کی مرضی معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ تم جانتے ہو وہ پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہے۔ اگر وہ پسند کرے گی تو پھر شاید مجھے اور اس کی مدر کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"جی...!" اس کا دل ہلکورے لینے لگا تھا اور اب توصیف احمد کے سامنے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"میں جاؤں سر...؟" وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں۔" توصیف احمد نے سر اونچا کرکے اسے دیکھا۔ "اپنی بہن سے نہیں ملوگے؟"

"جی...!" وہ سٹپٹا گیا۔

"چلو، پھر آجانا، ابھی اریبہ اسے آؤٹنگ پر لے گئی ہے۔" توصیف احمد بظاہر سیدھے سادے انداز میں بولے تھے، لیکن ان کے چہرے پر محظوظ مسکراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے سر! میں پھر آجاؤں گا۔" وہ جلدی سے ان سے ہاتھ ملا کر باہر نکل آیا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی اریبہ کو فون کر ڈالا۔

"کہاں ہو اریبہ؟" فون ریسیو ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ابھی وہاں سے نکلنا مت۔ میں آرہا ہوں۔" اس نے اریبہ کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور

سیل آف کرکے اسپیڈ سے گاڑی بھگادی تھی۔

☼ ☼ ☼
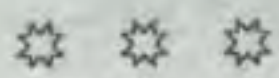
تین دن بعد ثنا کی شادی تھی تو اسی سلسلے میں اریبہ، سارہ اور تاجور کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ کپڑوں کے ساتھ میچنگ سینڈلز وہ لے چکی تھیں۔ اس کے بعد سارہ اور تاجور جیولری دیکھ رہی تھیں جب اس نے شمشیر علی کی کال ریسیو کی تھی۔ اسے جیولری کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اس لیے وہ ایک طرف کھڑی تھی اور کیونکہ شمشیر علی نے اس کی بات ہی نہیں سنی تھی اور آنے کا کہا تھا تو اس کی نظریں گلاس ڈور سے باہر بھٹک رہی تھیں۔ اس وقت تک وہ بالکل نارمل تھی، لیکن جیسے ہی خود کار زینے سے شمشیر علی کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے اندر ہلچل مچ گئی تھی۔ بالکل غیرارادی طور پر اس نے ایک نظر سارہ اور تاجور کو دیکھا پھر گلاس ڈور دھکیل کر تیز قدموں سے خود کار زینے کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔

شمشیر علی اسے دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا پھر قریب آکر بولا تھا۔

"تمہارے ڈیڈی تو بتا رہے تھے، تاجور اور سارہ بھی تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تم گھر گئے تھے؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"ہاں توصیف صاحب سے کام تھا۔" شمشیر علی کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"اچھا! سارہ اور تاجور وہاں جیولری دیکھ رہی ہیں۔" اریبہ نے اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے کترا کر دکان کی طرف اشارہ کیا تو وہ ایک نظر ادھر ڈال کر پوچھنے لگا۔

"کس سلسلے میں؟ آئی مین تمہاری شادی کی تیاری ہو رہی ہے؟"

"ابھی تو میری کزن کی شادی ہے۔" وہ کہہ کر پھر تیز قدموں سے واپس پلٹی تو شمشیر علی بھی اس کے ساتھ آگیا اور تاجور کے سر پر چپت مار کر بولا۔

"کیا کر رہی ہو؟"

"ہائے بھائی! آپ کیسے آگئے؟" تاجور اسے دیکھ کر خوش ہوگئی۔

"السلام علیکم۔" سارہ نے اسے دیکھ کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، کیسی ہو؟" وہ خوش دلی سے مسکرایا تو سارہ بے دھیانی میں اسے اور اریبہ کو ساتھ ساتھ دیکھے گئی۔

"جلدی کرو سارہ!" اریبہ نے سارہ کی نظروں سے کنفیوز ہو کر اسے ٹوکا تو وہ چونک کر بولی۔

"ہاں بس وہ پیک کر رہا ہے تم وہاں پے منٹ کردو۔"

اریبہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی، لیکن اس کے پرس کھولنے تک شمشیر علی نے پے منٹ کردی تو وہ کچھ ناراضی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ایک ہی بات ہے، تم کرو یا میں۔" وہ مسکرا کر بولا تو وہ سارہ اور تاجور کو جلدی آنے کا کہتے ہوئے دکان سے نکل آئی۔

شمشیر علی، سارہ اور تاجور کو ساتھ لے کر اس کے پاس آتے ہی بولا۔

"میرا خیال ہے۔ اب کچھ ریفرشمنٹ ہوجائے۔"

"جی نہیں! ہمیں پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔" وہ عجلت دکھانے لگی۔

"کچھ دیر اور سہی۔" وہ دھیرے سے بولا۔ اس کے لہجے میں "میری خاطر" کا مان تھا۔ وہ سارہ کو دیکھنے لگی۔

"میں شیک پیوں گی۔" سارہ نے فوراً" کہا تو وہ تاجور سے پوچھنے لگا۔
"اور تم...؟"
"میں بھی شیک..."
"چلو پھر..." وہ کولڈ کارنر کی طرف بڑھ گیا تو اریبہ سارہ کے بازو میں چٹکی کاٹ کر بولی۔
"کیا ضرورت تھی۔"
"تھی نا۔ بے چارے بھائی جان اتنے پیار سے کہہ رہے تھے اور پیار سے تو کوئی زہر بھی پلائے تو پی لینا چاہیے۔" سارہ کی شوخی پر وہ دانت پیس کر رہ گئی۔
پھر کولڈ کارنر پر وہ مسلسل شمشیر علی کو نظرانداز کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔ جانے وہ اتنا بے اختیار کیوں ہو رہا تھا۔
"آپ کچھ اور پییں گی؟" اس نے شیک کا گلاس خالی کیا تو وہ پوچھنے لگا۔
"نو تھینکس۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو سارہ!"
"آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں نا بھائی جان!" سارہ نے اٹھتے ہوئے شمشیر علی سے کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔
"پھر آؤں گا بلکہ فرصت سے آؤں گا۔"
"ضرور۔ چلو تاجور۔" سارہ تاجور کے ساتھ شاپرز اٹھانے لگی تو شمشیر علی اریبہ کو دیکھنے لگا۔ اعتراف کے بعد حیا نے اس کی آنکھوں کو بوجھل کر دیا تھا۔ وہ نظریں چراتی اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا اسے بتائے کہ وہ ابھی اس کے ڈیڈی سے اسے مانگ کر آ رہا ہے۔
"اف! یہ اسے کیا ہو گیا ہے۔" اریبہ کو اس کی نظروں سے گھبراہٹ ہونے لگی تو سارہ اور تاجور پر جھنجلاتے ہوئے چل پڑی اور راستے میں بھی انہیں سخت سست کہتے ہوئے گھر آئی تو یاسمین کے ساتھ اماں کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔
"السلام علیکم مما۔" وہ اور سارہ ایک ساتھ یاسمین سے لپٹی تھیں۔
"خوش رہو بیٹا۔ دیکھو میں تمہاری نانی اماں کو لے آئی ہوں۔" یاسمین دونوں کو پیار کر کے اماں سے بولی۔
"اماں! یہ آپ کی نواسیاں ہیں۔ اریبہ اور سارہ۔"
"السلام علیکم نانی اماں!" دونوں یاسمین کو چھوڑ کر اماں سے لپٹ گئیں۔
"ہاں، نانی کو دیکھا تو پیار آ گیا۔" اماں کی محبت امڈ آئی۔ باری باری دونوں کو چومنے لگیں۔
"تاجور! آؤ بیٹا۔" یاسمین نے تاجور کی طرف بانہیں پھیلائیں تو اریبہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر وہ مزید حیرت میں گھر گئی کہ اگلے پل یاسمین، تاجور کو کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے رو رہی تھی۔
"مما!" اریبہ سارہ کو ادھر متوجہ کرتے ہوئے اٹھ کر یاسمین کے پاس آ گئی۔
"کیا ہوا مما...؟"
یاسمین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی پھر تاجور کو اماں کے قریب کر کے بولی۔
"اماں! یہ ہے جمیلہ آپا کی بیٹی۔"
"جمیلہ آپا۔" اریبہ اور سارہ نے نہ سمجھنے کے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا جبکہ تاجور حیران تھی۔
"ہاں بیٹا! جمیلہ آپا میری ماموں زاد بہن تھیں، تاجور ان ہی کی بیٹی ہے اور دیکھو، مجھے پتا ہی نہیں تھا۔" یاسمین اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بتانے لگی۔ "ابھی میں اماں کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی تو وہاں سے مجھے پتا چلا کہ یہ تو میری اپنی ہے۔ میری پیاری جمیلہ آپا کی بیٹی۔"

"ارے یہ تو سچ مچ ہماری بہن نکلی اور بھائی جان بھی اپنے ہیں۔" سارہ نے خوش ہو کر کہا تو وہ اس نئے رشتے کو سوچتے ہوئے زیر لب مسکرائی پھر تاجور کو دیکھنے لگی اماں اسے سینے سے لگائے کہہ رہی تھیں۔
"تیری ماں بڑی نیک عورت تھی۔ نیکوں کی اولاد کو اللہ رُلنے نہیں دیتا۔ آپ حفاظت کرتا ہے ان کی۔ دیکھ تو کیسے اپنوں میں آ گئی ہے۔" تاجور سمجھ رہی تھی یا نہیں، بس سر ہلائے جا رہی تھی۔
اریبہ نے بے اختیار یاسمین کو دیکھا پھر فوراً" نظریں چرا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ اچانک متضاد کیفیات میں گھر گئی تھی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک اور اچھا لگ رہا تھا پر جانے کیوں دل اداس ہو گیا تھا۔
"شام کو پتا چلے گا کہ ہم کزن ہیں تو..." اس نے سوچتے ہوئے پرس میں سے سیل فون نکال لیا کہ شمشیر علی کو اس نئے رشتے کے بارے میں بتائے، لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے سیل واپس رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے کھانے پر توصیف احمد بھی موجود تھے۔ اسی وقت یاسمین نے انہیں تاجور کے بارے میں بتایا کہ وہ اس کی ماموں زاد بہن کی بیٹی ہے۔ جس پر توصیف احمد چونک کر تاجور کو دیکھنے لگے۔ کچھ بولے نہیں تھے کیونکہ ان کا ذہن پہلے ہی شمشیر علی کو سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا تو یہ نہیں تھا کہ انہیں اس کی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ یقین کے باوجود بھی انہیں اپنے طور پر اس کا فیملی بیک گراؤنڈ دیکھنا تھا جو اب اچانک ان کے سامنے آ گیا تھا تو انہیں اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔
"اس کا بھائی شمشیر علی، مجھے سارہ نے بتایا ہے کہ وہ آپ کے آفس میں ہوتا ہے۔" یاسمین نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر بولے۔
"ہاں میرے نئے آفس میں جی ایم ہے۔"
"جی ایم...!" یاسمین حیران ہوئی۔ "اس کا مطلب ہے پڑھا لکھا ہے۔"
"ظاہر ہے۔ کسی ان پڑھ کو تو میں جی ایم بنانے سے رہا۔ اچھا، محنتی، ایمان دار لڑکا ہے۔" توصیف احمد نے دوسری بات کہتے ہوئے اریبہ پر نظر ڈالی تھی جس کے چہرے پر ایک رنگ لہرایا تھا۔
"مجھے خوشی ہوئی۔ جمیلہ آپا کا خواب پورا ہو گیا۔" یاسمین نے کہا پھر تاجور سے پوچھنے لگی۔
"بیٹا! تم نے شمشیر کو بتایا؟"
"جی خالہ! بھائی بہت خوش ہوئے۔ کہہ رہے تھے، صبح آپ سے ملنے آئیں گے۔" تاجور کی جھجک فطری تھی۔ وہ خوشی کا برملا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔
"اچھی بات۔"
"او کے، سارہ بیٹا! کھانے کے بعد مجھے کافی دے دینا؟" توصیف احمد نے اٹھتے ہوئے کہا تو یاسمین یہی سمجھی کہ وہ تاجور اور شمشیر کے موضوع سے اکتا کر جا رہے ہیں۔ اس نے کن اکھیوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور کچھ خائف ہو گئی کہ پتا نہیں توصیف احمد اب اس کے رشتہ داروں کو یہاں برداشت کریں گے کہ نہیں۔
"آپ کیا سوچنے لگیں مما۔" سارہ نے پوچھا تو وہ چونک کر بولی۔
"کچھ نہیں بیٹا! تم جلدی سے ڈیڈی کے لیے کافی بنا دو۔ میں اماں کو دیکھ لوں نئی جگہ پر پتا نہیں انہیں نیند آتی ہے کہ نہیں۔"
"آپ فکر نہ کریں مما! میں نانی اماں کے ساتھ سوؤں گی۔" سارہ شوق سے بولی تو یاسمین سر ہلاتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ آئی اور پہلے اس نے اماں کی طرف سے اطمینان کیا پھر اپنے کمرے میں آتے ہوئے رک گئی۔

توصیف احمد وہیں بیٹھے تھے اور جانے کس سوچ میں گم تھے کہ انہیں یاسمین کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

"توصیف۔" اپنے تئیں ان کی سوچ تک رسائی کی کوشش میں ناکام ہو کر یاسمین نے دھیرے سے پکارا۔

"ہوں۔" توصیف احمد چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ یاسمین کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"بیٹھو، مجھے کچھ بات کرنی ہے۔" توصیف احمد نے سہولت سے کہا تو وہ پھر اپنے طور پر قیاس کرتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھتے ہی بے اختیار بولی تھی۔

"اماں آنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ میں زبردستی۔"

"ہاں! اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا تم انہیں اپنے ساتھ لے آئیں وہاں کوئی ان کا خیال کرنے والا نہیں تھا۔" توصیف احمد نے اس کی سوچ پر پانی پھیر دیا تھا۔

"ہاں لیکن آپ۔ میرا مطلب ہے، آپ تو یہاں سے ہی اماں کا خیال کر رہے تھے۔ ان کے اخراجات کے لیے ماہانہ رقم بھیجتے رہے ہیں۔" یاسمین احسان مندی سے مغلوب ہو کر بولی تھی۔

"میرا خیال ہے، یہ میرا فرض بنتا تھا۔ تم اسے احسان مت سمجھو۔" توصیف احمد کا ظرف تھا کہ انہوں نے جتانے کے بجائے یاسمین کو بھی ٹوک دیا تھا۔

"کیسے نہ سمجھوں احسان! میں نے بیٹی ہو کر کبھی پلٹ کر ان کی خبر نہ لی اور آپ نے میری بدسلوکی کے باوجود میرے ماں باپ کا خیال کیا۔ آپ انسان نہیں۔"

"بس۔ مجھے فرشتہ مت بناؤ۔" توصیف احمد ہاتھ اٹھا کر بولے تو یاسمین نے سر جھکا لیا اور اپنی ہمتیں یکجا کرنے لگی۔

وہ توصیف احمد سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ان کی چاہت کو سمجھنے کے باوجود وہ قصداً انہیں اذیت پہنچاتی رہی، وہ ان کی گنہگار ہے اور جب تک وہ اسے معاف نہیں کریں گے۔ اللہ بھی اسے معاف نہیں کرے گا۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ سارہ توصیف احمد کے لیے کافی لے آئی۔

"ڈیڈی! آپ کا سیل آف ہے کیا؟" سارہ نے کافی کا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پوچھا تو یاسمین بلا ارادہ متوجہ ہو گئی تھی۔

"پتا نہیں بیٹا! وہاں سٹنگ روم میں رکھا ہے۔ کیوں کیا ہوا۔"

"وہ خالدہ آنٹی کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہی تھیں۔ آپ یہیں رکیں گے؟" سارہ نے بتایا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر بولے۔

"ہاں! آپ انہیں فون کر کے بتا دو میں آج یہیں ہوں۔"

"جی!" سارہ چلی گئی تو انہوں نے کافی کا مگ اٹھا کر یاسمین کو دیکھا۔ وہ انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ مجھے لگ رہا ہے تم کسی الجھن میں ہو۔" انہوں نے کہا تو یاسمین ایک دم اٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔

"مجھے معاف کر دیں توصیف! میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اور انجانے میں نہیں، بلکہ جان بوجھ کر آپ کو زک پہنچاتی رہی۔ اپنی جھوٹی انا اور ضد میں میں یہ بھی بھول گئی کہ میں کسی اور کا نہیں، اپنا اور اپنی اولاد کا نقصان کر رہی ہوں۔" وہ رونے لگی۔

توصیف احمد کے لیے اب یہ ساری باتیں بے معنی تھیں کیونکہ انہوں نے خود کو اس کا پابند نہیں رکھا تھا۔ وہ اپنی زندگی جی رہے تھے۔ پھر وہ بہت پریکٹیکل تھے۔ اس لیے یاسمین کے رونے کا نوٹس لیے بغیر کہنے لگے۔

"بھول جاؤ سب۔ یہ ماضی پر کڑھنے کا وقت نہیں ہے۔ اس وقت ہمیں اپنے بچوں کا مستقبل سوچنا ہے۔"

یاسمین ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"ہاں! مجھے اریبہ سے متعلق بات کرنی ہے۔ بیٹھ جاؤ آرام سے۔" انہوں نے کہا تو یاسمین کسی روبوٹ کی طرح وہیں بیٹھ گئی۔ اصل میں وہ ہرٹ ہوئی تھی کہ اس کی بات ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی کہ ختم ہو گئی تھی۔ توصیف احمد کافی کا گھونٹ لے کر کہنے لگے۔

"اریبہ کے لیے پروپوزل آیا ہے۔ میں شام سے اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میں اس معاملے کو طول نہیں دینا چاہتا۔ مجھے لڑکا پسند ہے، تم اریبہ کی مرضی معلوم کر لو تو۔"

"کون ہے؟" یاسمین نے بے صبری سے پوچھا۔

"شمشیر علی۔ میں اسے بہت عرصے سے جانتا ہوں، البتہ یہ ابھی معلوم ہوا ہے کہ وہ تمہاری کسی عزیزہ کا بیٹا ہے۔"

توصیف احمد نے بتاتے ہوئے کہا تو یاسمین انہیں دیکھنے لگی۔ وہ نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت میں گھر گئی تھی۔ زندگی کے اسرار و رموز سمجھنا آسان نہیں ہے۔ طویل سفر کے بعد جب یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے تو عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔

"میں چاہتا ہوں تم جلدی اریبہ کی مرضی معلوم کر لو بلکہ ابھی اگر وہ ایگری کرتی ہے تو پھر میں ثنا کی شادی سے پہلے اریبہ کا نکاح کر دوں گا۔" توصیف احمد جانے کیا سوچے بیٹھے تھے۔

"اتنی جلدی۔" یاسمین الجھ گئی۔

"ہاں! میں اپنی بیٹی کو کسی کمپلکس کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتا۔ ثنا کی شادی پر کوئی میری بیٹی پر ترس کھائے، یہ مجھے گوارا نہیں۔ اس لیے تم ابھی اریبہ سے بات کر لو۔ وقت کم ہے۔ صرف دو دن۔" انہوں نے کہا تو یاسمین قدرے سناٹے میں بولی تھی۔

"اگر اریبہ نے منع کر دیا؟"

"نہیں کرے گی۔ اریبہ منع نہیں کرے گی۔" توصیف احمد اتنے پُر یقین ایسے ہی نہیں تھے انہیں شمشیر علی کا خود آ کر اریبہ سے شادی کا کہنا بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس وقت ساجدہ بیگم، امینہ اور خالدہ تینوں خواتین کا موضوع یاسمین تھی۔ بات اس کے میکے سے شروع ہوئی تھی کہ اتنے برسوں بعد یہ اچانک اس کا میکہ کہاں سے آ گیا، پھر انہیں اس میں بھی یاسمین کی چالیں نظر آنے لگیں۔ امینہ کا کہنا تھا کہ یاسمین کے اپنے اعمال اس کے سامنے آ گئے ہیں۔ وہ جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی تو اریبہ کی گمشدگی پر رازی سے رشتہ ختم ہو جانے کی وجہ سے اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اس لیے وہ میکے کے بہانے نہیں چلی گئی ہے صرف ثنا کی شادی سے فرار کی خاطر کہ خاندان والوں کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

امینہ کی اس بات سے ساجدہ بیگم اور خالدہ اتفاق کر رہی تھیں کہ اس وقت یاسمین آ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگ تھے اور چہرے پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ سے لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی محاذ فتح کر کے آ رہی ہو۔

"السلام علیکم!" یاسمین نے قریب آ کر سلام کیا تو امینہ بوکھلا گئیں۔ لیکن ساجدہ بیگم نے خوب صورتی سے بات گھما دی۔

"وعلیکم السلام! بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔"

"اچھا۔" یاسمین نے اس بات کو طول نہیں دیا۔ کیونکہ سب کے چہروں سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا ذکر

کن لفظوں میں ہو رہا تھا۔

"میں پرسوں ہی آجاتی۔ لیکن میری اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں رک گئی اور شاید ابھی بھی نہ آپاتی۔ لیکن ادھر توصیف نے۔۔۔" یاسمین نے قصداً" بات ادھوری چھوڑ کر شاپنگ بیگ اٹھا لیے اور ان میں سے ایک ایک چیز نکال کر ساجدہ بیگم کے سامنے رکھنے لگی۔

"بھابھی! یہ ثنا کا جوڑا ہے۔ یہ آپ کا۔۔۔ اور یہ جیولری سیٹ ثنا کے لیے ہے۔"

"ماشاء اللہ" امینہ نے جیولری سیٹ دیکھ کر بے ساختہ کہا۔ "اللہ پہننا نصیب کرے۔"

"آمین۔"

"بچیوں کو بھی لے آتیں۔ شادی کا گھر ہے۔ یہ ہی تو موقع ہوتا ہے' لڑکیاں ہنس کھیل لیتی ہیں۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو یاسمین ہنس کر بولی۔

"کیسے لے آتی بھابھی! میرے اپنے گھر میں افراتفری مچی ہے۔ اریبہ کا نکاح ہے ناں۔"

"اریبہ کا نکاح؟" ساجدہ بیگم سمجھنے' نہ سمجھنے کی کیفیت میں گھر گئیں۔ جبکہ امینہ اچھل پڑی تھیں۔

"ہائیں! اریبہ کا نکاح؟ کب؟ کہاں؟ ہمیں تو پتا ہی نہیں۔"

"مجھے بھی پتا نہیں تھا۔ توصیف نے آناً" فاناً" طے کر کے مجھے بلا لیا۔ ویسے بات تو کافی پہلے سے چل رہی تھی۔" یاسمین کو باتیں بنانے میں تو ویسے بھی کمال حاصل تھا۔ ابھی بھی اس نے خوب صورتی سے ساری بات توصیف احمد پر ڈال دی تھی۔ پھر بظاہر سادگی سے ساجدہ بیگم سے پوچھنے لگی۔

"آپ کو تو توصیف نے بتایا ہو گا ناں بھابھی؟"

"نہیں۔" ساجدہ بیگم جز بز ہوئی تھیں۔

"اچھا! خیر۔ کل شام میں اریبہ کا نکاح ہے۔ آپ سب کو ضرور آنا ہے۔ اتنی جلدی میں کارڈ تو نہیں چھپ سکے۔ اس لیے میں خود آگئی ہوں۔ امینہ! تم سے یہیں کہہ دوں یا تمہارے گھر آؤں؟" یاسمین نے اچانک امینہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"ارے نہیں بھابھی! بس آپ نے کہہ دیا۔۔۔ نہ بھی کہتیں تو میں ضرور آتی۔ بھتیجی کی خوشی میں میں نہیں آؤں گی تو کون آئے گا۔" امینہ خجالت مٹانے کو خوشی کا اظہار کرنے لگیں تو ساجدہ بیگم کو بھی کہنا پڑا۔

"ہاں یاسمین! یہ تو گھر کی بات ہے۔"

"ویسے بھابھی! کہاں کیا ہے اریبہ کا رشتہ؟" امینہ نے پوچھا۔

"توصیف کے جاننے والے ہیں۔" یاسمین اس قدر کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا بھابھی! گھر میں بہت کام ہیں۔"

"ہاں چلو اللہ مبارک کرے۔ تمہیں بھی بہت مبارک ہو۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو یاسمین مسکرائی۔ پھر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ خالدہ بھابھی! آپ کو تو بھائی توصیف نے بتایا ہو گا؟" یاسمین کے جاتے ہی امینہ نے خالدہ سے پوچھا تو خالدہ جو اس عرصے میں خاموش سر جھکائے بیٹھی تھیں ناگواری سے بولیں۔

"نہیں! توصیف میرے ساتھ اس گھر کے معاملے شیئر نہیں کرتے اور نہ میں پوچھتی ہوں۔"

"خیر! یہ تو اچھی بات ہے۔" ساجدہ بیگم نے خالدہ کی کیفیت سمجھتے ہوئے کہہ کر بات بدل دی۔ "چلو! اب بیٹھی باتیں نہ بناتی رہو۔ کچھ تیاری کرو۔ نکاح میں بھی دینا دلانا تو ہو گا ناں۔"

"ہاں! مجھے بھی گھر جانا پڑے گا۔ طیبہ کہاں ہے' ہمیر کو فون کردے۔ آکر ہمیں لے جائے" امینہ پر اب

بوکھلاہٹ سوار ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

شمشیر علی تو پہلے ہی تقدیر پر یقین رکھتا تھا اور تقدیر کی ستم ظریفیوں پر جہاں پہلے وہ رویا تھا تو اب تقدیر کے پلٹا کھانے پر بے پناہ خوش تھا۔ جب تاجور نے اسے بتایا تھا کہ یاسمین اس کی خالہ ہے تو وہ اسی وقت اس سے ملنے کو بے چین ہو گیا تھا اس وقت اسے اریبہ سے رشتے داری کے احساس سے زیادہ اپنی اماں کا خیال آیا تھا کہ یاسمین اس کی ماں کی قریبی عزیز ہے۔ بچپن میں اس نے اپنے نانا نانی کو دیکھا تھا اور ان کی آغوش میں اسے اپنی ماں کی خوشبو ملتی تھی۔ پھر نانا نانی کے بعد وہ اس خوشبو کو ترس گیا تھا۔ تو اب اسے یہ خیال آیا تھا کہ خالہ بھی ماں جیسی ہوتی ہے۔ بہرحال رات اس نے بمشکل کاٹی تھی اور صبح ناشتا کیے بغیر ہی توصیف ولا پہنچ گیا تھا۔ جہاں یاسمین نے اسے گلے لگایا اور پھر یہ مژدہ بھی سنایا تھا کہ توصیف احمد اس کے رشتے سے نہ صرف خوش ہیں۔ بلکہ فوراً" اس کا اور اریبہ کا نکاح بھی کرنا چاہتے ہیں۔ شمشیر علی کو گو کہ فوراً" کی منطق سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اس نے کوئی سوال بھی نہیں اٹھایا تھا۔ وہ یاسمین کی باتوں پر "جی اور جیسا آپ بہتر سمجھتے ہیں۔" ہی کہتا رہا تھا۔

اس کے بعد اس کا بہت دل مچلا تھا کہ وہ اریبہ سے ملے۔ لیکن وہ ہی نہیں آئی تھی اور رات سے اس نے اپنا سیل فون بھی بند کر رکھا تھا۔ جانے وہ اب اس سے بات کرنے سے جھجک رہی تھی یا اسے تڑپانا مقصد تھا۔ اس نے آتے ہوئے سارہ سے کہا تھا کہ وہ اریبہ کا سیل فون آن کرے اور پھر گھر آکر وہ کل اپنے نکاح کی تیاریوں کے ساتھ وقفے وقفے سے اس کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ کہیں سہ پہر میں جا کر اریبہ نے اس کی کال ریسیو کی تھی۔

"اف میرے خدا! کیسی ظالم لڑکی ہو۔ میں کل سے پاگل ہو رہا ہوں اور صبح تو میرا ہارٹ فیل ہونے والا تھا۔" وہ چھوٹتے ہی شروع ہو گیا تھا کہ ادھر اریبہ نے نرمی سے ٹوکا۔

"کیوں؟"

"کیوں؟" وہ سر پیٹنے کے انداز میں بولا۔ "یعنی تم سمجھتی ہی نہیں۔"

"اگر تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میرے کزن ہونے کا شرف حاصل ہونے پر تم خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے اور پھر اتنی جلدی نکاح کا سن کر تمہارا ہارٹ فیل ہونے والا تھا تو یہ تو کوئی ایسی باتیں نہیں ہیں۔"

اریبہ ابھی بھی نرمی سے بولی تھی۔ شمشیر علی نے سیل فون کان سے ہٹا کر اسے یوں دیکھا۔ جیسے اریبہ کا چہرہ دیکھ رہا ہو۔ پھر دوبارہ کان سے لگا کر بولا۔

"ہاں! واقعی۔ یہ تو کوئی ایسی باتیں نہیں ہیں۔"

"پھر تم کیوں پاگل ہو رہے تھے؟" اب اریبہ کا محظوظ لہجہ محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تم بتاؤ۔ کل کا کیا پروگرام ہے؟" اس نے بظاہر سیدھے سادے انداز میں یوں پوچھا تھا کہ اریبہ بے ساختہ بولی تھی۔

"کیسا پروگرام؟"

"صرف نکاح؟ یا رخصتی بھی متوقع ہے؟" وہ کوشش سے بھی خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔ شریر ہو گیا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" خلاف توقع اریبہ نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ رک کر بولا۔

"میری چاہت تم ہو اور جیسا تم چاہو گی۔"

"تو پھر انتظار کرو۔" وہ فوراً" بولی۔

"جو حکم۔" اس نے سر تسلیم خم کیا۔ پھر پوچھنے لگا۔ "ایک بات مانو گی؟"

"تم ایک دن رک جاؤ۔ پھر تو تمہیں ایک نہیں، ہر بات منوانے کا اختیار حاصل ہو جائے گا۔" اریبہ سنجیدہ تھی لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ محسوس کر کے بولا۔

"میں اختیار کا ناجائز استعمال گناہ سمجھتا ہوں۔"

"جانتی ہوں۔ لیکن اپنے معاملے میں میں تمہیں جائز اور ناجائز سے آزاد کر رہی ہوں۔ تمہیں جہاں لگے میں غلط ہوں اور ٹوکنے، سمجھانے کا بھی مجھ پر اثر نہیں ہو رہا تو بے شک میرا حلیہ بگاڑ دینا۔ مجھے شوٹ بھی کر سکتے ہو۔ میں اپنا خون بہا بھی تمہیں معاف کر رہی ہوں۔" وہ جانے کس احساس میں گھری تھی۔ شمشیر علی ٹھٹک گیا۔

"اریبہ! تم ٹھیک تو ہو۔ یہ سب کچھ تمہاری مرضی سے ہو رہا ہے، ناں؟"

"ہاں۔" اریبہ نے "ہاں" کہتے ہی سیل فون بند کر دیا تھا۔

وہ پریشان ہو گیا۔ کیا ہو گیا تھا اسے؟ کہاں تو جان دینے لینے کی بات کر رہی تھی اور اب ایک دم جیسے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس کی دل گرفتی محسوس کرتے ہوئے شمشیر علی کا ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا۔

"خوشیوں میں یہ کون سا رنگ گھل جاتا ہے کہ ساری چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے اریبہ کا نمبر ٹرائی کیا اور حسب توقع "پاور ڈ آف" سن کر پہلے مایوس ہوا۔ پھر اچانک خیال آنے پر تاجور کو فون کیا تو اس کی کھنکتی ہوئی آواز آئی تھی۔

"بھائی! مجھے اتنا اچھا لگ رہا ہے۔ بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

"اچھا! کل کی تیاری کر لی؟" اصل میں وہ اریبہ کی تیاری پوچھنا چاہتا تھا۔

"جی! خالہ میرے لیے اتنے اچھے اچھے سوٹ لائی ہیں۔ وہ ہی پہنوں گی اور سارہ کہہ رہی تھی ہم رات میں مہندی بھی لگائیں گے۔" تاجور نے بتایا تو وہ بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

"اور اریبہ کیا کر رہی ہے؟"

"اریبہ باجی اپنے کمرے میں ہیں۔ ابھی سارہ انہیں بہت تنگ کر رہی تھی۔ چھیڑ رہی تھی آپ کا نام لے لے کر۔" تاجور مزے لے کر بتا رہی تھی کہ اس نے بے صبری سے ٹوکا۔

"پھر؟"

"پھر اریبہ باجی شرما کر اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔" تاجور ہنسنے لگی تو وہ تصور کی آنکھ سے اریبہ کو شرماتے ہوئے دیکھنے لگا۔

ادھر تاجور پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ اس نے "ہوں ہاں" کر کے فون بند کر دیا۔ پھر اپنے آپ بڑبڑایا تھا۔

"عجیب لڑکی ہے۔"

☼ ☼ ☼
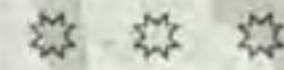
رازی اپنے کمرے میں ساجدہ بیگم کو بیٹھے دیکھ کر یہ ہی سمجھا کہ وہ اس سے کل ہونے والے ثنا کی مہندی کے فنکشن کے انتظامات کے بارے میں پوچھیں گی اور ابھی ٹریفک جام میں پھنسنے کے باعث اس کا ذہن اس بری طرح چیخ رہا تھا کہ وہ مزید مغز ماری نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ان کے پوچھنے سے پہلے ہی کہنے لگا۔

"سارے انتظام ہو گئے ہیں امی! آپ اطمینان رکھیں۔ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہو گی۔ بس آپ سب سے کہہ دیں، وقت کی پابندی کریں۔ نو بجے کلب پہنچ جائیں سب۔"

"نو بجے۔۔۔ ہاں! وہاں سے تو ہم جلدی فارغ ہو جائیں گے۔" ساجدہ بیگم نے اریبہ کے نکاح کا سوچتے ہوئے کہا۔

"مہندی کا فنکشن ہے امی! جلدی کہاں فارغ ہوں گے؟" وہ اپنے حساب سے بولا تو ساجدہ بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر سانس کھینچ کر بولیں۔

"میں مہندی کے فنکشن کی بات نہیں کر رہی۔"

"پھر؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کل اریبہ کا نکاح ہے۔" ساجدہ بیگم کہہ کر نظریں چرا گئیں۔ جبکہ وہ یوں دیکھے گیا۔ جیسے اس کی سماعتوں نے غلط سنا ہو۔ پھر ساجدہ بیگم کی خاموشی محسوس کر کے بولا۔

"اریبہ کا نکاح؟"

"ہاں! آج یاسمین آئی تھی۔ وہ ہی بتا گئی ہے۔ بلکہ بلاوا بھی دے گئی ہے۔ جانا تو پڑے گا۔"

"ہاں! لیکن اس طرح اچانک۔۔۔ میرا مطلب ہے کل تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" وہ یقین اور غیر یقینی میں الجھ کر بولا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کل تک ایسی بات نہیں تھی؟" ساجدہ بیگم کے ٹوکنے پر وہ صاف گوئی سے کہنے لگا۔

"کل میری سارہ سے بات ہوئی تھی۔ اس نے تو اشارتاً "بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ پھر امی! آپ سوچیں اگر پہلے سے سب طے ہوتا تو چچا جان "ون" تاریخ کا خیال رکھتے۔ کیا انہیں پتا نہیں ہے کل ثنا کی مہندی ہے؟"

"کیوں پتا نہیں ہے۔ ساری تاریخیں وہ خود تو طے کر گئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے خیال نہیں کیا۔ ابھی صرف نکاح ہی کرنا تھا تو ثنا کی شادی کے بعد بھی ہو سکتا تھا۔"

"آپ نے یہ بات یاسمین آنٹی سے نہیں کہی؟"

"کیسے کہتی؟ یاسمین تو خود اپنے آپ کو انجان ظاہر کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی توصیف نے سب آناً "فاناً" طے کر کے اسے میکے سے بلوالیا۔ مجھے تو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔" ساجدہ بیگم کو غصہ جانے کس بات پر تھا۔

"خیر! آپ کو ان سب باتوں سے کیا لینا دینا۔ یہ بتائیں! اریبہ کا نکاح کہاں اور کس سے ہو رہا ہے؟ اب یہ مت کہہ دیجیے گا کہ یاسمین آنٹی کو یہ بھی پتا نہیں تھا۔" اس نے ساجدہ بیگم کا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔ جبکہ وہ ان سے زیادہ محسوس کر رہا تھا۔

"میں نے زیادہ نہیں کریدا۔ جو یاسمین نے کہا سن لیا تھا۔ وہ بھی میں نے نہیں آمنہ نے پوچھا تھا۔"

"ہاں تو یاسمین آنٹی نے کیا بتایا تھا؟" وہ بہت کوشش سے اپنا تجسس چھپا رہا تھا۔

"نہیں تو توصیف کے جاننے والے۔" ساجدہ بیگم اسے یوں دیکھنے لگیں۔ جیسے وہ توصیف احمد کے سب جاننے والوں سے واقف ہو۔ ذہن تو اس کا بھی ادھر ادھر بھٹکنے لگا تھا۔ لیکن وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا چلیں۔ اب آپ آرام کریں۔ مجھے بھی صبح جلدی اٹھنا ہے۔"

ساجدہ بیگم سمجھ گئیں۔ وہ اس موضوع سے بچنا چاہ رہا ہے۔ جب ہی کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئیں۔ تنہا ہوتے ہی رازی کو لگا۔ جیسے وہ زندگی ہار گیا ہو۔ جانے ہم یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری کج ادائیوں کے باوجود دوسرا تمام عمر انتظار کی دہلیز پر بیٹھا رہے گا۔

"رازی! کیا تم اب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" اس وقت خود ترسی کا شکار اس لڑکی پر اسے ٹوٹ کر ترس آیا تھا۔ پھر بھی اس نے اسے مایوس کر دیا تھا۔

"ہاں! لیکن کروں گا نہیں۔"

کاش! وہ اسے بتا سکتا کہ اس کے "نہیں" میں کیا اسرار تھا۔ وہ جان لیتی تو شاید خود ہی اسے ٹھوکر مار کر چلی جاتی۔ جب ہر دو صورتوں میں جدائی مقدر ہونے جا رہی تھی تو پھر خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ اب وہ خود ترسی کا شکار تھا۔ سینے پر بھاری بوجھ سے سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔ اس نے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ لیکن ہوا ساکن تھی۔ پوری کائنات نے جیسے دم سادھ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼
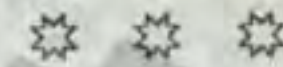
شام سے بہت پہلے توصیف ولا میں مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ کیونکہ عصر کے فوراً بعد نکاح تھا۔ اس کے بعد ہائی ٹی رکھی گئی تھی۔ پھر سب کو ثنا کی مہندی میں جانا تھا۔ بلال رازی کو نہ چاہتے ہوئے بھی آنا پڑا۔ کیونکہ اس گھر سے ناتا توڑنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ یہاں سے اسے سارہ کو بیاہ کر لے جانا تھا۔ اگر یہ خیال نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔ مجبوری بھی انسان سے کیا کیا کرواتی ہے۔ سب سے پہلے انا اور خودداری کے لاشے اٹھتے ہیں۔ دل پر پتھر رکھے وہ توصیف احمد کے ساتھ ساتھ لگا رہا۔ آخر میں خاص مہمانوں کے استقبال کے لیے بھی وہ ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ جب شمشیر علی گاڑی سے نکلا تو وہ بلا ارادہ اسے دیکھے گیا۔ اس کے چہرے پر کھلتی مسکراہٹ اس بات کی غماز تھی کہ وہ اریبہ کے دل پر اپنی محبت کے جھنڈے گاڑ چکا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کا اہل تھا۔

رازی نے توصیف احمد کو اس کی طرف بڑھتے دیکھا۔ پھر وہ وہاں ٹھہر نہیں سکا۔ یوں بھی اسے راستے سے ہٹنا تھا۔ الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے وہ اندر چلا آیا اور پھر نکاح تک اسے کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں اور کیا کرتا پھر رہا ہے۔ جب مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ تب وہ چونک کر جہاں تھا' وہیں رک گیا۔ پھر سب پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں سارہ پر جا ٹھہریں۔ سارہ کے چہرے پر مسکراہٹ۔ لیکن آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ پھر سارہ کے قریب آ کر بولا۔

"مبارک ہو۔" سارہ نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

"زندگی جینا آسان نہیں ہے۔ یہ ہمیں من مانی تو کرنے ہی نہیں دیتی۔ جانتی ہو ابھی میرا کیا دل چاہ رہا ہے؟"

"نہیں اور بتایئے گا بھی مت۔ میں نہیں سننا چاہتی۔" سارہ کے تھکے لہجے نے اسے خاموش کر دیا تھا۔

"آپ نے اریبہ کو خود سے بدظن کرنے کے لیے جو ڈرامے رچائے' اس کے لیے شکریہ۔ باقی آپ مجھ سے کوئی امید مت رکھیں۔"

سارہ ہنوز تھکے انداز میں کہہ کر پلٹ گئی' وہ سناٹے میں کھڑا تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

انتساب،

ں زخمِ جاں کے نام، جو اب تک نہیں بھرا

ں زندہ دل کے نام، جو اب تک نہیں مرا

اس زندگی کے نام، گزارا نہیں جسے

اس قرضِ فن کے نام، اتارا نہیں جسے

اہلِ نظر کے نام، جو جوہر شناس ہیں

اہلِ وفا کے نام، جو فن کی اساس ہیں

اُن دوستوں کے نام، جو گوشہ نشین ہیں

اُن بے حسوں کے نام، جو بارِ زمین ہیں

اُن بے دلوں کے نام، جو ہر دم ملول ہیں

اُن بے بسوں کے نام، جو گملوں کے پھول ہیں

اُن اہلِ دل کے نام، جو راہوں کی دھول ہیں

اُن حوصلوں کے نام، جنہیں دکھ قبول ہے

اس شعلۂ رُخ کے نام کہ روشن ہے جس سے رات

ہے ضوفشاں اندھیرے میں ہر نقطۂ کتاب

اس حسنِ باکمال کی رعنائیوں کے نام

اور اپنے ذہن و قلب کی تنہائیوں کے نام

اعتبار ساجد

ہے کچھ اس طرح سے گھرا ہوا مرا دل غموں کے ہجوم میں

کبھی آندھیوں کے حصار میں، کبھی بادلوں کے ہجوم میں

کبھی ہجر کی چھاؤں سے جل گئے، کبھی وصل کی چھاؤں سے جی اٹھے

ترے مبتلا ہے روز و شب یونہی گردشوں کے ہجوم میں

مہ نو کو کس کی تلاش ہے جو بھٹکتا پھرتا ہے تا سحر

کبھی کہکشاں کے غبار میں، کبھی ظلمتوں کے ہجوم میں

تمہیں دیکھنا ہو جو رقصِ جاں تو دل و نظر کو لیے ہوئے

چلے آنا بزمِ جمال سے کبھی دل جلوں کے ہجوم میں

اشتیاق طالب

کیسی چلی ہے اب کے ہوا تیرے شہر میں
بندے بھی ہو گئے ہیں خدا تیرے شہر میں

کچھ دشمنی کا ڈھب ہے نہ اب دوستی کے طور
دونوں کا ایک رنگ ہوا تیرے شہر میں

اب کیا دیارِ غیر میں ڈھونڈیں ہم آشنا
اپنے تو غیر ہو گئے سب اپنے شہر میں

اک آپ ہیں کہ سارا زمانہ ہے آپ کا
اک ہم کہ اجنبی ہوئے اب اپنے شہر میں

خاطر اب اہلِ دل بھی بنے ہیں زمانہ ساز
کس سے کریں وفا کی طلب اپنے شہر میں

خاطر غزنوی

تعلق تھا، تماشا تو نہیں تھا
محبت تھی، یہ دھاگا تو نہیں تھا

ہماری چاہ بحرِ بیکراں تھی
کوئی پایاب دریا تو نہیں تھا

اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے
وہ یوں کانوں کا کچا تو نہیں تھا

پریشانی میں بھی وہ نرم خو تھا
وہ یوں لہجہ بدلتا تو نہیں تھا

وہ سچا تھا، مجھے اب بھی یقیں ہے
وہ میرے ساتھ جھوٹا تو نہیں تھا

ان ہی باتوں سے کچھ سنبھلا ہے ورنہ
یہ دل اب بھی سنبھلتا تو نہیں تھا

حمیدہ شاہین

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کون سی رات لیلۃ القدر ہے تو مجھے اس میں کیا کہنا چاہیے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یوں کہو،
اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّی
ترجمہ:۔ اے میرے اللہ تو بڑا معاف کرنے والا ہے تو معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔ لہٰذا مجھے معاف فرمادے۔
(احمد، ابن ماجہ، ترمذی)

سر اور دستار،

دورِ آمریت میں آوازِ حق بلند کرنے والے جسٹس صمدانی نے انصاف کی فراہمی کو ایک دیانت دار شخصیت کے طور پر اپنا فرض جانا۔
جسٹس صمدانی سے ملنے والے بتاتے ہیں کہ جب لندن میں ــــ نامور شاعرہ محترمہ پروین شاکر نے صمدانی مرحوم سے دریافت کیا۔
"ایک معمولی سا سمجھوتا موجودہ خزاں رسیدہ زندگی کو موسمِ بہار میں بدل سکتا تھا۔ آپ نے کیوں نہ کیا؟"
تو جسٹس صمدانی مسکرائے اور کہا۔
"دیکھو بی بی! پچھتاوا ہمیشہ غلط فیصلوں پر ہوتا ہے صحیح وقت پر کیا گیا صحیح فیصلہ اس بات سے بے نیاز ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ اور قیمت کیا ہوگی۔ میں نے جو کچھ کہا اور کیا، وہ میرے دل و ضمیر کی آواز تھی اور جب تک اس آواز کی بازگشت میری روح میں زندہ اور موجود ہے مجھے کوئی مشکل یا تکلیف نہ دکھائی دیتی ہے نہ محسوس ہوتی ہے اور تمہارا ہی تو شعر ہے۔

سر اپنا ہے اور آبرو نسلوں کی کمائی
سر کون بچاتا پھرے دستار کے آگے

پروین شاکر قائل ہو کر چپ ہو گئیں۔

رومانیت،

داغستان کے ایک طالب علم سے اس کے ممتحن نے سوال کیا۔
"حقیقت نگاری اور رومانویت میں کیا فرق ہوتا ہے؟"
طالب علم کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔
"عقاب کو عقاب کہنا حقیقت نگاری ہے اور کسی مرغ کو عقاب کہنا رومانویت ہے!"
ممتحن ہنس پڑا اور طالب علم کو کامیاب قرار دیا۔

اہل کراچی،

ظلمتوں کو جو روشنی سمجھیں
ان دماغوں سے خوف آتا ہے
آگ جن سے گھروں میں لگ جائے
ان چراغوں سے خوف آتا ہے
(اعجاز رحمانی)

کچھ باتیں پھولوں جیسی،

☆ جب تک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

- کی صداقت پر اعتماد نہ ہو، ہم توحید کی تصدیق نہیں کر سکتے۔
- روح کی گہرائی سے نکلی ہوئی بات روح کی گہرائی تک ضرور جاتی ہے۔
- ماننے کے بعد تحقیق گمراہ کر دیتی ہے۔
- ہم لوگ فرعون کی زندگی چاہتے ہیں اور موسیٰ کی عاقبت۔
- سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے اور اُسے متاثر کرنے کی خواہش ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے نہ خوش۔
- لطیف روحیں مجلس میں لطافت پیدا کرتی ہیں اور کثیف روحیں کثافت۔
- محمد بن حسین علی فرماتے ہیں کہ جتنا تکبر انسان کے دل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اتنی ہی عقل اس سے نکل جاتی ہے۔ اگر تھوڑا ہو تو تھوڑی اور زیادہ ہو تو زیادہ۔

(واصف علی واصف)

رضوانہ مشہود۔ کراچی

کوسنے،

کوسنے ہر زبان کا ایک ذائقہ ہوتے ہیں۔ اس کا اپنا ہی ایک رنگ ہوتا ہے۔ داغستان کے نامور ادیب رسول حمزہ توف نے اس پر کام کرنے کے لیے ایک بزرگ خاتون کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا۔

"میں ایک نظم لکھ رہا ہوں جس میں مجھے کچھ سخت قسم کے کوسنے بھی نظم کرنے ہیں۔ یہی سیکھنے کے لیے میں نے یہاں تک کا سفر کیا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ عورت بھڑک اٹھی اور بولی۔

"خدا کرے تیری زبان میں کیڑے پڑ جائیں۔ تیری چہیتی کو تیرا نام بھی یاد نہ رہے۔ تیرے کاروباری ساتھی تیری بات تک نہ سمجھ پائیں۔ خدا کرے تو جب سفر سے لوٹ کر گھر پہنچے تو گاؤں والوں کو سلام کرنا بھی بھول جائے۔ خدا کرے کہ تیرے پوپلے منہ میں ہوائیں اس طرح گھسیں کہ سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ بیمار کے بچے! میں کس طرح ہنس سکتی ہوں جب میرا دل خوش نہ ہو؟ اگر گھر میں مردہ نہ پڑا ہو تو رونے سے کیا فائدہ؟ جب کسی نے نہ میرا قصور کیا ہے نہ میری بے عزتی کی ہے تو محض تجھے سنانے کے لیے میں کیوں اپنی زبان خراب کروں، دور ہو جا۔ اس قسم کی واہیات فرمائش کے ساتھ یہاں کبھی آنے کی ہمت نہ کرنا۔"

"شکریہ مہربان خاتون۔" یہ کہتے ہوئے رسول حمزہ توف وہاں سے نکل آیا۔

لوٹتے وقت وہ سوچتا رہا کہ جب وہ خاتون کسی غصے اور اشتعال کے بغیر مجھ پر اتنے سخت کوسنوں کی بوچھاڑ کر سکتی ہے تو وہ اگر واقعی مشتعل ہو جاتی تو میرا کیا حال کر ڈالتی!

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

تحریر شناس،

ایک خاتون تحریر شناس کی حیثیت سے بڑی معروف تھیں۔ وہ خواتین کے ایک مقبول ماہنامے میں "تحریر شناس" کے عنوان سے کالم بھی لکھتی تھیں جس کے سلسلے میں انہوں نے خواتین کو دعوت عام دے رکھی تھی کہ وہ انہیں کسی بھی شخصیت کی تحریر کا نمونہ ارسال کریں تو وہ اس کی عادات خصائل، مزاج اور کردار وغیرہ کے متعلق بہت سی صحیح اور مفید باتیں بتا سکتی ہیں۔ خواتین بہت ذوق و شوق سے انہیں تحریروں کے نمونے ارسال کرتی تھیں۔

ایک خاتون نے تحریر کا ایک نمونہ انہیں بھیجتے ہوئے لکھا۔

"یہ ان صاحب کی تحریر کا نمونہ ہے، جن سے میں بہت محبت کرتی ہوں۔ براہ مہربانی اس تحریر کا بہت توجہ سے تجزیہ کر کے بتائیے کہ موصوف ایک اچھے شوہر ثابت ہو سکیں گے یا نہیں؟"

خاتون تحریر شناس نے انہیں کالم میں جواب دینے کے بجائے براہ راست جواب ارسال کرتے ہوئے کہا۔

"محترمہ! اس تحریر کا تجزیہ کرنے کے لیے مجھے زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس تحریر کا حامل شخص گزشتہ تین سال سے میرے لیے تو اچھا شوہر ثابت نہیں ہو سکا۔ اچھا ہوا جو آپ نے قسمت آزمائی سے پہلے اس کی تحریر کا نمونہ مجھے ارسال کر دیا۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

نظم،

سنو پیارے!
میری آنکھیں خریدو گے؟
مجھے ایک خواب کا تاوان بھرنا ہے

نوال افضل گھمن۔ گجرات

کتبہ،

انگریز شاعر جان ڈرائیڈن کی بیوی بہت چڑچڑی اور بد مزاج تھی۔ جب وہ مری تو ڈرائیڈن نے اس کی قبر پر کتبہ لکھوایا جس پر لکھا تھا۔

یہاں میری بیوی لیٹی ہوئی ہے۔
اسے یہیں لیٹا رہنے دو۔
اب یہ آرام سے ہے۔
اور میں بھی آرام سے ہوں۔

ندا، فضہ۔ کراچی

انسان،

- انسان بھی کیا عجیب چیز ہے۔ پہلے دولت پانے کے لیے صحت گنوا دیتا ہے پھر صحت کے لیے دولت کھو دیتا ہے۔
- ماضی میں رہ کر مستقبل کو سوچتا رہتا ہے اور مستقبل میں جا کر ماضی کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا ہے۔
- جیتا ایسے ہے جیسے کبھی مرے گا ہی نہیں اور مر ایسے جاتا ہے جیسے کبھی جیا ہی نہیں تھا۔

سادیہ چوہدری۔ ڈوگہ گجرات

قانون،

یونانی قانون دان سولن کا قول ہے۔

"قانون مکڑی کا جالا ہے جو ننھے کیڑوں اور پتنگوں کو پکڑ لیتا ہے لیکن بڑے بڑے کیڑے اور بھونرے اسے توڑ کر صاف نکل جاتے ہیں۔"

وقت کا احساس،

ایک صاحب دفتر سے چھٹی لے کر نکلے تو ایک پرانے دوست سے ملاقات ہو گئی۔ چائے پینے وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے اور باتوں میں ایسے منہمک ہوئے کہ وقت گزرنے کا خیال ہی نہ رہا۔

رات دس بجے جب موصوف گھر پہنچے تو بیوی کھانے کی میز پر بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ وہ صاحب کھانے کی بات ٹالتے ہوئے بستر پر جا کر سو گئے۔

رات ساڑھے تین بجے الارم کی آواز سے پھر ان صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ جب انہوں نے گھڑی دیکھی تو غصے میں آپے سے باہر ہو گئے اور بیوی کو جھنجوڑ کر پوچھا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟"

"ہوں۔" بیوی نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے سوچا کہ دفتر سے گھر آنے میں آپ کو پانچ گھنٹے لگ سکتے ہیں تو گھر سے دفتر جانے میں بھی اتنا ہی وقت لگے گا۔ اس لیے میں نے ساڑھے تین بجے کا الارم لگا دیا کہ آپ وقت پر دفتر پہنچ جائیں۔"

عائشہ۔ گوجرہ

قیمتی موتی،

- اگر تم ہنستے ہو تو تمام دنیا تمہارے ساتھ ہنسے گی لیکن اگر تم روتے ہو تو اکیلے رو گے۔
(بیکن)
- بھیڑ اور بھیڑیا اس حالت میں اکٹھے رہ سکتے ہیں، جب بھیڑ، بھیڑیے کے پیٹ میں سما جائے۔
(انگرسول)
- ہم اندھیرے سے ڈرنے والے بچے کو آسانی سے درگزر کر سکتے ہیں لیکن زندگی کا حقیقی المیہ یہ ہے کہ لوگ روشنی سے ڈرتے ہیں۔
(ایمل کرونکی)
- خود کو سنبھالنے کے لیے دماغ استعمال کریں اور دوسروں سے پیش آنے کے لیے دل۔

(آئزک ڈینسن)

◉ دوستی اور چاٹنے کی خوبی ان کی حدت اور تیزی ہے نہ کہ بہت زیادہ مٹھاس۔

(ایمل کرونکی)

ادم کمال۔ فیصل آباد

دل سے نکلے کچھ لفظ،

- اپنے اردگرد اچھے اعمال کے خوبصورت چراغ جلاؤ تاکہ موت کے راستے سے گزرتے وقت تمہیں تاریکی کا احساس نہ ہو۔
- تمہاری ہر خواہش تمہاری شخصیت کی کھیتی سے اُگتی ہے۔ تم اپنی جھولی پھولوں سے بھی بھر سکتے ہو اور کانٹوں سے بھی۔ اپنی خواہش کی کھیتی کو پودے خلوص سے بوؤ۔ اور دل کے موسم کو تبدیل نہ ہونے دو۔
- اگر تم کسی کو گدھا کہتے ہو تو وہ تمہیں گھوڑا کبھی نہیں کہے گا۔
- اگر تمہیں زیورات کا شوق ہے تو کان میں سوراخ تو ہو گا۔
- غم کتنا ہی بڑا۔۔ کیوں نہ ہو مگر نیند سے پہلے تک ہے۔
- فیصلہ چھوٹا ہو یا بڑا اس میں غلطی کا امکان گھاس کی اس نرم کونپل کی طرح ہوتا ہے جو کسی بھی جگہ کسی بھی لمحے سر اٹھائے چپ چاپ لہرانے لگتی ہے۔
- نقصان وہ نہیں، جو آپ کو ذاتی دکھ سے بٹھا دے نقصان تو وہ ہے جو آپ کو کسی کی نظروں سے گرا دے۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

مذاہب،

دُنیا کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں خانہ بدوشانہ زندگی سے لے کر شہروں کی آبادیوں تک انسانیت اور انسانی اصولوں کا درس صرف اور صرف مذاہب اور خدا کی طرف سے بھیجے گئے پیغمبروں نے دیا۔ سچ بولو، پورا تولو، قتل نہ کرو، بھوکے کو کھانا کھلاؤ، یتیم کی دیکھ بھال کرو، پڑوسی کا خیال رکھو، غیبت نہ کرو، دھوکا مت دو، جانوروں پر ترس کھاؤ، درختوں کی حفاظت کرو، یہ سب اصول اگر انسانی تاریخ میں کہیں ملتے ہیں تو آسمانی کتابوں میں۔

(اوریا مقبول جان)

نادیہ، توزیہ۔ فیصل آباد

پشتو کہاوتیں،

- ○ چور کی قسمت جاگے تو کتا سو جاتا ہے۔
- ○ ہارے ہوئے کی بھی اپنی دلیل ہوتی ہے۔
- ○ اُدھار دیا۔ ہاتھ سے گیا۔
- ○ پرائے گھر پر سو مہمان ہوں تو کیا۔
- ○ شلوار اگر بیل کے بھاؤ بھی ملے تو لینی ہو گی۔

عظمٰی غلام نبی۔ کراچی

صحبت،

ایک محترم پوپ جیل کے معائنے کے لیے گئے۔ انہوں نے تمام قیدیوں سے ان کا جرم پوچھا۔ قیدیوں نے جرم سے انکار کیا اور کہا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ انہیں غلط سزا دی گئی ہے۔ صرف ایک قیدی نے یہ اعتراف کیا کہ وہ مجرم ہے۔

پوپ نے فوراً حکام سے کہا۔ "اسے فوراً رہا کیا جائے ورنہ اس کی صحبت تمام پارساؤں کو بگاڑ دے گی۔"

کرن۔ کراچی

درندے،

ہے آدم سے کوئی نسبت نہ یہ بندے خدا کے ہیں
جو کھیلیں خون کی ہولی، وہ سب کے سب درندے ہیں
کسی کی لاش سڑکوں پر، کبھی ملتی ہے۔ بوری میں
کہیں قاتل نہیں ملتے سب ہی آزاد پھرتے ہیں

رضوانہ مشہود۔ کراچی

خالدہ جیلانی

مدیحہ گوہر ۔۔۔۔ چکوال

تمہیں بخشی ہے دل پر حکمرانی، اور کیا دیتے
یہی تھی بس ہماری راجدھانی، اور کیا دیتے
بچھڑتے وقت اس کو اک نہ اک تحفہ تو دینا تھا
ہمارے پاس تھا آنکھوں میں پانی اور کیا دیتے

حنا سلیم ۔۔۔۔ گاؤں آخون باندی

غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی مانند
بچھڑ کے اس نے طبیعت اداس کر دی ہے
وہ عمر جس میں ہمیں خود سے ملنا۔۔ تھا
وہ عمر صرف تیری جستجو میں کر دی ہے

علمہ شمشاد حسین ۔۔۔۔ کراچی

میری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کچھ نیا نہیں
کبھی تیرگی، کبھی روشنی، نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا
میرے ایک گوشۂ فکر میں میری جاں سے بھی عزیز تر
میرا ایک ایسا دوست ہے، جو کبھی نہ مجھ سے جدا ہوا

ادم کمال ۔۔۔۔ فیصل آباد

ملنا تمہارا مجھ سے محض حادثہ نہ تھا
یہ کارنامہ دل کا کرشمہ دعا کا تھا
ہم مبتلائے عشق تھے ہرگز نہ کہہ سکے
خاموش ہی رہے کہ تقاضا حیا کا تھا

حرمت ردا اکرم ۔۔۔۔ ڈلوال

میری آنکھوں میں سورج پگھلتا رہا چاند جلتا رہا
تیری یادوں کا سورج نکلتا رہا، چاند جلتا رہا
یہ دسمبر کہ جس میں کڑی دھوپ بھی میٹھی لگنے لگی
تم نہیں تو دسمبر سلگتا رہا چاند جلتا رہا

ندا، فضہ ۔۔۔۔ فیصل آباد

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آمنہ اُجالا ۔۔۔۔ ڈہرکی

لوٹ کچھ ایسی مچی تھی دن دہاڑے شہر میں
کل پیمبروں سے بھی سانسوں کے پٹارے چھن گئے
لٹ گئے بازار میں میرے بھی سب پتھر کے چاند
اس کے ہاتھوں سے بھی مٹی کے ستارے چھن گئے

امبر گل ۔۔۔۔ جھڈو (سندھ)

رات تھی یوں کہ جیسے جنگل کا سفر
چونک اٹھے جو دیکھی سحر سامنے
ہم ہیں ماجد سلگتے دیے رات کے
بجھ گئے بھی تو ہو گی سحر سامنے

ثمینہ عطاری ۔۔۔۔ ڈوگہ گجرات

اُن سے کہنا کہ ہم مزے میں ہیں
بس اُس کی یادیں بہت ستاتی ہیں
ان کی دوری کا غم نہیں ہے
بس ذرا پلکیں بھیگ جاتی ہیں

نمرہ، اقرأ ۔۔۔۔ کراچی

ورق ورق پہ تیری حقیقت، تیرا فسانہ، تیری ہی قربت
کتابِ ہستی جہاں سے کھولی تیری ہی یادوں کا باب نکلا

سحر خان ۔۔۔۔ کوئٹہ

رکھ اپنے پاس اپنے مہر و ماہ اے فلک
ہم خود کسی کی آنکھ کے تارے ہیں ان دنوں
دستِ سحر نے مانگ نکالی ہے بارہا
اور شب نے آکے بال سنوارے ہیں ان دنوں

ثمرین اکرم ۔۔۔۔ میرپور خاص

بچپن کی وہ امیری نہ جانے کہاں کھو گئی دوست
جب بارش کے پانی میں ہمارے بھی جہاز چلا کرتے تھے

صائمہ جبیں ۔۔۔۔ کے ڈی اے

زہر آلود سہی لب پہ تبسم تو سجا
کچھ بچھڑنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں

ارم کمال ________ فیصل آباد

میری نیم جاں انا تھی میری کج ادا کے پیچھے
تجھے بھول کیوں نہ جاتے، اگر اختیار ہوتا
کبھی رائیگاں نہ جاتی شب وصل اس طرح تو
مجھے اختیار ہوتا، تجھے اعتبار ہوتا

سیّدہ ثوبیہ سجاد ________ کہروڑ پکا

اُترا تھا لمحہ بھر کوئی دکھ شعور میں
بولے، چلے نہ روئے پر اعصاب تھک گئے

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات

کچھ اس طرح سے وفا کی مثال دیتا ہوں
سوال کرتا ہے کوئی تو ٹال دیتا ہوں
اُسی سے کھاتا ہوں اکثر فریب منزل کا
میں جس کے پاؤں کا کانٹا نکال دیتا ہوں

شگفتہ مصباح ________ کلووالی میانوالی

دِلوں کا کھیل جو کھیلو تو بھول مت جانا
کہ کھیل کھیل میں اکثر کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں

اقراء عروج ________ فتح پور

میرے قرب سے میرے وجود تک اسے اختلاف تو سدا کا تھا
میرے کم سے میرے جنون تک یہ فاصلہ بس انا کا تھا

زینب احسن ________ منصورہ آباد فیصل آباد

پانی سستا ہے تو پھر اس کا تحفظ کیسا
خون مہنگا ہے تو پھر شہر میں بہتا کیوں ہے

آسیہ جاوید ________ علی پور چٹھہ

بوجھل نظر آتی ہیں، بظاہر مجھے لیکن
کھلتی ہیں بہت دل میں اُتر کر میری آنکھیں
اب تک میری یادوں سے مٹائے نہیں مٹتا
بھیگی ہوئی اک شام کا منظر تیری آنکھیں

آنسہ شبیر عطاریہ ________ ڈوگہ

کبھی فقیر کبھی بادشاہ ہونا تھا
محبتوں میں ہمیں یوں تباہ ہونا تھا
براجمان تھے دونوں بلندیوں پر تو پھر
سوچ کیسے ہمارا نباہ ہونا تھا

فریحہ شبیر ________ شاہ نکڈر

جنونِ محبت یہاں تک تو پہنچا
کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں

افشاں ناز ________ سیالکوٹ

تمہیں غیروں سے کب فرصت، کب اپنے غم سے ہم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی، نہ ہم خالی

نوال افضل گھمن ________ گجرات

بڑی بے اماں ہے زندگی اُسے بن کے کوئی پناہ ملے
کوئی چاند کہ میری شام پر، میری شب کو مہکا گلاب کر
کوئی بدگماں سا وقت ہے کوئی بد مزاج سی دھوپ ہے
کسی سایہ دار سے لفظ کو میرے جلتے دل کا حجاب کر

امبر گل ________ جھنڈو

وہ جو دعوے دار ہے شہر میں کہ سب ہی کا نبض شناس ہے
کبھی آ کے مجھ سے تو پوچھتا کہ میں کس کے غم میں اداس ہوں
کسی اور کی آنکھ سے دیکھ کر مجھے ایسے ایسے لقب نہ دے
ترا اعتبار ہوں جانِ من، نہ گماں ہوں، نہ قیاس ہوں

مدیحہ نورین ________ برنالی

ایک تعلق کو بکھرنے سے بچانے کے لیے
میرے دن رات گزر جاتے ہیں اداکاری میں

نمرہ، اقرا ________ کراچی

ظلم یہ کہ مسلسل تیری بیگانہ روی
لطف یہ کہ میں پھر بھی تجھے اپنا سمجھوں

شاہدہ ظفر ________ گاؤں ڈیرہ مستی

ہر کسی کے ہاتھ بک جانے کو تیار نہیں
یہ میرا دل ہے تیرے شہر کا اخبار نہیں

ساجدہ جاوید ________ ہارون آباد

کوچۂ عشق میں اک عمر پھرے خاک بسر
تب کہیں جاکے ہم اس آنکھ میں تصویر ہوئے

سبین اکبر ________ بورے والا

کل رات میں نے اپنے سارے غم کمرے کی دیواروں پر رکھ ڈالے
رات بھر میں سوتا رہا اور دیواریں روتی رہیں

عالیہ بتول ________ حویلی بہادر شاہ

جس دن کتاب عشق کی تکمیل ہو گی
رکھ دیں گے زندگی تیرا بستہ اتار کر

سلمیٰ فیصل ________ فتح جنگ

بے تحاشا محبتوں کے امین
بے وجہ چھوڑ بھی تو جاتے ہیں

ماریہ سیّد واجد علی — کی ڈائری سے

ایک عورت کے دل کی مسند پر جب کوئی شخص براجمان ہوتا ہے تو وہ اپنا آپ بھول جاتی ہے۔ اپنے محبوب کو ساتویں آسمان پر بٹھانے والی خود اس کے قدموں کی خاک بن جاتی ہے۔ پروین شاکر کی یہ غزل اسی احساس کی ترجمانی کرتی ہے۔

نظر جب اُس سے ملتی تھی
میں خود کو بھول جاتی تھی

بس اک دھڑکن دھڑکتی تھی
میں دل کو بھول جاتی تھی

اُسے ملنے سے پہلے میں بہت سجتی سنورتی تھی
مگر جب وہ سنورتا تھا میں خود کو بھول جاتی تھی

میں اکثر ہی یہ کہتی تھی، میں تم سے پیار کرتی ہوں
مگر جب وہ یہ کہتا تھا میں دنیا بھول جاتی تھی

اقصیٰ مریم — کی ڈائری سے

زندگی کے رنگ عجیب ہیں۔ یہ رنگ سکھ بھی ہیں دکھ بھی، خوشی بھی غمی بھی، آس نراس کا بندھن بھی، میل ملاپ کا آنچل بھی، عشق کا پیالہ بھی اور سپنوں کا گھروندہ بھی۔ نصیر ترابی کی یہ غزل دیکھیں۔

زندگی خاک نہ تھی، خاک اُڑاتے گزری
تجھ سے کیا کہتے تیرے پاس جو آتے گزری

دن جو گزرا تو کسی یاد کی رو میں گزرا
شام آئی تو کوئی خواب دکھاتے گزری

اچھے وقتوں کی تمنا میں رہی عمرِ رواں
وقت ایسا تھا کہ بس ناز اُٹھاتے گزری

رات کیا آئی کہ تنہائی کی سرگوشی میں
ہُو کا عالم تھا مگر سنتے سناتے گزری

بارہا چونک سی جاتی ہے مسافت دل کی
کس کی آواز تھی یہ کس کو بلاتے گزری

زندگی جس کے مقدر میں ہو خوشیاں تیری
اُس کو آتا ہے نبھانا سو نبھاتے گزری

کہکشاں ارجمند — کی ڈائری سے

حمایت علی شاعر کی یہ مختصر نظم آج کے دور کے ہر انسان کا المیہ ہے جو رفتہ رفتہ بے چہرہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کا وجود موجود ہوتے ہوئے بھی عدم گرفتہ ہے۔

المیہ

مجھ کو محسوس ہو رہا ہے یوں
اپنی صورت میں ہوں نہ دنیا میں
زنگ آلود آئینے میں ہوں

آمنہ اُجالا کی ڈائری سے

جب دُکھوں کی تحریر دل میں رقم ہو جائے تو پھر ہر سو دُکھ ہی دکھائی دیتا ہے۔ میری ڈائری میں تحریر یہ نظم آپ سب کی نذر۔

ہمیں خبر ہے تمام دُکھ ہے
یہ شام دُکھ ہے
کہ اس کے شہر میں کئی دنوں سے
مسافرانِ ابد کا ایسے فراق آثار راستوں پر
سفر تو خیر ایک المیہ ہے
قیام دُکھ ہے
ہمیں خبر ہے
تمام دُکھ ہے
یہ آس دُکھ ہے

نراس دُکھ ہے
اداسیوں کا لباس دُکھ ہے
یہ تشنگی جو عذاب بن کر ٹھہر گئی ہے
بدن کے بوسیدہ ساحلوں پر
تو اس کا عہدِ دوام دُکھ ہے
یہ شور کرتی ہوا کا سارا خرام دُکھ ہے

صائمہ ناز کی ڈائری سے

اس کائنات کی ساری خوبصورتی انسان کے دل سے ہے۔ جب یہ دل ٹوٹتا ہے تو اس کائنات کے سب رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ انسان اپنی ذات کی نفی برداشت نہیں کر پاتا۔ مجھے مظہر بخاری کے مجموعہ کلام "دشتِ بے کنار" کے یہ اشعار جو میری ڈائری میں تحریر ہیں، بہت اچھے لگتے ہیں۔

ہماری ذات سے انکار کر کے
ہمیں چاہا گیا مسمار کر کے

اُسے یہ زعم سر کر لے گا آخر
ہمیں دیکھا نظر کا وار کر کے

محبت ایک لاحاصل سفر ہے
ملے گا کیا تجھے تکرار کر کے

ابھی دُنیا میں کتنی راہ میں ہیں
کبھی دیکھو سمندر پار کر کے

بڑی راحت ملے گی یار مظہر
کبھی خود سے بھی دیکھو پیار کر کے

اقصیٰ مریم کی ڈائری سے

کبھی کبھی جب کسی مظلوم قیدی کی سزا حد سے بڑھ جائے تو وہ پھر اس طرح پکارتا ہے جیسے محسن نقوی نے انتہائی عمدہ انداز میں لکھا۔ آپ بھی پڑھیں۔

قصّے میری الفت کے جو مرقوم ہیں سارے
آ دیکھ تیرے نام سے موسوم ہیں سارے

بس اس لیے ہر کام ادھورا ہی پڑا ہے
خادم بھی میری قوم کے مخدوم ہیں سارے

اب کون میرے پاؤں کی زنجیر کو کھولے
حاکم میری بستی کے بھی محکوم ہیں سارے

شاید یہ ظرف ہے جو خاموش ہوں اب تک
ورنہ تو تیرے عیب بھی معلوم ہیں سارے

سب جرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن
کیا میرے سوا شہر میں معصوم ہیں سارے
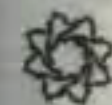
روشن حرف وہ سارے

سیدہ لوبا سجاد

سیدہ لوبا سجاد... کہروڑپکا

1۔ شعر کے بجائے اشعار کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ مگر پھر بھی ایک شعر جو ہم اکثر بے اختیار پڑھتے ہیں وہ ہے۔

ملیں گی ہم کو ہمارے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

ناصر کاظمی کے یہ چند اشعار ان سے تعارف کا باعث بنے۔

دل تو اپنا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے؟

☼ ☼ ☼
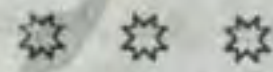
یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی

☼ ☼ ☼
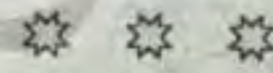
آج بے سبب اداس ہے دل
عشق ہوتا تو کوئی بات بھی تھی

3۔ ایسی قسمت کہاں کہ کوئی ہم پر شعر کہے۔ ایک بار میٹرک میں فرینڈ نے کہا تھا۔

قیامت خیز ہیں آنکھیں تمہاری
تم آخر خواب کس کے دیکھتے ہو؟

زندگی کا پہلا اور آخری موقع تھا یہ۔

4۔ غزل تو معلوم نہیں کس کی تھی، لیکن پسند بہت آئی۔ مگر اس کی بھی صرف چند لائنیں یاد ہیں، مگر شکیلہ خراسانی نے گائیکی کا حق ادا کر دیا۔

تیرے قریب آ کے بڑی الجھنوں میں ہوں
میں دشمنوں میں ہوں کہ تیرے دوستوں میں ہوں

مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
میں سنگِ راہ ہوں تو سب ہی راستوں میں ہوں

بدلا نہ میرے بعد بھی موضوعِ گفتگو
میں جا چکا ہوں، پھر بھی تیری محفلوں میں ہوں

مجھ سے بچھڑ کے روئے گا تو بھی تمام عمر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تیری خواہشوں میں ہوں

5۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

تو جناب کلاسیکی شاعری میں ہمارا انتخاب مرزا اسد اللہ خان غالب کی خوب صورت سی غزل۔

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
وہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے
اپنی رسوائی میں کیا چلتی سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

☼

خبریں و بریں

تبصیر نشاط

بھتہ

بزرگوں سے سنا ہے کہ چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ مگر جناب! یہ نیا دور ہے۔ سو اس دور کے تقاضے بھی نئے ہیں اور محاورے و ضرب الامثال بھی۔ لہٰذا اب ہمارا کہنا ہے کہ (آج کہیں گے تو کل کو محاوروں والے بزرگوں میں شامل ہوں گے نا) اداکارہ اداکاری سے جائے' پر بیان بازی سے نہ جائے۔

ابھرتی ہوئی اداکارہ سجل علی معروف اداکاراؤں کی صف میں شامل ہوا ہی چاہتی ہیں۔ اس صف میں شامل ہونے کے لیے انہوں نے سو سو جتن کیے ہیں۔ تب کہیں اس مقام تک پہنچی ہیں۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے سجل علی نے اداکاری پر تو شاید اتنی محنت نہ کی ہو۔ جتنی دوسرے ہتھکنڈوں پر کی ہے۔ انہیں سُن گُن ملی کہ جاوید شیخ اپنے بیٹے شہزاد شیخ کو ہیرو لے کر ایک فلم بنانا چاہتے ہیں اور فلم کی ہیروئن تلاش کر رہے ہیں۔۔۔ تو سجل علی شہزاد شیخ کی شادی میں جا پہنچیں اور وہاں اپنے رقص کے ٹیلنٹ کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ تاکہ ثابت کر سکیں کہ وہ ایک فلمی ہیروئن بننے کی پوری طرح اہل ہیں۔ یہی نہیں' بلکہ دولہا شہزاد شیخ کو ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ رقص میں شامل کیا کہ جاوید شیخ یہ بھی جانچ لیں' وہ شہزاد کے ساتھ کیسی لگتی ہیں۔ تاہم یہ سب کرنے پر بھی سجل علی کو فلم نہ مل سکی۔ کیونکہ فلم تاحال صرف اعلان ہی تک محدود ہے۔ چنانچہ سجل علی کو زیادہ معروف ہونے کے ایک اور حربے کا خیال آیا۔ وہی حربہ جو ان کی سینئر اکثر اپناتی ہیں یعنی بیان بازی۔ سجل علی نے ایک وکھری ٹائپ کا بیان داغا ہے کہ انہیں کراچی مافیا کی طرف سے بھتے کی پرچی موصول ہوئی ہے۔

سجل کا کہنا ہے کہ بھتہ خوروں نے ان سے ساڑھے چار لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔ (ایں' بھتہ خوروں کو نہیں معلوم کہ سجل نے تو ابھی "ساڑھے چار سیریلز" میں بھی کام نہیں کیا ہے تو وہ ان کو اتنی رقم کیسے دے سکتی ہیں۔) سجل کے مطابق مطلوبہ رقم سے ہاتھ نہ دھونے کی صورت میں انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

واضح رہے کہ بھتہ خور سجل سے قبل بھی اکثر فنکاروں سے ایسے مطالبات کرتے رہے ہیں۔ تاہم فنکار ان معاملات کو میڈیا کے سامنے نہیں لاتے۔ (کیونکہ وہ جانتے ہیں تاکہ اس سے بھتہ خوروں سے نجات تو پھر بھی نہیں ملے گی۔ الٹا انکم ٹیکس والے ہی پیچھے پڑ جائیں گے اور اپنی جیبیں گرم کریں گے کہ یہ بھتہ خور انکم ٹیکس والوں کے لیے دوسروں کی آمدنی جانچنے کے پیمانے کا کام کرتے ہیں۔ بس سجل جی! اب تو آپ گئیں کہ ایک طرف درندہ ہے' ایک طرف شکاری ہے۔۔۔ بھتہ خوروں کی جیب تو گرم کرنا ہی کرنا ہے۔ اب انکم ٹیکس والوں کی بھی کیجیے۔)

دو نمبر

"دُھن رہا ہے نا تُو، مر رہا ہوں میں"

آج کل پڑوسی ملک کے اس نغمے کی دھوم ہمارے ملک تک بھی آ پہنچی ہے۔ یہ وہاں کی حالیہ فلم "عاشقی 2" کا مشہور ترین گانا ہے' جو فلم کے ہیرو پر پکچرائز کیا گیا ہے۔ مگر جناب! یہ گانا صرف اس فلم کے ہیرو کے جذبات کی ترجمانی ہی نہیں کرتا۔ بلکہ ہمارے خوبرو ہیرو عمران عباس کے دلی جذبات کی ترجمانی بھی کرتا ہے کہ سنا ہے عمران عباس اس فلم میں کام کرنے کے شدید خواہش مند تھے۔ مگر ہمارے پڑوسی ایسے پڑوسی ہیں' جو پڑوسیوں کے حقوق کا بالکل بھی خیال نہیں کرتے۔ وہ اکثر ہمارے ٹیلنٹ پر ڈاکا بھی ڈالتے ہیں اور شب خون بھی مارتے ہیں۔ مگر ان پروجیکٹس کے لیے کہ جو وہاں نمبر دو پروجیکٹس ہوں۔ جبکہ "عاشقی 2" نام کے لحاظ سے تو نمبر دو ہے۔ تاہم مذکورہ فلم کے کرتا دھرتا جانتے تھے کہ یہ فلم پروجیکٹ کے لحاظ سے نمبر دو ہرگز نہیں ہے۔ لہٰذا سے ہٹ ہی ہونا ہے۔ تو جناب! وہ کسی پاکستانی فنکار کو کوئی ایسا پروجیکٹ کیسے دے سکتے تھے۔ خواہ وہ کتنا ہی باصلاحیت' کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اور خواہ ان کے لیجنڈ دلیپ کمار اس کے مداح ہی کیوں نہ ہوں۔ سو عمران عباس اس پروجیکٹ سے محروم ہی رہے۔

تاہم اب خبر آئی ہے کہ عمران عباس ان دنوں بھارت میں مقیم ہیں اور وہ ایک فلم میں کام کر رہے ہیں۔ ان کی ہیروئن بپاشا باسو ہیں۔ (جنہیں اب ان کے بہترین دوست جان ابراہام بھی نہیں پوچھتے۔)

قدردان

ہمارے فنکاروں سے اگر کوئی پوچھے کہ "فن کی معراج کیا ہے۔" تو وہ جھٹ کہیں گے۔ "پڑوسی ملک کی فلموں میں کام کرنا" چنانچہ ہمارے اکثر فنکار فن کی معراج حاصل کرنے کے لیے "بھارت یاترا" کرتے رہتے ہیں۔ بھارت بھی شاید ہمارے فنکاروں کی اس کمزوری سے بخوبی واقف ہے۔ سو وہ اس کا خوب خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور ہمارے اداکار اور اداکاراؤں کو یا تو دوسرے درجے کی فلموں میں کام دیتا ہے یا پھر محض آئٹم نمبر ہی پر ٹرخا دیتا ہے۔

معروف فنکارہ متیرا

فن اداکاری سے زیادہ اپنی اوٹ پٹانگ قابل اعتراض حرکتوں کی وجہ سے ہی پہچانی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں کی دوسرے درجے کی فنکارہ متیرا ابھی خیر سے بھارت میں کام کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہو گئی ہیں۔ متیرا نے وہاں ایک آئٹم سونگ پر اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ (یقیناً" وہ جوہر جو وہ پاکستان میں دکھانے میں ناکام ہو گئی ہوں گی) متیرا نے پاکستان ہی میں خاصا قابل اعتراض کام کیا ہے۔ شاید اسی لیے پڑوسیوں کا نظر انتخاب ٹھہری ہیں۔ ورنہ اگر فن کے قدر دان ہونے کا دعوا کرنے والا ملک واقعی فن کا قدر دان ہوتا تو اس کا انتخاب متیرا کے بجائے یقیناً" کوئی اور اداکارہ ہوتی۔)

آنکھوں دیکھی مکھی

کہتے ہیں کہ آنکھوں دیکھی مکھی کوئی نہیں نگلتا۔ مگر معروف اداکارہ زارا اکبر کا کیا جائے کہ انہوں نے دُور اُڑتی، ہوئی، مکھی پکڑی اور نگل لی۔ ہوا کچھ یوں کہ ڈھائی سال قبل زارا اکبر ایک شو کرنے دبئی گئیں۔ ان کے ہمراہ پروڈیوسر حاجی شفیق بھی تھے۔ وہاں حاجی شفیق کو ان کا ایک قرض خواہ ٹکرا گیا۔ اس نے حاجی شفیق کو دیکھا تو زارا اکبر کی موجودگی کا بھی کچھ خیال نہ کیا اور جھٹ اپنی رقم یعنی ساڑھے تین لاکھ روپے کا مطالبہ کر ڈالا۔ حاجی شفیق ٹال مٹول سے کام لینے لگے۔

اب یہ پتا نہیں کہ حاجی شفیق کو زارا اکبر کے سامنے ہونے والے اس تنازعے کی لاج آئی یا نہیں، اپنی زارا اکبر کو ضرور آگئی۔ انہوں نے مطلوبہ رقم جھٹ اپنی جیب سے ادا کر دی۔ قرض خواہ اپنی رقم لے کر چلا گیا اور یوں حاجی شفیق نے سکون کی سانس لی۔ مگر ان کے سکون کی اس سانس کا دورانیہ اتنا طویل ہو گیا کہ اب زارا اکبر کے سکون کی سانسیں رکنے لگی ہیں۔ کیونکہ ڈھائی سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی حاجی شفیق نے زارا کے پیسے ادا نہیں کیے ہیں۔ اب زارا اکبر نے اپنا معاملہ فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے تو ساڑھے تین لاکھ کی رقم نیکی میں ادا کی تھی۔ کیا خبر تھی کہ یہ نیکی ان کے گلے ہی پڑ جائے گی۔

(زارا جی! جب آپ نے دیکھ ہی لیا تھا کہ شفیق صاحب قرض لے کر بھول جانے والے کھلاڑی ہیں تو آپ نے ایسی نیکی کی ہی کیوں تھی۔۔۔ اور جب نیکی کر ہی ڈالی ہے تو اب اسے دریا میں بھی ڈال دیں۔ کہ کیا پتا وہ قرض خواہ ان پروڈیوسر کا ہی کوئی آدمی ہو اور اب وہ دونوں آدھی آدھی رقم سے موجیں بھی اڑا چکے ہوں۔)

کچھ اِدھر اُدھر سے

سعودی عرب نے بچوں کے غیر اسلامی نام رکھنے پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ملک میں ایسے نام رکھنے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے جن کے معنوں سے شرک اور بد اعتقادی ظاہر ہوتی ہو۔

(امت نیوز)

باصلاحیت فنکارہ

انوشے عباسی سے ملاقات

شاہین رشید

کہتے ہیں کہ فن کسی کو وراثت میں عطا نہیں ہوتا۔ تاہم اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ ایک باصلاحیت گھرانے کے چشم و چراغ بھی بے پناہ صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کا ایک مخصوص ماحول اور باصلاحیت والدین کے زیر تربیت ہونا ہے۔ انوشے عباسی کو اپنے والد زبیر عباسی اور پھوپھی سیما غزل سے تحریری اور تخلیقی صلاحیتیں تو نہ ملیں، لیکن سوتیلے بہن، بھائی شمعون عباسی اور جویریہ عباسی کی وجہ سے شوبز کی چکا چوند روشنیاں متاثر کر گئیں۔ یوں وہ آج ایک ابھرتی ہوئی اداکارہ کے طور پر ناظرین کی توجہ حاصل کیے ہوئے ہیں۔ آج ہم آپ کی ملاقات ان ہی انوشے عباسی سے کرا رہے ہیں۔

"کیسی ہو انوشے اور کیا مصروفیات ہیں؟"

"جی! اللہ کا شکر ہے۔ مصروفیات کے بارے میں تو آپ کو پتا ہی ہے کہ کیا ہوں گی۔ جب اس فیلڈ سے وابستہ ہیں تو پھر اس سے ریلیٹڈ مصروفیات ہی ہوں گی۔"

"ہوں۔۔۔ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ آج کل۔۔۔ "کالا جادو" اور "بھی" آن ایر ہے۔ کس میں اپنا

کردار اچھا لگ رہا ہے؟"
"مجھے تو دونوں میں ہی اپنے کردار اچھے لگ رہے ہیں۔ کیونکہ دونوں میں ہی میرے کردار بہت مختلف ہیں اور بہت اچھے بھی ہیں۔ مجھے ایسے ہی کردار کرنے میں مزا آتا ہے، جس میں کچھ پرفارمنس ہو۔"
"کچھ عرصہ تم غائب رہیں، کیا وجہ تھی؟"
"جی! بس آپ کو پتا ہی ہے کہ بابا (زبیر عباسی) کی ڈیتھ کے بعد میں کتنی اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ بالکل ایک طرف ہو کے بیٹھ گئی تھی۔ اب بھی جو آپ کو نظر آ رہی ہوں، وہ بھی سب کے کہنے پر، کہ اس طرح کیسے گزرے گی زندگی۔"
"بالکل ٹھیک کہا سب نے۔ جتنا زیادہ سوچو، اتنی ہی زیادہ یادیں تنگ کرتی ہیں۔ اب اچھا محسوس کرتی ہو؟"
"جی ہاں۔۔۔ جب سے دوبارہ کام پر آئی ہوں۔ اب ٹائم اچھا گزر جاتا ہے۔ یہ سب زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں جنہیں دل نہ بھی چاہے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔"
"ناظرین کون سا کردار زیادہ پسند کر رہے ہیں؟"
"دونوں ہی پسند کر رہے ہیں۔ لیکن "ننھی" والا زیادہ پسند کر رہے ہیں۔ کیونکہ آج کل جتنے بھی ڈرامے ہو رہے ہیں ان میں اس قسم کے رول نہیں ہوتے، تو ایک لحاظ سے یہ میرے لیے بھی چیلنجنگ رول تھا۔"
"کافی سینئر لوگ تھے تمہارے ساتھ؟"
"جی، جی بالکل۔ خود شہود علوی بھائی اتنے سینئر ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا رول کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ لیکن اداکاری تو اسی کو کہتے ہیں اور باقی لوگ بھی سب ہی سینئر تھے۔ اسماء عباس، جاوید شیخ صاحب، عذرا محی الدین وغیرہ وغیرہ۔۔۔ تو "ننھی" میں کام کرنے کا تجربہ بہت اچھا رہا۔"
"ننھی۔۔۔ میں تمہارا کردار نیگٹیو ہے۔ مزید نیگیٹو رول کرنے کا ارادہ ہے تمہارا؟"
"ہاں! کیوں نہیں، اگر اچھا، پاورفل ہوا تو پھر یقیناً کرتی رہوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ایسے رولز میں اداکاری کا مارجن زیادہ ہوتا ہے۔ فیڈبیک بھی بہت اچھا ملتا ہے اور خود کو بھی پرفارم کرنے میں مزا آتا ہے۔"
"مجھے یاد ہے کہ جب میں نے تمہارا پہلا انٹرویو کیا تھا تو تم نے کہا تھا کہ میں ایسے رول نہیں کروں گی کہ جس میں، میں کسی کا گھر اجاڑ رہی ہوں۔ تو "ننھی" میں کیا ہو رہا ہے؟"
قہقہہ۔۔۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نئی نئی تھی۔ پوزیٹیو کرداروں سے اپنی جگہ بنانا چاہتی تھی۔ اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی۔ لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ پوزیٹیو رول کا کوئی اتنا نوٹس نہیں لیتا۔ جتنا نیگٹیو رول کا۔۔۔ تو بس اسی لیے "ننھی" میں ایسا رول لیا۔"
"اور کس قسم کے رول کرنے کا موڈ ہے؟"
"ہر طرح کے۔۔۔ ایک بدتمیز لڑکی کا رول، جو کہ میں نے ایک سیریل میں کیا بھی ہے۔ بس اس طرح کے چیلنجنگ رول کرنا چاہتی ہوں۔"
"تم نے ڈراما سیریل "ٹوٹے ہوئے پر" سے شہرت پائی۔ لوگ "نمو" اور "جیہ" کے کرداروں کو نہیں بھولے۔ ابھی تک بازگشت ہوتی ہے "نمو" کے کردار کی؟"
"جی ہاں۔۔۔ ابھی بھی ہوتی ہے۔ میرا وہ پہلا کردار ہی اتنا زیادہ مشہور ہوا کہ لوگ ابھی تک اسی کو یاد کرتے تھے۔ (ہنستے ہوئے) وہ تھا بھی تو اتنا معصومانہ کردار۔۔۔ لوگ کہتے تھے کہ اس معصوم شکل پر ایسے ہی کردار اچھے لگتے ہیں۔"
"اور اب؟"
قہقہہ۔۔۔ "اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ اب میں ہر طرح کے رول کرنا چاہتی ہوں۔ کسی رول کی چھاپ نہیں لگوانا چاہتی۔"

"ہوں۔۔۔ گڈ۔ لوگ ملتے ہیں تو تعریف ہی ہوتی ہے یا تنقید بھی ہوتی ہے؟ اور تنقید کون کرتا ہے، اپنے یا پرائے؟"
"بھئی۔۔۔ دیکھیں! منہ پر تو سب تعریف ہی کرتے ہیں۔ خواہ وہ اپنے ہوں یا پرائے۔ اگر کوئی گھر سے باہر بھی ملتا ہے۔ جیسے ہم شاپنگ وغیرہ پر ہوں تو لوگ قریب آنے کے لیے بھی ایک دم سے تعریفیں شروع کر دیتے ہیں۔ "اوہو جی! آپ کو دیکھا تھا آپ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔" وغیرہ وغیرہ۔۔۔ ہاں! البتہ گھر والوں سے اور دوستوں سے تھوڑی تنقید سننے کو مل جاتی ہے کہ یہاں ایسے نہیں، ایسے کرنا تھا۔ یوں نہیں یوں کرنا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو تعریف کے ساتھ تنقید بھی کرے اور وہ بھی بامقصد۔۔۔ تو وہ ہی آپ کے سچے خیر خواہ ہوتے ہیں۔"
"تم اس فیلڈ میں آسانی سے آ گئیں کہ آنکھ کھولتے ہی شوبز کا اور ادبی ماحول دیکھا۔ کیا ایک عام لڑکی بھی آسانی سے اس فیلڈ میں اپنی جگہ بنا سکتی ہے؟"
"مشکل سوال کر دیا آپ نے۔ ایسا نہیں ہے کہ سب لوگ اس فیلڈ میں آنکھ کھولتے ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ سب لوگ سفارش سے ہی آتے ہوں۔ اس فیلڈ میں بے شمار لوگ ہیں۔ اب سب تو سفارش سے آنے سے رہے، اس فیلڈ میں ٹیلنٹ کی زیادہ حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، بہ نسبت سفارش کے۔ کیونکہ اس فیلڈ میں سارا کام ہی ٹیلنٹ کا ہے۔"
"جس گھرانے سے تمہارا تعلق ہے وہاں لکھاری بھی ہیں اور پرفارمر بھی۔ والد صاحب زبیر عباسی کا بڑا نام ہے۔ سیما غزل صاحبہ کا بڑا نام ہے۔ تو تمہارا رجحان ہے اس طرف؟"
"ارے! نہیں، بالکل بھی نہیں۔۔۔ میں تو اکثر بابا سے کہتی تھی کہ "بابا! آپ اتنا سب کچھ کیسے لکھ لیتے ہیں؟ میں تو دو لفظ نہ لکھ پاؤں۔" اللہ تعالیٰ نے مجھے

ورثے میں والد صاحب کی یہ خوبی عنایت نہیں کی۔ خیر جو عنایت کیا بہت کیا ہے۔ میں بہت شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ کی۔"
"اس فیلڈ میں کہاں تک جانے کا ارادہ ہے؟ کوئی فیوچر پلاننگ ہے تمہاری؟"
"نہیں، نہیں جی۔۔۔ میری ایسی کوئی فیوچر پلاننگ نہیں ہے۔ میں تو اس فیلڈ میں شوقیہ اداکاری کر رہی ہوں اور جب تک دل چاہے گا، کروں گی اور جب دل بھر جائے گا، چھوڑ دوں گی۔ میں اتنی کریزی نہیں ہوں کہ ہائے! یہ کرنا ہے اور بہت کرنا ہے، اس کو چھونا ہے، اس کو پکڑنا ہے وغیرہ۔۔۔"
"کیوں؟ یہ زندگی زیادہ مزے دار نہیں ہے کیا؟"
"نہیں، نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ زندگی تو ہوتی ہی مزے دار ہے۔ چاہے گھریلو ہو یا شوبز کی۔۔۔ ابھی تو میں اس فیلڈ کو انجوائے کر رہی ہوں اور لوگ بھی میری پرفارمنس کو پسند کر رہے ہیں۔ لیکن جہاں محسوس کروں گی کہ میں اچھا کام نہیں کر رہی یا لوگ مجھے پسند

نہیں کررہے تو میں اسے چھوڑ دوں گی یا پھر لمبا گیپ دوں گی۔"

"اپنے کردار کا مطالعہ کرتی ہو یا سب تیاری سیٹ پر ہی ہوتی ہے؟"

"بالکل مطالعہ کرتی ہوں۔ کیونکہ جب تک پڑھوں گی نہیں تو کردار کو سمجھوں گی کیسے؟ پتا نہیں وہ کون لوگ ہوں گے' جو سیٹ پر اسکرپٹ ملنے پر بھی آسانی سے پرفارم کرلیتے ہیں۔ میں تو ایسا کبھی نہ کرسکوں۔ آپ یقین کریں کہ میں اپنے کردار پر بہت محنت کرتی ہوں۔ تب ہی تو اس کا اچھا رزلٹ بھی آتا ہے۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ کسی دوسرے آرٹسٹ کی وجہ سے ری ٹیکس زیادہ ہوئے ہوں؟"

"ہاں جی! اکثر ہوجاتا ہے۔ مگر شکر ہے کہ میری وجہ سے کبھی ری ٹیکس نہیں ہوئے۔"

"عموماً" لوگ ایک دوسرے کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ نہیں سکتے۔ اس فیلڈ میں جیلسی ہے؟"

"آپ مجھے یہ بتائیں کہ کس فیلڈ میں ایسا نہیں ہوتا؟ ہر فیلڈ میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ کبھی جونیئرز کا رویہ سینئرز کے ساتھ اور کبھی سینئرز کا رویہ جونیئرز کے ساتھ خراب ہوتا ہے اور یہ چلتا رہتا ہے۔ لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گی کہ ہم جونیئرز فنکاروں کو کبھی بھی سینئرز کے ساتھ اپنا رویہ خراب نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ ان سے تو زیادہ سے زیادہ سیکھنا چاہیے۔ وہ تو ہمارے لیے ایک درس گاہ کا کام دیتے ہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں' ہماری بھلائی کے لیے کہتے ہیں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ' پھر مزید سوال کرتی ہوں؟"

"جی۔۔۔ میں 24 نومبر 1993ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ والدین نے میرا نام رکھا۔ جس کا مطلب "سرسبز" ہے۔ امی ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہیں۔ بابا زبیر عباسی کے بارے میں تو آپ جانتی ہی ہیں۔ مجھے ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ دو بھائیوں اور تین بہنوں میں میرا نمبر آخری ہے اور میری تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ گریجویشن کررہی ہوں۔"

"بچپن سے اس فیلڈ میں ہو۔ کیا اس فیلڈ میں آنے کا سوچا تھا یا کچھ اور بننے کا سوچا تھا؟"

"بننا تو میں ابھی بھی فیشن ڈیزائنر چاہتی ہوں اور ان شاء اللہ ضرور بنوں گی۔ میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا تھا کہ شوبز میں آؤں گی اور نام کماؤں گی۔ بس گھر کا ماحول ایسا تھا تو شاید کسی بچے کے کردار کے لیے ایک بچے کی ضرورت ہوئی ہوگی۔ تو مجھے لے لیا ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پانچ سال کی تھی تو میں نے ایک ڈرامے میں کام کیا تھا جس کا نام "ڈبل" تھا اور یہ ڈراما شمعون بھائی نے بنایا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ جب بھائی کو یہ ڈراما بنانا تھا تو انہیں گھر کی بچی کو ہی لینا تھا۔۔۔ تو بس جناب! بچپن سے ہوں اس فیلڈ میں۔"

"پھر مزا آیا تھا؟"

قہقہہ۔۔۔ "مزا کیا آنا تھا' کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ جیسے جیسے کہتے گئے' میں ویسے ویسے کرتی گئی اور بس ڈراما ہوگیا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب بابا اپنا اسکرپٹ لکھ کر حیدر امام رضوی صاحب کے پاس جایا کرتے تھے تو اکثر مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ تو حیدر انکل اکثر کہتے تھے۔ بیٹا! آپ میں مجھے ٹیلنٹ نظر آتا ہے۔ آپ بھی کام کیا کرو۔" تو میں کہتی تھی کہ "نہیں۔" پتا ہے کیوں؟ میں دیکھتی تھی کہ لوگ صبح سے شروع ہوتے تھے اور شام ہوجاتی تھی۔ مجھے بوریت ہوتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ اگر میں بھی کام کروں گی تو اتنی ہی دیر ہوجائے گی۔ بس اس لیے میرا دل نہیں چاہتا تھا اس فیلڈ میں آنے کو اور۔۔۔"

"پھر کیسے دل اس طرف مائل ہوا؟"

"سنیں تو۔۔۔ ایک اور مزے کی بات آپ کو بتاؤں۔۔۔ جب میں پانچویں کلاس میں تھی تو حیدر انکل کے کہنے پر میں نے ایک ڈرامے میں کام کرنے کی ہامی

بھرلی۔ وہ ڈراما کراچی سے باہر کسی گاؤں میں جاکر شوٹ ہونا تھا۔ اف! اتنا گندا گاؤں' اتنا گندا ماحول' پتا نہیں میں نے کس طرح کام کیا اور اسی وقت کہہ بھی دیا کہ بابا! اب اگر کسی نے کام کرنے کے لیے کہا تو میں کبھی بھی نہیں کروں گی۔ تو یہ حال تھا میرا فیلڈ میں آنے کے لیے۔"

"پھر آخر آہی گئیں۔ کیا کشش کھینچ کرلائی' شہرت یا پیسہ؟"

"کچھ بھی نہیں۔۔۔ قسمت کھینچ کرلائی۔۔۔ ہوا یہ کہ اس واقعے کے چند سال بعد جب میں بڑی ہوگئی تو محسن طلعت صاحب نے مجھے ڈراما "اک لمحہ" میں کام کرنے کی پیش کش کی اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اسے قبول کرلیا۔ "اک لمحہ" کیا اور وہ "اک لمحہ" ایسا تھا کہ میں نے فیصلہ کیا کہ اب کوئی آفر آئی تو انکار نہیں کروں گی۔۔۔ تو بس اب میں ہوں اور میرا کام ہے۔"

اب تک کافی کام کرچکی ہو۔ اپنی کمائی کیسی لگتی ہے؟

"مجھے پیسہ کا لالچ تو کبھی آیا ہی نہیں۔ بابا نے کبھی ہمیں کسی چیز کی تکلیف ہونے ہی نہیں دی کہ ہم نے خود سے سوچا ہو کہ ہم بھی کمائیں اور اپنی خواہشیں پوری کریں۔ ویسے بھی جب تک بابا حیات تھے۔ وہ ہی بات کرتے تھے۔"

"اور اب؟"

"اب بھائی ہیں۔۔۔ امی ہیں۔"

"ڈراموں میں کام کرنے کے علاوہ اور کہاں کہاں کس کس فیلڈ میں کام کرنے کا دل چاہتا ہے؟"

"ڈائریکٹر پروڈیوسر بننے کا تو میرا بالکل بھی خیال نہیں ہے۔ اس فیلڈ میں رہ کر اداکاری اور ماڈلنگ کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے ریمپ پہ ماڈلنگ کرنے کی آفرز بھی آتی ہیں۔ لیکن مجھے ریمپ پہ ماڈلنگ کرنا بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ ہاں! کمرشلز میں کام کرنا بہت اچھا لگتا ہے اور اگر کوئی میگزین کے لیے فوٹو شوٹ کے لیے کہے تو مجھے اچھا لگتا ہے اور کوئی بہت ہی ڈیسنٹ قسم کی مووی میں کام کرنے کی پیش کش ہوئی تو انکار نہیں کروں گی۔"

"پیسہ کہاں خرچ کرتی ہیں؟"

"میں فضول خرچ نہیں ہوں۔ لیکن یہ فیلڈ ایسی ہے کہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر کپڑوں پہ۔۔۔ کیونکہ جو لباس یا کپڑے ایک سیریل میں پہنتے ہیں' وہ دوسری کسی سیریل میں نہیں پہن سکتے۔۔۔ تو بس اس پر زیادہ خرچ ہوتا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ تو کیا یہ خرچ بھی خود کرنا پڑتا ہے؟"

"جی بالکل۔۔۔ کچھ لوگ ایسے ہیں' جو سیریل کے لیے وارڈروب دیتے ہیں۔ مگر اکثریت نہیں دیتے۔ ہاں! شادی ولیمہ کا کوئی سین ہو تو ضرور دیتے ہیں۔ اتنے بھاری سوٹ تو ہم خود نہیں خرید سکتے۔ کیونکہ پھر وہ تو ہمارے لیے بے کار ہوجائیں گے۔"

"رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ رکھتی ہیں روزے؟"

"جی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔۔۔ روزے پکے رکھتی ہوں۔ نماز بھی پڑھتی ہوں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سین کے دوران ہی مغرب کی اذان ہوجاتی ہے تو جلدی سے نمک' کھجور کھاکر روزہ کھول لیتے ہیں۔ پھر فارغ ہوکر افطاری کرتے ہیں۔"

"پھر تو عید کا بھی خوب اہتمام ہوتا ہوگا؟"

"بالکل ہوتا ہے۔۔۔ کیونکہ عید تو ہوتی ہی روزے دار کی ہے۔۔۔ تو میں تو خوب اہتمام کرتی ہوں عید کا اور اچھی خاصی شاپنگ بھی کرتی ہوں۔"

"ٹائم مل جاتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔۔۔ عید کے اہتمام کے لیے تو ٹائم نکال ہی لیتی ہوں۔ کیونکہ رات کو بھی تو بازار کھلے رہتے ہیں نا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انوشے عباسی سے اجازت چاہی۔

آپ کا باورچی خانہ

ق رحیم

1 کھانا جو کہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ تقریباً روز ہی زیر بحث ہوتا ہے کہ "آج کیا پکائیں؟" جواب کے حصول کے ساتھ ساتھ، چند اہم باتوں کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ میں اگر اپنی رائے کا اظہار کروں تو یہ کہوں گی کہ پسند، ناپسند، غذائیت، صحت، غرض یہ کہ سب باتوں کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے اور ہمارے گھر میں رکھا بھی جاتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر ہی فیصلہ ہوتا ہے کہ آج کیا پکائیں۔ اگر مجھے خالصتاً اپنے لیے کوئی ڈش بنانی ہو تو میں صرف اور صرف چٹ پٹی ڈشز کا ہی انتخاب کرتی ہوں، مسالا جات اور ساسز (Sauces) دل کھول کر استعمال کرتی ہوں۔

2 اکثر مہمان اچانک ہی آتے ہیں۔ مگر کھانے کے ٹائم تک رکتے نہیں۔ تو اسنیکس کی تیاری فوری طور پر ہو جاتی ہے۔ اگر مہمان زیادہ دور سے یعنی کراچی سے آئے ہیں تو ظاہر ہے، مختلف ڈشز آزمانے کے لیے وافر وقت مل جاتا ہے۔ اس کے لیے میں چکن قیمے کے کباب بنا کر داد وصول کرتی ہوں، ترکیب حاضر ہے۔

چکن قیمے کے کباب

اجزا:

بون لیس چکن	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
کٹی لال مرچ	حسب ذائقہ
کالی مرچ	دو سے تین چٹکی
انڈا	چکن کے تناسب کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک یا دو
ککنگ آئل	ڈیپ فرائی کرنے کے لیے

ترکیب:

چکن کو چوپر کی مدد سے قیمے میں تبدیل کر لیں۔
اب انڈا (اگر چکن آدھا کلو، یا اس سے کم ہے تو ایک بھی کافی ہے) پھینٹ کر، کسی باؤل میں ڈال لیں۔
نمک اور مسالا جات، پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈال کر مکس کر لیں۔ اب اس میں چوپ کیا ہوا چکن ڈال کر، خوب اچھی طرح مکس کریں۔ ایک سے دو گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اس کے بعد شامی کباب کی شکل میں چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بنا لیں۔ (اگر سائز بڑا رکھیں گی تو ذائقے پر برا اثر پڑے گا) اب ان کو ڈیپ فرائی کر لیں۔ اس کے بعد چلی گارلک ساس کے ساتھ سرو کریں۔

3 جی ہاں! بجا فرمایا، مگر بہتر ہوگا، اگر عورت کے ساتھ ساتھ لڑکی کے لفظ کا بھی اضافہ کر لیں۔ کچن کے ساتھ ساتھ واش روم پر بھی یہ کلیہ لاگو ہوتا ہے۔ جالے اور گندگی مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہوتی۔ سو پہلی فرصت (جو کہ فوراً دستیاب ہو جاتی ہے) میں ہی ان چیزوں کا کام تمام کرتی ہوں۔ کچن کی تفصیلی صفائی تو مما ہی کرتی ہیں، البتہ میں ہر استعمال کے بعد کچن، خاص طور پر، چولہا اور سنک اچھی طرح صاف کرنے کی عادی ہوں (گندگی برداشت جو نہیں ہوتی۔)

4 بے شک، اہمیت رکھتا ہے صبح کا ناشتا، مگر میں سب سے آخر میں کرتی ہوں آملیٹ، فرائی انڈے یا سالن کے ساتھ، سادہ روٹی، میرا ناشتا ہوتا ہے۔ پراٹھا کھانا... میرے بس سے باہر ہے، کیونکہ معدہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پراٹھا کھایا نہیں، پیٹ میں درد ہوا نہیں۔ جہاں تک تعلق ہے بنانے کا، تو یہ کام مما کرتی ہیں۔ میں ضرورت پڑنے پر ہی ناشتا بناتی ہوں (جب مما گھر پر نہیں ہوتیں) ویسے آلو اور گوبھی کے پراٹھے، میں بہت اچھے بناتی ہوں۔

5 باہر کھانا، مما، ڈیڈ اور میری برتھ ڈے پر کھاتے ہیں۔ ڈیڈ کی برتھ ڈے پر کے ایف سی زندہ باد، جبکہ مما اور میری ترجیحات، بدلتی رہتی ہیں۔ خوشی کے موقع پر قریبی آئس کریم پارلر حاضر ہے، جہاں جانے کے لیے میں اور میری کزنز ہر وقت تیار ہیں۔ زیادہ خوشی کا موقع ہو تو تھوڑی دور "علی بابا" کی آئس کریم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور موقع یا موڈ ہو تو پزا منگوا کر انجوائے کرتے ہیں۔

6 بالکل! موسم کو مد نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ویسے، سردی کے موسم میں "حلیم" اور گرمی میں "بھنڈی گوشت" کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ بارش کے موسم میں فرنچ فرائز کے ساتھ چائے کے لیے میں فوراً تیار ہو جاتی ہوں اور مما، ڈیڈ کو بھی کر لیتی ہوں۔ (تھوڑی سی بدپرہیزی تو چلتی ہے) ہاں یاد آیا۔ "مٹر پلاؤ" میں ہر طرح کے موسم میں کھانے کے لیے تیار رہتی ہوں۔ ایک ڈش، جو کہ میں گرمی میں بھی بنانے کو تیار ہوں، ترکیب میں نے خود ایجاد کی ہے۔

چٹ پٹا اسٹیم چکن

اجزا:

چکن	آدھا کلو (کٹ لگا ہوا)
دہی	آدھا کپ
پودینہ	تھوڑا سا
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
ہری مرچ	چار (درمیانے سائز کی)
کٹی لال مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹر	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
سرکہ	ایک سے دو کھانے کے چمچے
چلی ساس	چند قطرے
سویا ساس	دو سے تین کھانے کے چمچے
گرم مسالا	چٹکی بھر
لہسن	چھ سے سات جوے
ادرک	حسب ضرورت (باریک کٹی ہوئی)
پانی	ڈیڑھ سے دو کپ
ککنگ آئل	حسب ضرورت
ہلدی، لال مرچ (پسی ہوئی)	حسب ذائقہ

ترکیب:

سب سے پہلے، ایک ہری مرچ، پودینہ، ہرا دھنیا اور چٹکی بھر نمک لے کر گرائنڈ کر لیں۔ پھر دہی کو پھینٹ کر اس آمیزے میں ڈال کر مکس کر لیں۔ پھر اس میں سرکہ، چلی اور سویا ساس، نمک اور کٹی لال مرچ ڈال کر مکس کریں۔ اس تمام آمیزے کو اچھی طرح مکس کر کے چکن پر اچھی طرح لگا لیں۔ اس چکن کو آدھ گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اب ٹماٹر کو باریک کاٹ لیں۔ پیاز بھی گولائی میں کاٹ لیں۔ پیاز اور ٹماٹر ایک ہی برتن میں ڈال کر اس میں چٹکی بھر نمک اور پسی ہوئی لال مرچ ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں اور پانچ سے دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ دیگچی میں، ایک کپ پانی میں، مسالا لگی پیاز اور ٹماٹر ڈالیں لہسن پیس کر ڈال دیں اور ڈھکن لگا کر جوش دیں۔ جب ابلنا شروع ہو جائے تو ہلدی ڈال دیں۔ ٹماٹر جب ادھ گلے ہو جائیں تو چکن ڈال کر آنچ ہلکی کر دیں۔ ڈھکن لگا کر (ایر ٹائٹ Air Tight) کر دیں۔ تاکہ اسٹیم کی مدد سے چکن گل جائے۔ جب پانی تھوڑا سا رہ جائے تو آئل ڈال کر بھون لیں۔ پھر حسب ضرورت گریوی بنا کر، ہری مرچیں (تین عدد) گرم مسالا اور ادرک ڈال کر چولہا بند کر دیں اور دیگچی ڈھک دیں۔ چند منٹ گزر جانے کے بعد ڈھکن کھولیں اور اس مزیدار چکن سے لطف اندوز ہوں۔

7 کیوں نہیں۔ محنت کے بغیر کھانا اچھا نہیں بن سکتا۔ مگر اس کے لیے توجہ کی بھی ضرورت ہے اور اچھے موڈ کی بھی۔

8 اس کے بارے میں، میں یہ کہوں گی کہ فارغ وقت میں اشیا، مثلاً "لہسن وغیرہ چھیل کر رکھ لیں۔ زیرہ بھون کر رکھ لیں۔ وقت کی اور توانائی کی بچت ہو گی۔ سب سے اہم ٹپ یہ ہے کہ۔
"مٹی دی ہانڈی وچ پایئے، آقا دے ناں دا ذائقہ۔"

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

آئس کریم مینگو شیک

اجزا:

آم	دو عدد
شہد	ایک کھانے کا چمچہ
دودھ	دو کپ
مینگو آئس کریم	حسب ضرورت

ترکیب:

آم کو چھیل' کاٹ کر بلینڈر میں ڈالیں۔ ساتھ ہی شہد' دودھ اور برف بھی ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کر لیں۔ آدھی مینگو آئس کریم ڈال کر ایک بار پھر بلینڈ کر لیں۔ سرو کرتے وقت گلاسوں میں پہلے دو دو چمچے آئس کریم کے ڈالیں پھر اس کے اوپر مینگو شیک ڈال کر ٹھنڈا ٹھنڈا پیش کریں۔

ہنی کھجور شیک

اجزا:

کھجور	آدھا پاؤ
شہد	دو کھانے کے چمچے
دودھ	دو کپ
بالائی	چار کھانے کے چمچے

ترکیب:

کھجور کی گٹھلیاں نکال کر اسے اچھی طرح دھو لیں بلینڈر میں تمام اجزا ڈال کر دو بار بلینڈ کریں۔ گلاسوں میں نکال کر کٹی ہوئی برف ڈال کر پیش کریں۔ (گاڑھا لگے تو آدھا گلاس پانی بھی شامل کر سکتی ہیں)

بیڑا روٹی

اجزا:

میدہ	ایک پاؤ
قیمہ	ایک پاؤ
دودھ	ایک چوتھائی کپ

ادرک لہسن پیسٹ	دو چائے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	دو چٹکی
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	پانچ عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

قیمے کو نمک' لہسن ادرک پیسٹ اور ہری مرچوں کے ساتھ ابال کر پانی خشک کر لیں۔ میدے میں نمک' بیکنگ پاؤڈر اور ایک چمچہ تیل ملا کر گوندھ لیں۔ آدھے گھنٹے بعد چپاتی کی شکل میں بیلیں۔ آدھے حصے میں قیمے کا آمیزہ رکھ کر دوسرا حصہ پلٹ دیں۔ کناروں کو اچھی طرح بند کریں۔ روٹی کو گہرے تیل میں تل لیں۔ دہی کے رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

قیمہ پین کیک رول

اجزا:

قیمہ	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد
لہسن' ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر	ایک عدد
ہری مرچ	دو عدد
انڈے	تین عدد
میدہ	ایک کپ
مایونیز	آدھا کپ
کٹی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

پیاز سنہری کر کے لہسن' ادرک پیسٹ اور قیمہ ڈال کر بھونیں۔ پھر نمک' کٹی مرچ اور باریک کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال کر پکائیں۔ ٹماٹر نرم ہو جائیں تو گرم مسالا اور ہری مرچ باریک کاٹ کر خوب بھونیں اور چولہا بند کر دیں۔ انڈوں میں میدہ' نمک اور سیاہ مرچ ڈال کر پھینٹیں۔ زیادہ گاڑھا لگے تو تھوڑا سا پانی ملا لیں۔ فرائنگ پین میں ایک چمچہ تیل گرم کر کے آمیزہ ڈالیں۔ چمچے سے پھیلائیں۔ آنچ ہلکی رکھیں۔ ایک سائیڈ سنہری ہو جائے تو پلٹ دیں۔ اسی طرح سارے پین کیک بنا لیں۔ ایک پین کیک پر ایک سائیڈ میں تھوڑا سا قیمہ اور باریک کٹا ہوا کھیرا رکھیں۔ دوسری سائیڈ پر مایونیز لگائیں اور رول کر دیں۔ کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

کریمی مینگو

اجزا:

آم	آدھا کلو
گندم والے بسکٹ	ایک پیکٹ
مکھن	ایک چھوٹی ٹکیہ
کریم	آدھا کپ
چاکلیٹ	حسب ضرورت
کیلے	چھ عدد
براؤن شوگر	دو کھانے کے چمچے
کنڈینسڈ ملک	ایک کپ

ترکیب:

مکھن پگھلا کر اس میں بسکٹ کو چورا کر کے ملا لیں اور ڈش میں ڈال کر سیٹ کریں۔ الگ برتن میں ایک چمچہ براؤن شوگر میں' مکھن اور کنڈینسڈ ملک ڈال کر پکا لیں۔ اس گاڑھے سے مکسچر کو بسکٹ والے آمیزے کے اوپر پھیلا دیں۔ کریم میں کیلے اور آم کے چوکور پیس مکس کر کے اس کے اوپر پھیلائیں۔ سب سے اوپر چاکلیٹ (کپ میں نکال کر پھینٹ لیں تاکہ

نرم ہو جائے) اور بقیہ براؤن شوگر چھڑک کر سجاوٹ کریں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

خوبانی ڈیلائٹ

اجزا :

خوبانی	آدھا کلو
اسٹرابری	چھ عدد
کیلے	چھ عدد
چینی	چھ کھانے کے چمچے
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
بادام	چار کھانے کے چمچے
کریم	دو کپ

ترکیب :

خوبانی کو رات بھر کے لیے بھگو دیں۔ صبح بادام نکال کر چار گلاس پانی اور چار چمچے چینی کے ساتھ پکالیں۔ پھر لیموں کا رس بھی شامل کرلیں۔ کریم میں دو چمچ چینی پیس کر پھینٹ لیں۔ کیلے کو لمبائی میں کاٹ کر پھر اس کے ٹکڑے کرلیں۔ گلاسوں میں تھوڑی سی کریم ڈالیں پھر خوبانی کا مکسچر، پھر کیلے کے ٹکڑے، پھر تھوڑی سی کریم، اس کے اوپر دوبارہ خوبانی کا مکسچر ڈالیں۔ سب سے اوپر کترے ہوئے بادام اور سلائس میں کٹی ہوئی اسٹرابریز رکھ کر پیش کریں۔

انجیر کی چٹنی

اجزا :

انجیر	پندرہ عدد
املی پیسٹ	آدھا کپ
دار چینی پاؤڈر	دو چٹکی
سونٹھ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چوتھائی کپ
ہینگ	ایک چٹکی

ترکیب :

انجیر کو دھو کر تین گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو دیں۔ پھر پانی نتھار کر باقی تمام اجزا کے ساتھ ملا کر فرائنگ پان میں گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ انجیر کی مزے دار چٹنی تیار ہے۔ بوتل میں ڈال کر محفوظ کرلیں۔ روزانہ افطاری میں استعمال کرسکتی ہیں۔

املی کی میٹھی چٹنی

اجزا :

املی	ایک پاؤ
چینی	ایک پاؤ
کٹی لال مرچ	تین چائے کے چمچے
پانی	ایک گلاس

ترکیب :

املی کو ایک گلاس پانی ڈال کر بھگو دیں۔ ایک گھنٹے بعد املی کا گودا مسل دیں۔ چینی اور کٹی لال مرچ شامل کر کے چولہے پر چڑھا دیں۔ ایک ابال آنے کے بعد آنچ دھیمی کردیں اور ہلکا گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ اس دوران چمچہ چلاتی رہیں۔ ہلکا گاڑھا ہونے پر چولہے سے اتار لیں۔ ٹھنڈا کر کے کسی بوتل میں بھر کر محفوظ کرلیں۔ یہ چٹنی آپ کئی دنوں تک استعمال کرسکتی ہیں۔

خاموشی کو بیاں ملے

امت الصبور

شفق راجپوت.... گوجرہ

1 نام آپ سب اوپر پڑھ چکے ہیں۔ گوجرہ میں رہتی ہوں۔ آئی سی ایس کیا ہے۔ اب بی اے وداکنامکس کررہی ہوں۔ چار بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر ہوں۔ مشاغل میں ڈائجسٹ پڑھنا یا جو بھی کتاب مل جائے چونکہ لائٹ آج کل ہوتی نہیں تو ٹی وی والا مشغلہ رہنے ہی دیں۔ ہاں لوگوں کے گھروں کی گھنٹیاں بجا کے بھاگنا بھی مشغلہ ہے (ہاہاہا....)

2 خوبیاں ذرا کم ہی ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کا کہنا ہے کہ خوش اخلاق ہوں اور میرا اپنا خیال ہے کہ میں کسی کو جھوٹی امیدیں نہیں دلاتی۔ منافقت نہیں کرتی۔ صاف گو ہوں اور اسے لوگ منہ پھٹ ہونا کہتے ہیں۔ خامی یہ ہے کہ موڈی ہوں اور اپنی اس خامی پہ قابو پانا چاہتی ہوں اور یہ کہ میری کزنز سب کہتی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ مائنڈ کرجاتی ہوں اور میں کہتی ہوں کہ ضروری نہیں کہ جو بات دوسروں کو چھوٹی لگ رہی ہو۔ وہ میرے لیے بھی چھوٹی ہو۔ میرے خیال میں اتنی کافی ہیں۔

3 خواتین کا ساتھ.... میرا ہاتھ تھام کے شعور کی منزلوں تک مجھے خواتین نے ہی پہنچایا ہے۔ 7th سے پڑھ رہی ہوں۔ میٹرک تک جو مل جاتا تھا پڑھ لیتی تھی۔ مگر میٹرک کے بعد سے ریگولر پڑھ رہی ہوں۔ موسٹ فیورٹ میں عمیرہ احمد، نمرہ احمد، عنیزہ سید اور سائرہ رضا ہیں۔

4 ڈیٹ آف برتھ اکیس مئی ہے۔ مگر آج تک سالگرہ منائی نہیں۔ ہاں فرینڈز وغیرہ وش کردیتی ہیں۔ ویسے مجھے میری سالگرہ کا بہت انتظار رہتا ہے کہ دیکھوں، کس کس کو یاد ہے۔ ہاں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے خود بھی یاد نہیں تھا کہ میری آج سالگرہ ہے۔ جب دوپہر تین بجے میری دوست نورین کا ایس ایم ایس آیا تب میں حیران رہ گئی۔ تب بہت خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ میں کبھی یہ دن نہیں بھولی۔ اپنی تو یاد رہتی ہی ہے۔ میں اپنی سب فرینڈز، گھر والوں، کزنز سب کی یاد رکھتی ہوں اور لازماً" وش کرتی ہوں۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ زندگی میں یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور پیاری سی یادیں زندگی کی خوبصورتی کو چار چاند لگادیتی ہیں۔

5 ویسے تو بہت سی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں۔ مگر اس سال ڈائجسٹ کے علاوہ کورس کی کتابیں ہی پڑھ سکی ہوں۔ پلیز آپ سب دعا کیجیے گا کہ میں بہت اچھے نمبروں میں بی اے کرلوں اور بہت سا پڑھوں.... آمین۔

6 پسندیدہ شعر.... شاعری مجھے جنون کی حد تک پسند ہے، خود بھی شاعری کرتی ہوں اور پڑھنے والوں کی رائے ہوتی ہے کہ بہت اچھی ہے۔ یہاں ایک نہیں میں دو شعر لکھنا چاہوں گی جو مجھے بہت پسند ہیں۔ پہلا شعر جو لکھ رہی ہوں، یہ میں نے نویں جماعت میں پڑھا تھا اور اس شعر نے کافی حد تک میری سوچ بدل دی تھی۔

ہو سکے تو خود میں کشش پیدا کر....
یوں حسرت سے ہر شخص کو دیکھا نہیں کرتے
ہر شخص نہیں ہوتا ہر شخص کے قابل
ہر شخص کو اپنے لیے پرکھا نہیں کرتے

یہ دوسرا شعر حسب حال ہے۔ محبت مل جائے اور وہ بھی آپ کی سوچ سے زیادہ تو اس محبت کو پانے سے پہلے تک کچھ ایسی کیفیت ہوتی ہے۔ ہر لمحہ اسے کھو دینے کا ڈر ساتھ ساتھ سانس لیتا ہے۔

یہ محبتوں کے ساحل پہ رفاقتوں کے دریا
کوئی حرج تو نہیں ہے انہیں جس قدر سراہو
مگر اپنی چاہتوں سے مجھے ڈر سا لگ رہا ہے
کہ بچھڑ نہ جاؤ تم بھی، مجھے اس قدر نہ چاہو

حفصہ احمد علی (بستی کوٹھی نمبر 7) کبیر والا

1 ہم چار بہنیں دو بھائی ہیں۔ والدہ حیات نہیں۔ ابو جان ماشاء اللہ سے ٹیچر ہیں۔ میں تھرڈ ایئر کی طالبہ ہوں۔ نماز اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد مشاغل میں خواتین، شعاع پڑھنا شامل ہے اور بہن بھائیوں کے ساتھ ہر بات شیئر کرنا۔ کیونکہ امی جان کی وفات کے بعد ہم ایک دوسرے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ہم سب بہن بھائیوں کو اپنے ابو سے بہت محبت ہے اور میرے بھائی ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔

2 خامیاں۔ بہن سمیعہ کا کہنا ہے کہ دو طرح کا مزاج رکھتی ہوں۔ ایک وقت میں سمجھ داری کی بات کررہی ہوتی ہوں اور دوسرے وقت میں بے وقوفی کی، بس اتنا ہی کافی ہے۔

3 خوبیاں۔ میری دوست مہک کے مطابق تم ہر کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہو۔ کچھ نے کہا آنکھیں خوبصورت ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے حسد اور منافقت بالکل پسند نہیں ہے۔

3 خواتین سے وابستگی۔ خواتین سے تعلق تقریباً" آٹھ سال پرانا ہے اور بڑی بہن سمیعہ اور کزن صائمہ کو دیکھ کر شوق ہوا۔ شروع میں ابو رسالے پڑھنے کے خلاف تھے، لیکن بعد میں ابو خود لا کر دینے لگے۔

4 ناول مجھے بہت سارے پسند ہیں۔ **مثلاً"** پیر کامل، لاحاصل، مصحف، اور ے پیا اور قراقرم کا تاج محل شامل ہے۔ ہر کہانی جو خواتین اور شعاع میں شائع ہوئی اور اس سے ہم نے کچھ نہ کچھ ضرور سبق سیکھا۔ امی جان کی وفات کے بعد اس نے ہماری تربیت کی۔ یہ ہمارے دکھ سکھ کا ساتھی ہے۔ میرا چھوٹا سا گاؤں، جس میں 90٪ لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور تمام لڑکیاں ڈائجسٹ کی دیوانی ہیں۔ جہاں تعلیم ہوگی وہاں خواتین اور شعاع ضرور ہوں گے۔ ہر ماں کو اپنی بیٹی کو ایسے رسالے پڑھنے سے نہیں روکنا چاہیے۔

5 پسندیدہ کتاب۔ قرآن پاک کے بعد ذخیرہ آخرت، بکھرے موتی شامل ہیں۔
پسندیدہ شعر۔

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے

6 سالگرہ کبھی نہیں منائی، میری بہن سمیعہ، زیب النساء، مریم اور کزنیں صائمہ، نجمہ گوہر ہم سب بھی دوستوں کی طرح رہتے ہیں اور ہر خوشی غم مل کر مناتے ہیں۔

سارہ چوہدری (ڈوگر گجرات)

1 میرا نام سارہ چوہدری ہے، میرا تعلق ضلع گجرات کے گاؤں ڈوگر سے ہے۔ میں اپنی تعلیم مکمل کرچکی ہوں اب فارغ ہوں۔

2 مجھ میں بہت سی خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی خامی یہ ہے کہ غصہ بہت آتا ہے کنٹرول نہیں ہوتا اور دوسری خامی یہ کہ مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہوپاتا اس لیے کبھی کسی کو دوست بھی نہیں بنایا۔ خوبیاں شاید اور بھی ہوں مگر اک خوبی سے میں خود آگاہ ہوں اور وہ ہے نرم مزاجی اور اس کے علاوہ لوگ کہتے ہیں۔ تم بہت پرعزم اور ہمت والی ہو۔

3 خواتین اور شعاع، کرن تینوں کو تقریباً" دس سال سے پڑھ رہی ہوں اک دو دفعہ لکھ بھی چکی ہوں، مگر شاعری کے علاوہ کسی اور سلسلے میں پذیرائی نہیں ملی تو دوبارہ جسارت نہیں کی، مگر "میری خاموشی کو بیاں ملے" سلسلے کو دیکھ کر بہت دل چاہتا تھا۔ میں بھی شرکت کروں۔ کہتے ہیں کہ وقت اور سمجھ کبھی بھی بیک وقت نہیں ملتے۔ جب وقت ہو، سمجھ نہیں ہوتی اور جب سمجھ آتی ہے تب وقت نہیں ہوتا۔ کبھی مجھے بھی سمجھ نہیں تھی۔ مگر اللہ کا شکر ہے۔ ابھی وقت بھی ہے اور سمجھ بھی آگئی ہے اور یہ سب ان ڈائجسٹ کے باعث ممکن ہوا سو تھینکس آ لاٹ۔

4۔ 2 اکتوبر 1990ء کو پیدا ہوئی۔ مجھے سالگرہ کے دن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے نہ تو کبھی اس دن کا انتظار کیا، نہ کبھی سالگرہ منائی ہے۔ بلکہ زندگی کا اک اور سال ضائع ہوگیا۔ یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے اور آنے والے لمحے بہتر بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔

5۔ "ہر انسان کو اتنی اہمیت دو جتنی وہ آپ کو دیتا ہے کم دو گے تو مغرور کہلاؤ گے زیادہ دو گے تو وہ آپ کو آپ کی ہی نظروں میں گرادے گا۔"

6۔ پسندیدہ شعر! مجھے شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ مجھے محسن نقوی اور فرحت عباس شاہ کی شاعری بہت اچھی لگتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے بلھے شاہ اور وارث شاہ بے حد پسند ہیں۔ یہاں فرحت عباس شاہ کا ایک شعر حاضر خدمت ہے۔

وہ جو ٹل جاتی رہی سر سے بلا شام کے بعد
کوئی تو تھا جو دیتا تھا دعا شام کے بعد

سمیرا انور۔ جھنگ

1 ہمارا مختصر سا تعارف آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ "ہیر رانجھا" کے شہر جھنگ سے تعلق رکھتی ہوں۔ جہاں تک تعلیمی قابلیت کی بات ہے۔ ایم اے ہسٹری پارٹ ون کلیئر ہے۔ پارٹ ٹو کی تیاری کررہی ہوں اور ایک پرائیویٹ اسکول میں تعلیمی فرائض بھی سرانجام دے رہی ہوں۔ مطالعہ کی بہت شوقین ہوں اپنے بھائی سے بحث و مباحثے کی اچھی محفل جماتی ہوں۔ ڈائجسٹ اور میگزین پڑھنا، اچھے اچھے کھانے بنانا بھی میرے مشاغل میں شامل ہے۔ یہ تو تھا مابدولت کا تعارف اور اب آتے ہیں اس سوال کی طرف جس سے دل میں لڈو پھوٹ پڑے۔

2 اف! اپنے منہ میاں مٹھو بننا کتنا عجیب لگتا ہے۔ چلیں! پہلے اپنی خامیوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ بقول امی جان کاہلی، سستی تو مجھ پہ ختم ہوتی ہے۔ غصہ بہت زیادہ آتا ہے۔ شدت پسند اور کسی حد تک خود پسند بھی ہوں۔ خوبیاں یہ کہ بہت زیادہ مخلص ہوں اور اپنے خلوص۔۔۔ کی وجہ سے بعض دفعہ نقصان بھی

اٹھاتی ہوں۔ جس کام کی ٹھان لیتی ہوں' وہ کر کے ہی رہتی ہوں۔ "فرحت اشتیاق" کے ناولوں کے کرداروں کی طرح بہت کیئرنگ اور حساس ہوں۔

3 خواتین سے وابستگی بہت پرانی ہے۔ "نیلا کرن" کا ایک مکمل ناول پڑھا تھا جس میں یونیورسٹی لائف کو متعارف کرایا گیا تھا۔ بس تب سے خواتین' شعاع اور کرن سے شناسائی ہوئی۔ میرا بھائی کہتا ہے' میں کھانا تو چھوڑ سکتی ہوں۔ لیکن ڈائجسٹ پڑھنا نہیں۔ فرحت اشتیاق' رخسانہ نگار' نبیلہ عزیز' سائرہ رضا میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ "شہر دل کے دروازے" (شازیہ چوہدری) "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" (فرحت اشتیاق) "دل دریا سمندر وں ڈونگھے" (آسیہ مرزا) ایسی تحریریں ہیں' جو میں کبھی بھول نہیں سکتی۔

4 جولائی کی تپتی گرمیوں میں جب سب کے ہوش اُڑے ہوتے ہیں تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ ان کی فرینڈ کی سالگرہ ہے۔ سب وش کرنا بھول جاتے ہیں۔ ہاں! البتہ میرے اسٹوڈنٹ ضرور وش کرتے ہیں۔

5 بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ نسیم حجازی کی "محمد بن قاسم' شاہین' "آخری چٹان" اور اس کے علاوہ شازیہ چوہدری کا "تیرے نام کی شہرت' شہر دل کے دروازے اور عمیرہ احمد کا ناول "پیرِ کامل" پڑھا ہے۔

6 شاعری سے بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ اب مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں ملتا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار محسن نقوی کی "برگِ صحرا" ضرور اٹھا لیتی ہوں۔ پسندیدہ شعر آپ سب کی نذر۔

ڈوبتے ڈوبتے سورج نے سیاہ شب سے کہا
چاند ابھرا بھی تو کیا' لختِ جگر اپنا ہے

فائزہ شیخ عباس۔ کراچی

میرا نام فائزہ شیخ عباس ہے۔ میں اس شہر میں مقیم ہوں' جو کبھی روشنیوں کا شہر تھا۔ یعنی کراچی۔ مگر اب بجلی والوں کی مہربانیوں سے یہ شہر اندھیروں میں ڈوب گیا ہے۔ ہم پانچ بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ میں بھائی بہنوں میں چوتھے نمبر پر ہوں۔ تعلیمی قابلیت میٹرک ہے۔ آگے پڑھنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ میں اللہ عزوجل کی بہت شکر گزار ہوں کہ مجھے اتنی اچھی فیملی اور ایک بہترین ٹیچر عطا کی۔ زندگی میں صرف ایک دوست بنائی تھی۔ وہ بھی شادی کے بعد لاہور چلی گئی۔ اب وہ ساتھ نہیں۔ مگر اس بات کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اس لیے کہ وہ کمی میری ٹیوشن ٹیچر نے پوری کردی۔ میں اپنی ہر بات ان سے شیئر کرتی ہوں۔ وہ ہر بات پر میری اصلاح کرتی ہیں۔ بہت خوش نصیب ہوں میں کہ اتنی اچھی ٹیچر ملی' جو پڑھانے کے ساتھ ساتھ جینے کا سلیقہ و قرینہ سکھاتی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے یہ سب خواتین' شعاع اور کرن ڈائجسٹ سے سیکھا ہے۔ وہ ٹیچر کے ساتھ ساتھ ایک اچھی ماں اور دوست بن کر میری رہنمائی کرتی ہیں۔ میں دعا گو ہوں کہ والدین اور ٹیچر کا سایہ مجھ پر اور ان کے بچوں پر تاقیامت قائم و دائم رہے۔ (آمین)

2 خوبی۔ ہر ایک سے خوش دلی سے ملتی ہوں۔ چاہے اپنا ہو یا غیر۔ سادگی پسند ہوں۔ بہت رحم دل ہوں۔ ہر ایک کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہوں' جس بات کا علم نہ ہو' اس پر تبصرہ نہیں کرتی اور جس بات کا علم ہو' کوشش کرتی ہوں کہ پہلے خود عمل کروں۔ پھر دوسروں کو تاکید کروں۔

خامی۔ غصہ بہت آتا ہے۔ ہر ممکن کوشش کرتی ہوں کہ برداشت کروں۔ مگر غلط بات بالکل برداشت نہیں ہوتی ہر ایک پر بہت جلد بھروسا کرلیتی ہوں کوئی اجنبی ہنس کر بات کرلے تو سمجھتی ہوں کہ اس جیسا پوری دنیا میں کوئی اچھا نہیں ہے۔ دوسروں پر جلد بھروسا کرنے کی اس عادت کی وجہ سے اکثر و بیشتر نقصان سے دوچار ہوتی ہوں۔

3 مشاغل۔ مطالعہ کرنا۔ جس میں سرفہرست دینی کتابیں' کہانیاں سننا' ڈائری لکھنا اور کھانوں کی نت نئی ترکیبیں آزمانا۔ نعتیں پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔

4 ڈائجسٹ سے وابستگی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ مگر جس دوست کی وجہ سے میری وابستگی اس خواتین ڈائجسٹ سے ہوئی وہ شہید معیز اکرم ٹیوشن سینٹر کی ٹیچر ہیں۔ وہ ہمیشہ ہی خواتین' شعاع اور کرن ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ وہ تمام کہانیاں' جن میں اچھی نصیحتیں ہوتی ہیں' وہ ہمیشہ تمام اسٹوڈنٹس سے شیئر کرتی ہیں جس سے ہمیں اچھے برے کی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ان کو دیکھ کر مجھے بھی ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ پہلے ایک دوبار پڑھا تھا۔ بہت پسند آیا خاص طور پر افسانہ "چارہ گر" اور باقی کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر "زمین کے آنسو" اور "کوہ گراں تھے ہم"۔ مصروفیت کی وجہ سے ریگولر نہ پڑھ سکی مگر اب ان شاء اللہ باقاعدگی سے پڑھنے کی کوشش کروں گی۔

5 سالگرہ۔ جس دن سب لوگ نئے سال کی خوشیاں مناتے ہیں تو بندہ دولت اسی دن دنیا میں تشریف لائے۔ جی جناب! یکم جنوری میری ڈیٹ آف برتھ ہے۔ سالگرہ صرف اس حد تک مناتی ہوں کہ گھر میں ہی کچھ اچھا سا بنا کر فیملی کو ٹریٹ دے دیتی ہوں۔ بدلے میں ان سے گفٹس کی امید نہیں رکھتی۔ بس سب کی مبارکباد ہی میرے لیے قیمتی گفٹ سے کم نہیں ہوتی اور والدین کی دعائیں تو میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ دونوں بڑی بہنوں اور بہنوئیوں کی فون کال کا انتظار رہتا ہے۔ مگر ہمیشہ ہی بھول جاتے ہیں۔ دوسروں کی سالگرہ منانے میں ہمیشہ گھر میں اول نمبر پر رہتی ہوں۔ چاہے فیملی ممبرز کی ہو یا عزیز و اقارب میں سے کسی کی۔ سب کو وش کرتی اور گفٹس دیتی ہوں۔ امی کہتی ہیں' اگر سات سمندر پار بھی کسی کی برتھ ڈے ہو' یہ لڑکی اسے بھی ضرور وش کرتی ہے۔

6 شاعری کا مجھے جنون تھا۔ دو سال پہلے مجھے ایسا لگا کہ میری زندگی کا خوبصورت سفر شروع ہو گیا ہے۔ مگر یہ سفر اتنا تکلیف دہ بن جائے گا۔ میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ایسی ٹھوکر لگی کہ آج تک اس کی کسک لہولہو کرتی ہے۔ اب مجھے اجازت دیجیے' اس شعر کے ساتھ۔

پچھلے برس یہ خوف' تجھے کھو نہ دوں کہیں
اب کے برس دعا ہے' تیرا سامنا نہ ہو

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

عدنان

کیا آپ کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے، جو ہمیشہ کسی نہ کسی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں؟
فکر و تشویش سے ہمارا دماغ اور جسم دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے ہمارے جسم کے مختلف اعضا پر اثر پڑتا ہے۔ ڈاکٹروں نے حال ہی میں یہ دریافت کیا ہے کہ ہماری بہت سی جسمانی بیماریوں مثلاً "دمہ" بلڈ پریشر قلبی امراض "اگزیما اور شوگر کا اصل سبب دراصل یہی فکر و تشویش ہے۔
اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں "فکر و تشویش سے نجات حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن شعوری کوشش سے ہم بہت حد تک خود کو مطمئن اور پرسکون رکھ سکتے ہیں۔
منفی خیالات "فکر" پریشانی اور بے کار قسم کے خیالات سے بچنے کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھیں۔ بدترین حالات میں بھی یقین رکھیں کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور یہ پریشانیاں جن سے آپ گزر رہے ہیں "دور ہو سکتی ہیں۔
پریشانی "فکر سے بچنے کا دوسرا حل یہ ہے کہ خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھیں اور کوئی مشغلہ ضرور اپنائیں۔ پابندی سے پنج وقتہ نماز بہت سی پریشانیوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ صبح بیدار ہوتے ہی بستر چھوڑ دیں کیونکہ بستر پر پڑے رہنے سے طرح طرح کے منفی خیالات پیدا ہوں گے جو آپ کو فکر و تشویش میں مبتلا رکھیں گے۔
ہماری بہت سی پریشانیاں خود ساختہ ہوتی ہیں۔ اگر کوئی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے تو ہو سکتا ہے کہ آپ کی غلط فہمی یا وہم ہو "آپ بلاوجہ پریشان ہوں۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ کسی بااعتماد دوست یا تجربہ کار شخص سے مشورہ کر لیں۔

ثروت سلطانہ۔۔۔ کراچی

یہ تو عجیب بات ہوئی کہ جب جی چاہا ہاں کر دی اور جب جی چاہا نہ کر دی اور پھر کسی بات پر مچل گئے۔ یہ تو متلون مزاجی ہے۔ کسی ذی شعور آدمی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس قسم کی باتیں کرے۔ محبت تو ایک مقدس جذبہ ہے۔ جن سے انسان محبت کرتا ہے۔ ان سے سخت یا تلخ گفتگو نہیں کرتا۔ نہ دھمکی دیتا ہے اور نہ انتقام کی باتیں کرتا ہے بلکہ ان کی دل سے قدر کرتا ہے۔ ان کے لیے ہمیشہ اچھے انداز میں سوچتا ہے۔ ان کی خیر و عافیت اور اچھی زندگی کے لیے دعائیں کرتا ہے۔

اس کو سمجھائیں۔ وہ اپنے سوچنے اور کرنے کے انداز میں تبدیلی لائے اور محبت کے جذبہ کو سمجھے "اگر کوئی مل جائے تو خدا کا شکر ادا کرے۔ نہ ملنے کی صورت میں اس کے اچھے کے لیے دعائیں کرے۔

ش۔ ر۔ ہاشمی

بہن ش۔ ر۔ ہاشمی نے لکھا ہے۔
س:۔ میری عمر 28 سال ہے۔ ایف اے کیا ہوا ہے گھر میں بڑی ہوں پھر بھائی ہے۔ میں نے ایم بی اے کیا ہے۔ پھر چھوٹی بہن ہے اس نے ماسٹرز کیا ہے۔ میرے والد فرسٹ کلاس آفیسر تھے 2007ء ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ سیدھی سادی خاتون ہیں۔ میں جب پانچویں کلاس میں تھی تو والدہ کو دورہ پڑا۔ وہ ذہنی مریضہ تھیں۔ انہیں مختلف آوازیں آتی تھیں والد نے انہیں ڈاکٹر کو دکھانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ نانا اور ماموں ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ وہ ان ہی کا علاج کرتی تھیں۔ 2004ء میں والد انہیں زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئے ڈاکٹر نے انہیں نیند کی دوا دی۔ اس سے والدہ کو فائدہ ہو رہا تھا۔ مگر میری خالہ نے وہ دوائیں بند کروا دیں۔ والد بہت ناراض ہوئے لیکن پھر بھی خالہ کی ہی چلی کہ نیند کی دوا نہیں دینی۔
میرا آپ سے سوال ہے کہ کیا یہ صحیح ہوا؟
میرا بھائی بی کام میں تھا۔ اس کی اپنے کلاس فیلو سے دوستی ہو گئی۔ اب وہ چھوٹی بہن کا رشتہ اس سے کرنا چاہتا ہے۔
امی "خالہ "ماموں "باقی سب رشتے دار اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ لڑکا لاپروا "شیشہ اور سگریٹ پینے والا ہے۔ اس نے بھائی کو بھی سگریٹ کی عادت ڈال دی ہے۔
خالہ کو ہمارے گھر رہتے تیرہ "چودہ سال ہو گئے۔ میں نے امی سے کئی بار کہا کہ وہ نانی اماں کے پاس واپس جا کر رہیں مگر ماما سمجھتی ہی نہیں ہیں۔
مجھے کوئی طریقہ بتائیں کہ میں اپنے بہن بھائی کو بربادی سے بچا سکوں۔ میری اور میرے بھائی بہن کی بول چال کچھ مہینوں سے اس رشتہ کی مخالفت کی بنا پر بند ہے۔ میرے والد کی خواہش تھی کہ میرے بچے اعلا تعلیم حاصل کریں مگر یہاں تو اتفاق ہی ختم ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ کورسز کا بھی بتا دیں جن کو کرنے سے مجھے ترکی یا استنبول جانے کا موقع مل سکے۔ یہ بھی بتائیں کہ میں بھائی اور بہن کو کس طرح کنٹرول کروں؟
ج:۔ اچھی بہن! آپ کی والدہ کے علاج کے سلسلے میں جو کچھ ہوا "وہ صحیح ہوا یا غلط۔ اب اس بارے میں بات کرنا فضول ہے۔ اس وقت آپ کے والد حیات تھے۔ وہ آپ کی والدہ کو یہ سمجھانے میں ناکام رہے کہ ان کا علاج ڈاکٹر کے پاس ہے آپ کی والدہ آپ کے نانا اور ماموں کے زیر اثر تھیں یہ بات ماننے پر تیار نہ ہوئیں۔ آپ کے والد کی ایک نہ چلی اور انہوں نے وہی کیا جو آپ کی خالہ نے چاہا۔ اب آپ کے والد کا انتقال ہو چکا ہے اور خالہ مستقل آپ کے گھر آ گئی ہیں تو آپ کی والدہ جو پہلے ہی ان کی مانتی تھیں۔ اب ان کے مقابلے میں آپ کی بات کیسے مانیں گی؟
جہاں تک چھوٹی بہن کے رشتہ کی بات ہے تو اس بارے میں آپ کا بھائی اور بہن خود بھی سوچ سکتے ہیں۔ وہ پڑھے لکھے اور باشعور ہیں۔ اگر وہ اس رشتہ پر رضامند ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟
بہت سے لوگ سگریٹ چھوڑ دیتے ہیں اور پھر زندگی بھر ہاتھ نہیں لگاتے۔ رشتہ کرتے ہوئے بنیادی طور پر دو باتیں دیکھنا ضروری ہیں۔ پہلی بات لڑکا شریف ہو اور دوسری بات کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔ محنتی اور برسر روزگار ہو۔ اگر لڑکا پڑھا لکھا ہے "شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہے "برسر روزگار ہے تو صرف اس بنا پر کہ وہ سگریٹ پیتا ہے۔ انکار نہ کریں۔
آپ کے والد اعلا تعلیم یافتہ تھے۔ آپ چاہتی ہیں آپ کے بھائی بہن اعلا تعلیم حاصل کریں جبکہ آپ کے بھائی ایم بی اے ہیں۔ چھوٹی بہن نے بھی ماسٹرز کیا ہے۔ اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ آگے تعلیم حاصل کریں یا نہ کریں۔ انہیں اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اپنی شادی کے بارے میں سوچیں۔ شادی کے لیے یہی مناسب عمر ہے۔ بہن بھائی کی شادی کا فیصلہ اپنی والدہ کو کرنے دیں۔
ویسے بھی آپ کی بہن کم عمر نہیں ہے۔ بہت سی باتیں سمجھ سکتی ہے بھائی بھی تعلیم یافتہ ہے وہ دونوں کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کر رہے ہیں ایسے کسی کورسز کے بارے میں بتانا مشکل ہے۔ جن کو کرنے سے آپ کو ترکی جانے کا موقع مل سکے۔

☆ ☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

فرزانہ علی..... ٹنڈو محمد خان

س : میری عمر تیس سال اور وزن 55 کلوگرام ہے' قد پانچ فٹ دو انچ ہے۔ آج کل بہت سی دواؤں کے اشتہارات آرہے ہیں جن کے استعمال سے وزن کم ہو سکتا ہے۔ کیا میں وہ گولیاں استعمال کر سکتی ہوں؟ کیا ان دواؤں کے استعمال سے وزن کم ہو سکتا ہے۔ ان دواؤں کے کوئی مضر اثرات تو نہیں ہوں گے؟

ج : فرزانہ! ان اشتہاری دواؤں کے متعلق کچھ کہنا بہت مشکل ہے بہتر یہ ہی ہے کہ آپ یہ دوائیں استعمال نہ کریں۔ ویسے بھی کسی بھی دوائی سے وزن کم ہونا ناممکن ہے۔ وزن عموماً" موروثی اثرات کی وجہ سے بڑھتا ہے خوراک پر کنٹرول نہ ہونا بھی اس کی ایک وجہ ہے۔ ورزش نہ کرنا' آرام زیادہ کرنے کی وجہ سے بھی وزن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وزن کم کرنے کے لیے آپ کو سب سے پہلے اپنی خوراک کو کنٹرول کرنا ہو گا۔ تلی ہوئی' بیکری کی اشیا' کیک پیسٹری' مٹھائیاں' آئس کریم ان چیزوں کا استعمال کم کر دیں۔ شکر بھی کم مقدار میں استعمال کریں دودھ بالائی ہٹا کر لیں۔

درج ذیل ہدایات پر عمل کریں۔

(1) ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچہ شہد اور ایک لیموں کا رس ملائیں اور روزانہ صبح پی لیں۔ اس سے وزن بھی کم ہو گا اور آپ کے چہرے کی تروتازگی بھی قائم رہے گی۔

(2) دن میں کم از کم بارہ گلاس پانی پئیں۔ کھانا کھانے سے پندرہ منٹ پہلے ایک گلاس پانی پی لیں۔ اس سے آپ کھانا کم کھائیں گی۔

(3) کھانے سے پہلے ایک پلیٹ سلاد کی کھائیں۔ گاجر' چقندر' ٹماٹر' کھیرا' سیب' کینو کھائیں۔

(4) روزانہ بیس منٹ پیدل چلیں اور اس کو آہستہ آہستہ بڑھا کر ایک گھنٹہ تک لے جائیں۔

(5) سب سے ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ کھانا کبھی بھی پورا پیٹ بھر کر نہ کھائیں۔ معدہ کا ایک حصہ ہوا کے لیے' ایک حصہ پانی کے لیے اور ایک حصہ غذا کے لیے ہونا چاہیے۔

ان ہدایات پر عمل کرنے سے آپ کا وزن ایک ماہ میں پانچ کلو تک کم ہو جائے گا۔

ثمر خان..... پشاور

س : میری شادی کو دو سال ہوئے ہیں۔ ایک بچہ بھی ہے۔ میری عمر 25 سال ہے۔ وزن بھی مناسب ہے۔ لیکن بچہ" ہونے کے بعد میرا پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔ کوئی سادہ اور آسان ترکیب بتائیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں پردہ کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے اور ہمیں باہر جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

ج : ثمر! ایک بہت آسان سی ورزش ہے۔ اگر آپ نے باقاعدگی سے عمل کیا تو پیٹ کم ہو جائے گا۔

صبح کے وقت زمین پر بیٹھ جائیں اور ٹانگیں آگے کی جانب سیدھی پھیلا لیں۔ اب پیروں کے دونوں انگوٹھے پکڑ کر آہستہ آہستہ سر زمین کی طرف لے جائیں۔ اس طرح پہلے روز پانچ بار کریں۔ پھر اس کو بڑھا کر بیس مرتبہ تک لے جائیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ آپ کا سر زمین تک لگنے لگے گا۔

دوپہر میں یا رات میں پیٹ کے نیچے تکیہ رکھ کر پندرہ منٹ زمین پر اوندھی لیٹیں۔